افکارِ زرّاری

سیّد فضل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یاایہا الذین امنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصدقین

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

ترتیب وانتخاب

سید فضل الرحمن

زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز

دوکان نمبر ۲۲، بلاک نمبر ۲، زینت اسکوائر، ابن سینا روڈ

ایف۔ سی ایریا، کراچی نمبر ۱۹

نام کتاب	افکار زواریہ
تعداد	۱۱۰۰
اشاعتِ اول	شعبان ۱۴۱۵ھ / جنوری ۱۹۹۵ء
کمپوزنگ	بقا کمپوزنگ سروسز، اردو بازار، کراچی
مطبع	اونیسٹ پرنٹرز، زینت اسکوائر، ابن سینا روڈ ایف - سی - ایریا، کراچی نمبر ۱۹
ناشر	زوار اکیڈمی پبلی کیشنز۔ کراچی
قیمت	-/۱۵۰ روپے

ملنے کے پتے

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

۲۲ / ۲، زینت اسکوائر، ابن سینا روڈ،

ایف - سی - ایریا، کراچی نمبر ۱۹

ادارہء مجددیہ

۵ / ۲ - ایچ، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی نمبر ۱۸

فہرستِ عنوانات

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

پیش لفظ

از مکرم و محترم حضرت قبلہ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ العالیٰ

سابق صدر شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد

باسمہ تعالیٰ - حامداً و مصلیاً

مخدوم زادہ سید حافظ فضل الرحمن صاحب نے اپنے والدِ بزرگوار اور ہم سیاہ کاروں کے غم خوار حضرت مولانا سید زوار حسین صاحب علیہ الرحمہ کے افکار و خیالات، نیز ان کے متعلق دوسرے حضرات کے تاثرات کو یکجا کر کے یہ گراں قدر مجموعہ مرتب کیا ہے۔ حافظ صاحب موصوف کو علمی کاموں کی جو لگن ہے اس کا اندازہ ان کی کئی ضخیم تصانیف کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ لیکن موجودہ مجموعے کی نوعیت مختلف ہے۔ اس میں وہ جذبہ کار فرما ہے جو ایک سعادت مند فرزندہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ اس میں حضرت علیہ الرحمہ کے مختلف اور منتشر مضامین کے علاوہ متعدد علماء اور فضلاء کے علمی ہدایا اور کئی متوسلین و مسترشدین کے قلمی نذرانے شامل ہیں جن کے ہر لفظ سے گلہائے عقیدت نچھاور ہو رہے ہیں اور جو بارگاہِ الہیٰ میں حسن قبول کے حصول کے منتظر ہیں۔ کس قدر خوش نصیب ہیں وہ حضرات جو اس کارِ خیر میں حصہ لے رہے ہیں اور فلاح دارین سے مستفیض ہونا چاہتے ہیں۔

دلی دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے مخدوم زادے کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور ایسی اور بھی نعمتوں سے، ہم سب عقیدت مندوں کی آخرت سنوار دے۔ آمین، ثم آمین۔

احقر غلام مصطفیٰ خاں

ایم۔اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

۷۔ جمادی الاُخریٰ، ۱۴۱۵ھ

دیباچہ

الحمد للہ الذی خلق الانسان و علمہ البیان و نور قلوبنا بضوء الایمان ۔ والصلوٰۃ والسلام علی خاتم الانبیاء و سید الانام و علی الہ و اصحابہ الکرام اما بعد!

بزرگان دین اور اولیاء کرام کے اقوال و ارشادات نہ صرف یہ کہ ان کے وسیع تجربہ کے عکاس اور عمیق مشاہدے کے آئینہ دار ہوتے ہیں، بلکہ ان کے تعلق مع اللہ کی بنا پر ان کا علم کسی سے زیادہ وہبی ہوا کرتا ہے ۔ اس لئے ان سے استفادہ، علم اور اکتساب فیض، علم و عمل دونوں میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے اور ان بزرگوں کے حالات و ملفوظات سے وہ سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے جو ان کی زندگی میں ان کی صحبت کی برکت سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ خود حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

"اگر کسی شخص کو اہل اللہ کی صحبت میسر نہ ہو تو اس کو چاہیئے کہ کم از کم ان کے ملفوظات و تحریرات کا بہ نظر اصلاح و استفادہ مسلسل مطالعہ کرتا رہے کہ اس سے بھی اہل اللہ کا ایمان و عمل ہمارے اندر منتقل ہو جاتا ہے اور قالب سے تجاوز کر کے قلب و روح میں اتر جاتا ہے ۔ چونکہ اس زمانے میں صلحاء و علماء ربانی کمیاب ہیں اور ہر جگہ اچھی صحبتیں میسر نہیں ہیں، اس لئے مذہبی کتابوں کا مطالعہ اچھی صحبتوں کا بدل ہے اور وہ کتابیں جو بزرگوں کے حالات و نصائح اور دینداری کا جذبہ پیدا کرنے والے مضامین پر مشتمل ہوں یقیناً نیک صحبتوں کے قائم مقام ہیں ۔"

بزرگان دین کی تعلیمات اور ارشادات کی ترتیب و تدوین اور اشاعت و ترویج کا سلسلہ عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے ۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیمات و ارشادات خاصی حد تک محفوظ ہیں ورنہ بہت سے اولیاء کرام اور بزرگان دین کے حوالے سے آج کچھ بھی محفوظ نہیں ہے ۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی کے سرسری جائزے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ان کے شامل حال تھا اور قدرت نے نہایت مختصر مدت میں آپ سے بہت کثیر اور اہم کام لیا ۔

حضرت شاہ صاحبؒ شیخ طریقت ہونے کے ساتھ ساتھ رہبر شریعت بھی تھے۔ تصوف، فقہ علم کلام و عروض، تاریخ و ادب اور سائنس و طب وغیرہ علوم و فنون میں ان کا مطالعہ بہت وسیع و عمیق تھا۔ اسی لئے آپ کی تعلیمات کسی خاص موضوع تک محدود نہیں۔ آپ کو ان میں فقہ کے وقیع مباحث بھی ملیں گے اور تصوف کے دقیق نکات بھی۔ آپ کا واسطہ علم کلام کی عمیق گھاٹیوں سے بھی پڑے گا اور فلسفہ کی موشگافیوں سے بھی اور کہیں علم عروض کی جھلکیاں بھی آپ کے ملاحظہ سے گذریں گی۔

پیش نظر تالیف میں حضرت شاہ صاحبؒ کے حالات بیان کرنا مقصود نہیں ہے، کیونکہ حضرت کے تفصیلی حالات پہلے ہی ادارہ مجددیہ کی شائع کردہ کتاب "مقاماتِ زواریہ" میں تحریر ہوچکے ہیں، اس لئے ابتدا میں چند معاصرین کے تاثرات پر اکتفا کیا گیا ہے اور تمام تر توجہ تعلیمات و ارشادات کو اخذ و جمع کرنے پر مرکوز کی گئی ہے۔ اس کے تمام مضامین و مواد "مقاماتِ زواریہ" "حضرت شاہ صاحبؒ کی ریڈیو تقاریر"، ماہنامہ "بینات"، ماہنامہ "خدام الدین"، ماہنامہ "قومی زبان"، سہ ماہی "العلم"، ماہنامہ "سب رنگ (ڈائجسٹ)" وغیرہ کتب و رسائل میں شائع شدہ حضرت شاہ صاحبؒ کے اپنے مضامین اور آپ کے بارے میں دوسرے لوگوں کے مضامین سے ماخوذ ہیں تاکہ یہ علمی جواہر پارے یکجا اور محفوظ ہوجائیں۔ اشعار کے باب میں حضرت شاہ صاحبؒ کی ایک حمد، ایک نعت اور تین نظموں کے علاوہ وہ اشعار دیئے گئے ہیں جو عربی و فارسی اشعار کے منظوم ترجمے ہیں اور جو گلدستہ مناجات، مبدا و معاد، معارفِ لدنیہ (از حضرت مجدد الف ثانیؒ) اور مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ابتدائی سو مکاتیب اور شرح رباعیات سے ماخوذ ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس تالیف کو قبول فرمائے اور عوام و خواص کے لئے نافع بنائے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جہاں کہیں کسی قسم کی غلطی محسوس ہو تو ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی صلاح کردی جائے۔

سیّد فضل الرحمٰن

۲۱۔ شعبان المعظم، ۱۴۱۵ھ

۲۳۔ جنوری، ۱۹۹۵ء

باب اول:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
معاصرین کی نظر میں

از حضرت ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب مدظلہ العالی

سابق صدر شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی سادہ زندگی، معصوم ماحول، تعلیم و تعلم، درس و تدریس، تصنیف و تالیف وغیرہ تمام وابستگان کے لئے حیات بخش اور ایمان افروز ہیں، لیکن ان کے لئے بھی مفید ہیں جو کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ کوئی غور تو کرے کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے کس طرح پیہم کاوش اور سخت کوشی سے ہمیشہ کام کیا، کتنوں کی اصلاح فرمائی، کیسے کیسے سرکشوں کو بارگاہ الٰہی میں سربسجود کرادیا اور کیا کیا باقیات صالحات یادگار چھوڑیں یہ کارنامے کتنے وقیع ہیں کہ سیجعل لھم الرحمن ودا کے مصداق اس دنیا میں بھی کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے اور آخرت میں جو کچھ اجر ملے گا اس کے لئے ہم یہی کہیں گے کہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون٥

ان کے مزاج میں اخفائے حال اور نگاہ میں بڑی حیا تھی۔ آج کل لوگ اپنی بیوی، بچوں کا ذکر احباب کے سامنے کرنے میں عار نہیں سمجھتے بلکہ خوش ہو کر بیان کرتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے کبھی ایسا ذکر نہیں کیا۔ کسی شخص میں شرع کی رو سے کوئی خامی دیکھتے تھے تو اس سے روبرو کہنے کی بجائے اس شخص کے کسی قریبی تعلق والے سے عمومی طور پر ذکر فرمادیتے تھے۔ مثلاً میرے ایک خاص کرم فرما کے متعلق (بغیر ان کا نام لئے ہوئے) مجھ سے فرمایا کہ بعض لوگ عجیب ہیں کہ ڈاڑھی تو رکھ لی لیکن انگریزی بال بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ٹخنوں سے نیچے پائنچے دیکھ کر عمومی طور پر ناپسندی کا اظہار فرمادیتے تھے۔ جماعت والوں کو دیکھتے رہتے تھے کہ کون شخص کس طرح

کپڑے یا موزے پہنتا یا اتارتا ہے، جوتا کون سا پہلے پہنا اور کون سا پہلے اتارا۔ کھانا کس طرح کھایا، پانی کس طرح پیا۔ ایک مرتبہ میں نے پانی کا گلاس صرف داہنے ہاتھ میں لے کر پیا، تو تھوڑی دیر کے بعد عام طریقے پر فرمایا کہ میں نے اپنے علماء کو دیکھا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے (داہنا ہاتھ اوپر اور بایاں نیچے) گلاس کو پکڑتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب کے یہاں اندر جانے کا اتفاق ہوا تو واپسی پر تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگوں سے فرمایا کہ شریعت کیسی پیاری چیز ہے۔ اس نے مٹی سے ہر گندگی کو ڈھانپ دینے کی کیسی عمدہ ہدایت فرمائی ہے۔

سنت کے مطابق حضرت شاہ صاحبؒ بہت تیز چلنے کے عادی تھے۔ ایک مرتبہ صوفی محمد احمد صاحب اور یہ عاجز بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ مسکین پور شریف گیا۔ شہر سلطان سے بس ملی لیکن اس نے بہت دور اتار دیا، غالباً دو میل کا فاصلہ تھا۔ عصر کا وقت تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے چلنا شروع کیا اور ہم لوگ پیچھے ہو لئے۔ وہ چل رہے تھے کہ گویا زمین ان کے قدموں میں سمٹی جارہی تھی اور ہم لوگ باقاعدہ دوڑ لگا رہے تھے۔ آخر ہم لوگوں نے ہار مان لی اور راستے ہی میں نماز ادا کی۔ لیکن حضرت شاہ صاحب مسکین پور شریف پہنچ گئے اور وہیں مسجد میں نماز پڑھی۔ اسی طرح کئی مرتبہ علی پور سے مسکین پور شریف کا راستہ طے ہوا کہ وہ تو ہم لوگوں سے بہت زیادہ آگے تھے اور ہم لوگ راستہ ہی ناپ رہے تھے۔

حافظے کی یہ شان تھی کہ زندگی کے بے شمار واقعات کی پوری تفصیل یاد تھی اور تبحر علمی کا عالم یہ تھا کہ بعض مرتبہ عشاء کے بعد کوئی مسئلہ چھڑ گیا تو اس کی جزئیات اس قدر تفصیل سے بیان فرمائیں کہ تہجد کا وقت آگیا، پھر تہجد کی نماز شروع ہو گئی اور مراقبے کے بعد فجر کی نماز ادا فرمائی۔

از حضرت مولانا ابوالخلیل خان محمد صاحب

خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف

جناب حضرت مولانا المکرم سید زوار حسین شاہ صاحب قدس سرہ العزیز و نور اللہ مرقدہ کی وفات حسرت آیات نہ صرف مخلصین و مریدین کے لئے ایک صدمہ جانکاہ ہے بلکہ اہل اسلام ایں

دیار کے لئے ایک ناقابل تلافی دینی و روحانی نقصان ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

انا للہ و انا الیہ راجعون o مرضی مولیٰ بر ہمہ اولیٰ۔ صبر و شکیبائی کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے فقیر کو متعدد بار ملاقات کا موقع ملا، علیٰ وجہ البصیرت عرض کیا جاتا ہے کہ سلسلہ فضلیہ نقشبندیہ کے وابستگان میں حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو ایک خاص منفرد اور ممتاز مقام حاصل تھا۔ بلکہ اس مذکورہ سلسلہ میں اپنے جملہ برادران طریقت سے بازی لے گئے۔

اس کی خاص وجوہ مرحوم و مغفور کا اتباع شریعت، پابندی سنتِ مطہرہ، نسباً اہلِ بیتِ اطہار کا خلف الرشید ہونا اور حضور حضرت امام ربّانی مجدد الفِ ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے جانشین حضراتِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی خاص محبت، اُنس، مودت، عقیدت اور اتباع اتم ہیں۔

سالہا در کعبہ و بت خانہ مے نالد حیات   تاز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

فقیر دعا گو ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو اپنے خاص جوارِ رضا و قرب و رحمت و مغفرت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کے جملہ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

از حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی

مہتمم ادارہ ندوۃ المصنفین و ماہنامہ برھان، دہلی

مولانا الحاج سید زوّار حسین صاحبؒ کی رحلت کی افسوسناک خبر معلوم ہو کر روحانی صدمہ ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون o مرحوم غیر معمولی خصوصیات کے حامل تھے۔ عالم، متقی، پرہیزگار، اعلیٰ درجہ کے مصنف، فیض رساں، منکسر المزاج ..... اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ آپ کے لئے یہ حادثہ نہایت المناک ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیقِ صبر عطا فرمائے۔ ابھی تو مرحوم

کو بہت سی خدمات انجام دینی تھیں، ان کے کلام میں حق تعالیٰ نے بڑی برکت عطا فرمائی تھی، عمر تو ابھی ایسی نہیں تھی۔ اس وقت مرحوم بہت یاد آرہے ہیں، اس وقت کی ملاقات کا سماں سامنے ہے جانا سب کو ہے مگر ایسے حضرات کی جدائی سے ملت کا جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

از حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب مدظلہ

حضرت مولانا زوار حسین صاحبؒ عجیب آدمی تھے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی خود بنائی یہ ان کی زندگی کی خصوصیت ہے جو میں سمجھتا ہوں۔ اور لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ والدین ان کی زندگی بناتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کہتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی خود بنائی اور اللہ رب العالمین کی مدد میرے شامل حال رہی۔

مولانا زوار حسین صاحب نے ایک شیعہ گھرانے میں آنکھ کھولی اور سارا گرد و پیش سب کا سب شیعہ تھا۔ اللہ رب العالمین نے ان کو ہدایت دی اور توفیق دی اور ان کو سُنّی بنایا، اس کے بعد وہ بہت اونچے درجے کے اور مضبوط سُنّی بنے اور وہ ایسے سنی تھے کہ آدمی کو ان پر رشک آنا چاہیئے۔ وہ فرماتے تھے کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا تو کچھ دن بعد اپنی ہمشیرہ کے ہاں آگیا اور میری ہمشیرہ کے شوہر سنی تھے، وہاں جاکر جب سنی عبادات و رسومات سامنے آئیں تو مجھے بہت اچھی معلوم ہوئیں۔ چنانچہ شیعوں کی جو چیزیں دیکھی تھیں ان سے سخت نفرت ہو گئی اور میرے دل میں کچھ سوالات پیدا ہوئے۔ میں نے ان سوالات سے متعلق حضرت تھانویؒ کی خدمت میں ایک خط لکھا اور اپنی ساری کیفیات اور ساری تفصیلات لکھیں اور مولانا تھانویؒ نے بہت شافی اور کافی جواب دیا۔ اس کے بعد مجھے مزید اطمینان ہو گیا اور میرے اندر اہل سنت مسلک کا جو ایک بیج تھا وہ اور پختہ ہو گیا۔

اجازت و خلافت سے سرفراز ہونے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے جو بڑا اہم کام کیا وہ تصوف اور فقہ کی کتابوں کی تالیف و تصنیف ہے۔ فقہ انسان کے ابتدائی اعمال کو درست کرتی ہے اور تصوف انسان کے باطن اور قلب کی اصلاح کے لئے ہے اور یہی دونوں چیزیں ہیں جس سے انسان کے ظاہر و باطن کی حفاظت ہوتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے فقہ میں بڑا کام کیا ہے۔ بہت سارے

فتنے ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر بدعات شروع ہو جاتی ہیں ۔ آپ دیکھئے بڑے بڑے سلسلے ، بڑے اچھے اچھے لوگ جو پکے سُنی تھے ان میں فتنے شروع ہو گئے ، یہاں تک کہ وہ شیعہ ہو گئے یا بدعتی ہو گئے ۔ اس لئے شاہ صاحبؒ نے فقہ پر زور لگایا اور فقہ کی چار ضخیم جلدیں لکھیں ۔ اگر انسان فقہ کا علم حاصل کر لے تو وہ رافضی یا بدعتی نہیں بن سکتا ۔ یہ ان کی خاص حکمت تھی تاکہ انسان کے اندر بدعات پیدا نہ ہوں ، کیونکہ یہ بدعت ہی ہے جو انسان کے اعمالِ حسنہ کو بالکل کھا جاتی ہے اور جو کام سنت کے مطابق ہو اگرچہ بہت حقیر اور چھوٹے سے چھوٹا ہو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت مقبول ہو گا اور بدعت کے اعتبار سے بڑے سے بڑا کام بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہ ہو گا ۔ اسی نکتہ نے حضرت شاہ صاحبؒ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور اسی کی بڑی ضرورت ہے ۔

از محترم پروفیسر سید محمد سلیم صاحب مدظلہ

شاہ صاحب کی زندگی کے کئی رخ اور کئی پہلو ہیں ۔ وہ عالمِ دین تھے ، وہ صاحبِ تصنیف تھے ، وہ شیخِ طریقت تھے جن کے متوسلین اور مسترشدین کا حلقہ کافی وسیع ہے ۔ میں شاہ صاحب کی معاشرتی زندگی کے متعلق چند باتیں پیش کروں گا جن کی میری نگاہ میں بہت زیادہ اہمیت ہے ۔

شاہ صاحب اس دور کے صاحبانِ طریقت سے کئی باتوں میں منفرد تھے ۔ وہ متقی اور پرہیز گار تھے مگر غلو اور تشدد سے دور ۔ جلوت اور خلوت سب جگہ یک رنگی تھی ۔ ان کی زندگی خانوں میں بٹی ہوئی نہیں تھی ۔ تکلفات ، تصنعات اور رسومات سے خالی تھے ۔ کوئی خاص امتیازی علامت ان کے یہاں نہیں تھی ۔ پیروں میں ایک عادت کثیر گوئی اور خود ستائی کی ہوتی ہے ۔ میرے خاندان میں چار پانچ پیر ہیں ۔ میں ایک واقف کار کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں ۔ شاہ صاحب میں اس عادت کا شائبہ بھی نہیں تھا ۔ رہائش وضع قطع ، لباس ، طور طریقوں میں شاہ صاحب نے عام پیروں کے رسمی اور امتیازی انداز اختیار نہیں کئے ۔ وہ ایک عام مسلمان کی طرح سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے ۔

پیر اور علماء اپنے حلقہء ارادت سے باہر شاذ ہی کسی سے ملتے ہیں ۔ شاہ صاحب سیاسی اور مذہبی گروہ بندیوں سے لاتعلق تھے ۔ وہ سب سے بلا تکلف ملتے تھے ۔

شاہ صاحب خوش حال تھے، خوش پوشاک تھے اور ایک متوسط درجے کے انسان کی زندگی بسر کرتے تھے، جس میں سادگی تھی، نہ تکلف تھا، نہ تصنع۔

شاہ صاحبؒ کی زندگی بڑے نظم و ضبط کی زندگی تھی، ان کو اپنے اقوال اور افعال پر بڑا کنٹرول حاصل تھا۔ رشتہ داری کی زندگی میں کوئی موقعہ ایسا نہیں آیا کہ ان کا طرز عمل معیار سے فروتر رہا ہو۔ اشخاص اور افراد کے متعلق اظہار رائے کرنے میں وہ بڑے محتاط تھے۔ شاہ صاحب کم گو تھے، بات کرنے میں وہ پہل نہیں کرتے تھے۔ سوال کا جواب وہ مختصر انداز میں دیتے تھے۔ بعض دفعہ اس بات کے کہنے میں بھی کوئی باک نہیں تھا کہ یہ بات مجھے معلوم نہیں ہے۔ گفتگو کرنے میں حیا تھی اور ایک عجیب معصومانہ انداز پایا جاتا تھا۔ شاہ صاحب کو اپنے جذبات پر ضبط حاصل تھا۔ ملاقات کے موقعہ پر بھی یکساں رکھ رکھاؤ رہتا تھا۔ جذبات کی فراوانی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح رنج و غم کے موقع پر بھی غیر معمولی تاثر کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم
بقی الذین حیاتھم لا تنفع

از محترم ثناء الحق صدیقی صاحب

ویسے تو شاہ صاحب حسن و خوبی کا پیکر اور علم و حلم کا مجسمہ تھے، لیکن جس خوبی نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ میرے دل پر اثر کیا وہ ان کی سادگی اور منکسر المزاجی تھی۔ جو ہستی مسند علم و فضل پر متمکن ہو، جس کا سلسلہ، رشد و ہدایت اس قدر وسیع ہو اور جس سے اپنے زمانہ کی بڑی بڑی ہستیاں اکتساب فیض کر رہی ہوں اس میں اتنی سادگی، اس قدر خاکساری اور ایسی کسرِ نفسی یقیناً ایک اعجاز ہے۔ شاہ صاحبؒ کی سادگی ان کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ میں نمایاں تھی ان کے مزاج میں سادگی تھی، ان کا رہن سہن سادہ تھا اور ان کی تقریر و تحریر سادہ تھی۔ انھوں نے صفائی ستھرائی کو بھی سادگی کے ساتھ مخلوط کر رکھا تھا۔ پاکی اور پاکیزگی کا انھیں پورا خیال رہتا لیکن نمائش و آرائش اور دکھاوے سے ان کی زندگی عاری تھی۔ وہ گفتگو میں بھی کبھی اظہارِ قابلیت کے لئے نہ بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے، نہ غیر مانوس اصطلاحات کو کام میں لاتے اور نہ پیچیدہ جملے

بولتے ۔ الفاظ نہایت آسان اور عام فہم اور فقرے صاف اور سلجھے ہوئے ہوتے تھے ۔ لہجہ میں خشونت کا نام نہیں تھا۔ نہایت نرم اور دھیمے لہجہ میں گفتگو کرتے تھے ۔ کیسا ہی علمی موضوع ہوتا وہ اسے سیدھے سادے الفاظ میں بیان کردیتے، لیکن ان ہی سیدھے سادے، معمولی الفاظ، چھوٹے چھوٹے فقروں اور دھیمے لہجے میں ایسی تاثیر تھی کہ ہر بات سننے والے کے دل میں اترتی چلی جاتی تھی جب وہ کوئی بات کسی کو سمجھاتے ہوتے تو ان کے کسی بھی لفظ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ان کے دل میں تفوق و برتری کا معمولی سا بھی جذبہ موجود ہے، بلکہ از اول تا آخر کسر نفسی اور خاکساری کا اظہار ہوتا تھا۔ کبھی کوئی شخص سوال کرتا تو اس کو نہایت نرمی سے جواب دیتے تھے ۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دوسرے کو سمجھا نہیں رہے ہیں بلکہ اس سے خود کچھ سمجھ رہے ہیں ۔

ان کی ایک خوبی اپنی جگہ منفرد ہے کہ پیر طریقت ہونے کے باوجود ان کا دامن شریعت کے ساتھ زیادہ مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔ نہ کبھی انھوں نے گفتگو میں یہ محسوس ہونے دیا کہ وہ شریعت کو طریقت سے فروتر سمجھتے ہیں اور نہ کہیں تحریر میں یہ تصور ابھرنے دیا۔ بہت سے لوگ کہتے تو یہ ہیں کہ طریقت احسان ہی کا دوسرا نام ہے اور احسان نام ہے اخلاص فی العبادات کا، لہذا طریقت اور شریعت میں کوئی فرق نہیں، مگر جب ان کے خیالات کا اچھی طرح جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو برائے بیت ہوتی ہے ورنہ ان کے نزدیک طریقت کے مقابلہ میں شریعت کی کوئی حقیقت نہیں ہے ۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کھلم کھلا شریعت کا استخفاف کرتے ہیں، لیکن شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی تقریر یا تحریر سے کبھی بھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ وہ شریعت یا اہل شریعت کو حقیر سمجھتے ہوں ۔ وہ طریقت کو واقعی احسان کے مترادف قرار دیتے تھے، نہ شریعت سے اس کو الگ سمجھتے اور نہ شریعت کو ادنیٰ درجے کی شے بتاتے ۔ اس چیز کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی بیشتر تصانیف فقہی مسائل سے متعلق ہیں اور سلوک پر بھی جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی غالب عنصر شریعت کا ہے ۔

شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے عبادت و ریاضت، اوراد و وظائف اور رشد و ہدایت کے کاموں میں انہماک کو دیکھتے ہوئے جب ان کے تصنیفی کام پر نظر پڑتی ہے تو وہ ایک اعجاز معلوم ہوتا ہے ۔ سنا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے وقت میں برکت اور کشادگی پیدا کردیتا ہے اور وہ تھوڑے وقت میں بہت سے کام کرلیتے ہیں، اس کا تجربہ شاہ صاحبؒ کے معاملہ میں ہوا ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس وقت میں اتنا کام کرلیتے تھے ۔ ان کی کتابوں کی تعداد موضوعات کا تنوع

کتابوں کی ضخامت اور دقیق مضامین کو دیکھ کر یہ باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کسی ایسے شخص کا کام ہے جس کا کوئی لمحہ ذکر و فکر، عبادت و ریاضت اور رشد و ہدایت سے خالی نہیں تھا۔ لیکن جو کام آنکھوں کے سامنے ہوا ہو اس پر شک و شبہ بھی کیسے کیا جاسکتا ہے۔ یقیناً وہ ایک ایسی ہستی کا کام تھا جس کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید حاصل تھی۔ کسی اہل دل شاعر نے صحیح کہا ہے

اللہ اگر توفیق نہ دے، انسان کے بس کی بات نہیں

از حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب مدظلہ

مولانا کی ولایت اور کمالات سے متعلق تو مولانا کے خلفا اور منتسبین جانیں جنہوں نے مولانا سے استفادہ کیا ہے، مجھ پر تو مولانا کا جو سب سے بڑا تاثر ہے وہ یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ مولانا بڑے بزرگ آدمی تھے، علم سے بھی بہرہ ور تھے اور تعلق باللہ کے سلسلے میں بھی وہ مجاز اور مرشد تھے۔ اس کے باوجود مولانا سے زندگی میں برسوں ہی تعلق رہا اور مولانا بے تکلفی کے ساتھ غریب خانہ پر رونق فرما بھی ہوتے رہتے تھے، بھاول پور میں بھی، یہاں بھی۔ مگر کبھی یہ بات نہیں دیکھی کہ ان کی زبان پر کسی قسم کا اپنا کوئی تعارف آیا ہو اور اپنے آپ کو کہیں وہ سامنے لائے ہوں، یہ بہت ہی بڑی بات ہے۔ فلا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقیٰ ٥ یعنی اپنے آپ کا تزکیہ مت کرو، اپنے آپ کی تعریف مت کرو، اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھو، اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ تم میں متقی کون ہے۔ بزرگ ہونے کے باوجود اور بڑا ہونے کے باوجود یہ کمال کہ اپنے کو ظاہر نہ ہونے دیا جائے اور اپنی عظمت کو بالکل محو کر دیا جائے بہت بڑی بات ہے، ورنہ عام طور پر تو جس کو اللہ تعالیٰ کچھ دے دیتا ہے اس کا یہ حال ہوتا ہے اعرفونی اعرفونی (مجھے پہچان لیجئے، مجھے پہچان لیجئے)۔ چنانچہ اب لوگوں کی یہ عام عادت سی ہو گئی ہے، مولوی ہو یا صوفی وہ اپنا تعارف کرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کورے مٹکے میں جب پانی بھرتے ہیں تو سوں سوں ضرور کرتا ہے، اسی طرح بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ خود اپنی کوئی کرامت بتا دیں گے، کوئی کشف بتا دیں گے۔ بعض لوگوں کو ایسا بھی دیکھا ہے کہ ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنے قلب سے ٹھوکر دے کر بتایا کہ ہمارا قلب بھی جاری ہے۔ ہم نے مولانا کی جو صفت

دیکھی وہ یہ تھی کہ ان میں ایسی باتوں کا مطلقاً شائبہ بھی نہیں پایا جاتا تھا اور میرے نزدیک یہ سب سے بڑے کمال کی بات ہے۔ صدیقیت کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ آدمی بہت اونچا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھے، مجھے تو سب سے زیادہ مولانا کی جس چیز نے اپیل کی وہ یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اوقات میں غیر معمولی برکت عطا فرمائی تھی۔ چند سالوں میں ان کے قلم سے ضخیم ضخیم جلدیں نکلیں، تصوف کے سلسلہ میں، فقہ کے سلسلہ میں۔ یہ بات ویسے تو شاید اہم نہ معلوم ہو لیکن آدمی جب تصنیف کرنے بیٹھتا ہے اس وقت اس بات کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کام کے لئے کتنا وقت درکار ہوتا ہے اور کتنی مدت صرف ہوتی ہے۔ مولانا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ انعام اور احسان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوقات میں وسعت اور برکت عطا فرمائی تھی کہ یہ ضخیم ضخیم جلدیں مرتب ہو گئیں، یہ بھی میرے نزدیک ایک کرامت ہے۔ غرض ایک کرامت تو مولانا کی جماعت، دوسری ان کی بے نفسی، تیسری تصنیفات میں برکت۔ اور پھر یہ دیکھا کہ پوری زندگی میں عام طور پر من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه٥ (انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی چیز کو چھوڑ دے) کا نمونہ تھے۔ ان کی گفتگو کے اندر کبھی ادھر ادھر کی بات ہوتی ہی نہیں تھی۔ کام کی بات ہوتی تھی، باقی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ یہ بھی کہنے کو تو معمولی باتیں ہیں مگر زندگی میں جب یہی چیزیں معمول بن جاتی ہیں تو یہی ولایت کی دلیل ہوتی ہیں اور مولانا کو تو اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزوں سے نوازا تھا جن میں سے یہ چیزیں بھی تھیں جو میں نے ذکر کیں اور جن کا میرے اوپر خاص اثر ہے۔

از محترم مظہر علی خان صاحب

اصطفاء منزل، مدینہ منورہ

حضرت شاہ صاحب کے مزاج میں جو اوسط کا انداز تھا وہی تحریر و تقریر میں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کبھی ہفتہ واری محفلوں میں درِ دولت پر بھی حاضر ہوا۔ شفقت فرماتے تھے اور قریب بٹھاتے تھے۔ وہی ولیوں والا اخلاق، ایثار، انکساری، خدمت، اتباعِ سنت، محبت، عمل، معمولات .... غرض کہ اخلاقِ نبوی کا نمونہ تھے۔ بے ضرورت بات نہیں، بے موقع اشارہ بھی

نہیں اور موقع پر خود مخاطب کرتے تھے ۔ کبھی کبھی مجھ سے علمی باتیں بھی کرتے اگرچہ من آنم و من دانم والا معاملہ ہے ۔ اور ان کی علمی خدمات ظاہر و معلوم ہیں اور علمی دنیا کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھے اور روحانیت کا مقام بھی صاحبِ دل ہی سمجھ سکتے ہیں ۔

خاکسار تو فرمانِ نبویؐ کے تحت اتنا ہی عرض کر سکتا ہے کہ ارشاد ہوتا ہے کہ " جس کی اچھائی کی گواہی اکثریت دے وہ جنتی ہے ۔ " اور شاہ صاحب کو تو حاضر و غائب میں کسی ایک شخص کو بھی تعریفی کلمات کے علاوہ کچھ کہتے نہیں سنا ہے اور یہی ان کی روحانی ، عملی ، علمی کارناموں کو سرفہرست لانے کے لئے بہت کافی ہے ۔ ان کے سلسلہ میں بھلا میں کیا لکھ سکتا ہوں ۔ہاں! ایک بزرگ دوست ، مخلص مشفق کے متعلق کچھ اظہار کر کے اپنی انتہائی سعادت سمجھ رہا ہوں کہ بزرگوں کا ذکر بھی ایک روحانی تسکین ہے کہ ؛

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے!

یہ تھوڑی سی باتیں تھیں جو حکماً پیشِ خدمت کر دی ہیں ورنہ " سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے " زیادہ حدِ ادب ۔

از محترم حافظ رشید احمد ارشد مرحوم

سابق صدر شعبۂ عربی ، کراچی ، یونیورسٹی

حضرت شاہ صاحبؒ کے اوصافِ حمیدہ اور فضائل و خصائل کو بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے ۔ یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ میرے پیر و مرشد تھے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ جیسے نیک اور صالح و شریف انسان اس سے پہلے کم دیکھے تھے ۔ جب تقریباً نصف صدی پیشتر میں نے سب سے پہلے دہلی میں آپ کا دیدار کیا تھا تو اس وقت آپ میرے لئے بالکل اجنبی تھے مگر آپ کو دیکھ کر آپ کی نورانی شکل و صورت سے بہت متاثر ہوا تھا ۔ اس کے بعد جب کبھی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو سمجھتا تھا کہ اس خاکسار پر آپ کی عنایت و شفقت سب سے زیادہ ہے اور آپ ایک پیر و مرشد کی طرح نہیں بلکہ ایک بے تکلف مخلص دوست کی طرح گفتگو فرماتے تھے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کی شفقت و عنایت ہر ایک چھوٹے بڑے شخص کے ساتھ

ایسی ہی ہوتی تھی ۔ عام پیروں کی طرح آپ کے اندر مشیخت اور غرور و تکبر نام کو بھی نہ تھا بلکہ آپ نہایت سادہ اور منکسر المزاج انسان تھے، ہر شخص سے خنداں پیشانی کے ساتھ ملتے تھے اور ان کے سوالات کا نہایت تسلی بخش جواب دیتے تھے ۔

از محترم حاجی محمد اعلیٰ صاحب

ناظم ادارہ مجددیہ، کراچی

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی ایک بہت بڑی خصوصیت جس کا تعلق خاص طور پر اس عاجز کے ساتھ ہے اور جس کو یہ عاجز بہت اہمیت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ تالیفات و تراجم کے سلسلہ میں رات دن کی اس قدر انتھک محنت اور عرق ریزی فرمانے کے باوجود، معاوضہ یا مالی منفعت کا ذرہ برابر خیال حضرت شاہ صاحبؒ کے قریب سے بھی نہیں گذرا تھا، چہ جائیکہ دل میں آیا ہو ۔ عاجز نے جب کبھی ہمت کر کے کچھ پیش کرنا چاہا تو یہ فرما کر ٹال دیا کہ "ابھی تمہیں فلاں فلاں کتاب چھاپنی ہے اس کے لئے کہاں قرض لیتے پھرو گے، اس سے کام چلاؤ" وغیرہ چند جملے نصیحت کے فرما کر بات ختم کر دی اور قبول نہ فرمایا ۔ یعنی حضرت شاہ صاحبؒ کو یہی خیال رہتا تھا کہ کسی طرح اس پر بوجھ نہ پڑے اور کام حسن و خوبی کے ساتھ انجام پاتا رہے ۔ زبان سے کہہ دینا تو اور بات ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ یہ کام کس قدر مشکل ہے کہ انسان دن رات محنت کرتا رہے اور اس کا معاوضہ نہ چاہے ۔ اتنی بے لوث خدمت ایک بہت بڑی مقبول بارگاہ ہستی کا کام ہے جو یہ خیال کر لے کہ ان اجری الا علیٰ رب العالمین o (تحقیق میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے) ۔ نیز یہ واقعہ حضرت شاہ صاحبؒ کے استغنا اور توکل کے اعلیٰ مرتبہ کا بھی بین ثبوت ہے اور اس سے دینی علوم کی ترویج و اشاعت کا والہانہ ذوق بھی نہایت درجہ واضح ہے

تصنیف و تالیف کے سلسلہ کی ایک اور بات بھی ملاحظہ ہو کہ چونکہ عاجز ابتدا سے کتابت کا کام کرتا ہے اور بکثرت مصنفین حضرات سے واسطہ رہا ہے لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کو جس احتیاط سے کام کرتے دیکھا ہے اس کی مثال بھی مشکل سے نظر آتی ہے ۔ مثلاً حضرت شاہ صاحبؒ کو کوئی الجھا ہوا مضمون لکھنا ہوتا، یا پیچیدہ عبارت کا ترجمہ کرنا ہوتا تو کئی کئی دن تک اس کو ذہن میں رکھتے،

اس دوران میں اگر کسی ذی علم بزرگ سے ملاقات ہو جاتی تو ان سے بھی تبادلہ خیال فرماتے اور جب تک آپ کے دل کو اطمینان نہ ہو جاتا اس وقت تک کتابت کے لئے نہ دیتے بلکہ کتابت ہو جانے کے بعد بھی اگر کوئی بہتر مضمون ذہن میں آجاتا اور شرح صدر ہو جاتا تو اس وقت بھی اس کی اصلاح فرمادیتے۔

اسی طرح کی ایک اور بات یاد آئی کہ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب نے مسودہ تیار کر کے عاجز کو دیا۔ اثناء کتابت میں اگر کوئی جملہ عاجز کی سمجھ میں نہ آیا اور اس کا حضرت شاہ صاحبؒ سے اظہار کر دیا تو آپ نے کبھی برا نہ مانا کہ میرے لکھے ہوئے پر نکتہ چینی کر رہا ہے بلکہ ذرا سوچ کر عبارت بدل دی اور فرمایا ٹھیک ہو گئی؟ عاجز نے عرض کیا، جی ہاں۔ اگر حضرتؒ نے عاجز کے لہجہ سے محسوس کر لیا کہ اس کو ابھی اطمینان نہیں ہوا تو فرمایا نہیں ابھی تمہارا ذہن صاف نہیں ہوا اور اس عبارت کو بھی کاٹ کر دوسری عبارت لکھ دی اور فرمایا اب تو ٹھیک ہو گئی؟ عاجز نے عرض کیا جی ہاں اب ٹھیک ہو گئی۔ تب اس کو کتابت کے لئے عاجز کے حوالہ کیا۔ مخدوم زادہ حافظ سید فضل الرحمن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ سے جب عاجز نے مذکورہ بالا واقعہ عرض کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میرے ساتھ بھی اکثر ایسا ہوتا تھا۔ اس واقعہ سے حضرت شاہ صاحبؒ کی دو خصوصیات واضح ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اپنے آپ کو فاضل نہ سمجھنا، دوسرے یہ کہ نکتہ چینی پر برا نہ ماننا۔

عمدۃ الفقہ کتاب الحج کی کتابت کے وقت عاجز نے حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت نے بعض جگہ ایک ایک عبارت پر چھ چھ سات سات کتابوں کے حوالے دیئے ہیں، اگر وہ حوالہ جات مقدم مؤخر ہو جائیں تو کوئی حرج تو نہیں؟ فرمایا ایسا نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ پہلا حوالہ اس کتاب کا ہے جس کی عبارت زیادہ آئی ہے، پھر اس کا حوالہ ہے جس کی عبارت اس سے کم آئی ہے، پھر اس سے کم عبارت والا۔ اسی ترتیب سے میں نے حوالہ دیئے ہیں، لہذا ترتیب میں مقدم مؤخر نہیں ہونا چاہیے۔

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی بھی عجیب شخصیت تھی۔ آپ کو تصوف، فقہ اور سیرت کے علاوہ بھی اکثر علوم و فنون پر کافی دسترس حاصل تھی اور ان سے متعلق جب گفتگو فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آپ اس کے ماہر ہیں۔ مثلاً تجوید، طب، شاعری، ہومیوپیتھی، ایلوپیتھی اور سیاسی معلومات بہت اچھی تھیں اور ان کا بہت عمدہ تجزیہ فرماتے تھے۔ اگر سیاست پر گفتگو چھڑ گئی تو اس

پر بھی ایسی سیر حاصل تقریر فرماتے گویا کہ ایک سیاسی لیڈر تقریر کر رہا ہے ۔ اسی طرح طب ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی پر بھی ایک ماہر کی طرح جملہ معلومات تھیں اور دواؤں کے متعلق مناسب مشورہ دے دیا کرتے تھے ، البتہ آپ کی طبیعت عملیات کی طرف بالکل مائل نہ تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ تو ضمنی چیزیں ہیں، اصل تو حق سبحانہ وتعالیٰ کی رضاو معرفت ہے ۔ جس کو یہ حاصل ہو گئی اس کو سب کچھ حاصل ہو گیا۔

از جناب ڈاکٹر وفا راشدی صاحب

حضرت مولانا الحاج سید زوار حسین شاہ نقشبندی مجددی سعیدیؒ ان اولیائے کرام اور علمائے عظام میں سے تھے جن کے دم سے دیارِ کراچی علم و فیض کا مرکز اور شریعت و معرفت کا گہوارہ رہا ہے ۔ سید زوار حسین شاہ رحمتہ اللہ علیہ برصغیر کے مشہور ولی اللہ اور مبلغ اسلام ، قطب الاقطاب ، قدوۃ العارفین ، زبدۃ الواصلین حضرت مولانا حافظ قاری خواجہ محمد ابو سعید ہاشمی فاروقی نقشبندی مجددی قدس سرہ کے خلیفہ خاص اور استاذ الاساتذہ الحاج پروفیسر ڈاکٹر مولانا غلام مصطفےٰ خاں (سابق صدر شعبہ اردو ، جامعہ سندھ) جیسے مجموعہ کمالات و جامع الصفات عارف باللہ و عالم با عمل کے پیر و مرشد تھے ۔

شاہ صاحب اوائل عمر سے عارفانہ مزاج اور فقیرانہ طبیعت کے مالک تھے ۔ قدرت نے شروع سے ان کی فطرت میں علم و فضل ، ذکر و فکر ، محبت و معرفت کے اوصاف عطا کئے تھے ۔ وہ ہمیشہ رضائے الٰہی کے لئے دستِ بدعا رہتے :

" الٰہی مقصودِ ماتوئی و رضائے تو ، مارا محبت و معرفتِ خود بدہ ، الٰہی مارا آں بدہ کہ بدوستاں خود دادی ، الٰہی از تو ترا می خواہم

مولانا سید زوار حسین شاہ ایک عالم با عمل اور بزرگ بافیض تھے ۔ امامت ، خطابت ،

تقریر، تصنیف، تالیف میں عالمانہ و فاضلانہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ مسجدوں، مدرسوں، علمی و روحانی مجلسوں اور ادبی محفلوں میں جہاں بھی ہوتے قدآور و تناور درخت کی طرح نمایاں نظر آتے تھے۔ اسوۂ حسنہ کی زندہ مثال، مجسمۂ اخلاص و ایثار اور سراپا عجز و فقر تھے۔

مولانا سید زاورؔ حسین شاہ کی تمام تر نگارشات احیاء دین، شریعتِ مطہرہ، رموز تصوف اور اسرار توحید و رسالت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی تصنیف، تالیف، ترجمہ، تحریر و تقریر کا اصل مقصد احکاماتِ الٰہی، ارشاداتِ نبویؐ، تعلیماتِ انبیاء، پیغاماتِ اولیاء کی روشنی میں عوام الناس کے دلوں کو نورِ ایمانی و تجلیاتِ سبحانی سے بھر دینا اور معاشرے کو شر کے اثرات سے پاک کرنا ہے۔ انہوں نے اپنے نصب العین کی تکمیل کے لئے نہایت آسان اور عام فہم زبان کو اپنایا۔ طرزِ تحریر شگفتہ، دلنشین، اسلوب سادہ اور پر کشش ہے۔ قرآن اور حدیث کے حوالوں سے ان کی تحریریں زیادہ جاندار، بصیرت و روحانیت سے معمور ہیں۔

باب دوم:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
بحیثیت شاعر

از سیّد فضل الرحمٰن

حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شعر و سخن کا بہت صاف ستھرا اور فطری ذوق ودیعت ہوا تھا۔ آپ ایک خوش الحان اور پر درد شاعر تھے۔ آواز میں ایک خاص سوز تھا۔ شعر گوئی کی ابتدا اسکول کے زمانہ ہی سے ہو گئی تھی اور اسکول ہی کے زمانہ میں اس فن میں دسترس اور مہارت تامہ حاصل ہوئی کہ آپ بلند پایہ اشعار بے تکان کہتے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے شعر و سخن کو مشغلہ کے طور پر کبھی نہیں اپنایا، بلکہ بچپن ہی سے آپ کی دلچسپیوں کا مرکز کونوا مع الصدقین کے مصداق بزرگوں اور اولیاء اللہ سے گہری محبت و عقیدت اور زیادہ سے زیادہ ان بزرگوں کی صحبت و خدمت اور مجالس سے تزکیہ نفس اور فیوض و برکات کا حصول تھا اسی لئے آپ کی عملی زندگی اتباع شریعت اور تقویٰ کا مظہر رہی۔

آپ اسکول کے پروگراموں میں موقع و محل کے لحاظ سے نظمیں پڑھتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی آپ سے لکھوا کر لے جاتے تھے۔ آپ کی زبان مبارک سے کئی مرتبہ سنا کہ اس (اسکول کے) زمانے میں اشعار کہنے کی اس درجہ مشق تھی کہ اگر کوئی شخص کسی خاص موقع کے لئے کچھ اشعار لکھنے کی فرمائش کرتا تو اسی وقت چند منٹ کے اندر لکھ کر دے دیتے۔

دوسرے شعراء کا اردو فارسی کلام بھی آپ کو بکثرت یاد تھا، اسی لئے اپنی گفتگو کے دوران اشعار کا استعمال بر محل فرماتے۔ علم عروض پر بھی آپ کو پورا عبور حاصل تھا۔

ایک مرتبہ جب آپ کی ایک نظم مولانا سر رحیم بخش وزیر اعظم ریاست بھاول پور نے سنی، جو آپ کے ہم وطن تھے، تو انھوں نے اس قدر پسند فرمائی کہ اس نظم کو ایک مشاعرے میں

پڑھنے کے لئے مجبور کیا اور آپ کو وہ نظم پڑھنی پڑی۔ اس طرح آپ کو بعض مشاعروں میں بھی حصہ لینے کا اتفاق ہوا اور بعض شعراء اپنے کلام کی اصلاح تو آپ سے اخیر دم تک لیتے رہے۔ لیکن چونکہ آپ کا مقصد شاعری نہ تھا اس لئے اس مجموعے کو محفوظ نہ رکھا۔ پرانے کاغذات سے بعض نظمیں دستیاب ہوئی ہیں جن میں آپ کا تخلص شمسی درج ہے۔ ایک نظم "الوداعی" عنوان سے ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظم کسی اسکول سے رخصت ہونے پر کہی گئی ہے۔

علاوہ ازیں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف "گلدستہء مناجات" میں اور حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے بعض رسائل مثلاً مبدأ و معاد، معارفِ لدنیہ اور شرح رباعیات میں فارسی اشعار کے ترجمے بھی اشعار ہی میں کئے ہیں جو آپ کی شاعری کی اعلیٰ قابلیت پر مبنی ہیں۔

از جناب حنیف احمد اسدی صاحب

حضرت شاہ صاحبؒ ایک اچھے سخن فہم ہی نہیں ایک بلند ذوق سخن گو بھی تھے۔ آپ زوار تخلص فرماتے تھے۔ نثر نگاری میں تو وہ ایک صاحبِ مقام اور نمایاں شخصیت کا درجہ رکھتے ہیں اور متعدد تصانیف ان سے یادگار ہیں مگر شاعر کے لحاظ سے حضرت پر گو ضرور تھے مگر کم گو تھے۔ مجھے آپ کی خدمت میں حاضری کا بارہا شرف حاصل ہوا ہے۔ حضرت نے مجھ سے میرا نعتیہ کلام بھی سنا ہے اور ہمیشہ داد و تحسین سے بھی نوازا ہے۔ میں نے ان کو بڑا سخن شناس پایا مگر یہ بات میرے علم میں بھی نہ تھی کہ خود حضرت بھی مشقِ سخن فرماتے ہیں۔

میرے سامنے ان کا بڑا مختصر سا کلام ہے۔ ایک حمد، ایک نعت، دو منقبتیں اور ایک کسی خاص موقع پر لکھی ہوئی الوداعی نظم۔ ان چند نظموں سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: اول یہ کہ شاہ صاحب قبلہؒ شعر بھی کہتے تھے اور اس بارے میں بھی بڑے ستھرے مذاق کے مالک تھے۔ دوسرے یہ کہ دوسرے شعراء کی طرح حضرت نے اپنا زیادہ وقت شاعری کو نہیں دیا ورنہ ان کے یہاں بھی غزلیات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہوتا۔ شاعری کارِ بے کاراں ہے، عام طور پر تسکینِ نفس اور لطف و لذت کے لئے شعر کہے جاتے ہیں اور اکثر شعرا کا کلام لہو و لعب کے لئے استعمال ہوتا

ہے۔ مگر اللہ والوں نے اس بے مصرف صنف سے بھی بڑا پاکیزہ کام لیا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک مقصد ہوتا ہے اور سچے جذبات کی ترجمانی کے لئے اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ تبلیغِ دین اور اصلاح نفس جیسے اہم مقاصد کے لئے شعر کہنے والوں کی ادا ہی جدا ہے۔ ہمارے شاہ صاحبؒ کی شاعری بھی انہی حدود کے دائرہ میں سفر کرتی ہے۔ ان کے خیالات پاکیزہ، مضامین پاکیزہ تر، بیان سلجھا ہوا، زبان سلیس اور فکر محتاط و متوازن ہے اور ان کی شاعری دوسرے ثقہ شعراء کی طرح صرف حمد، نعت اور منقبت تک محدود ہے۔

حمد، نعت اور منقبت کی صحیح درجہ بندی کے لئے دین کا حقیقی شعور درکار ہے۔ اس کی روشنی میں جب ہم حضرت زوّار شاہ صاحبؒ قبلہ کی شاعری کو دیکھتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس ضمن میں ان کا بڑا محتاط رویہ ہے۔ ان کی فکر محتاط اور متوازن ہے اور ان کے اظہارِ بیان میں پاکیزگی اور نظافت پائی جاتی ہے۔

اللہ جل شانہ کی عظمت و بزرگی بیان کرتے ہوئے وہ ایک عاجز بندہ کی طرح مقام عبدیت پر فائز نظر آتے ہیں۔

آب و گل کو تن دیا اور تن کو بخشی جانِ پاک
رتبہ انسان کو دیا فی احسن التقویم کا

اور جب وہ نعت کی طرف تشریف لاتے ہیں تو ان کو اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ حسن عقیدت سے سرشار ہو کر اس طرح فرماتے ہیں:

کس زباں سے میں کروں نعتِ محمدؐ مصطفٰے
میری گویائی ہے عاجز اور تخیل نارسا

ان کو اپنے مرشد سے والہانہ عشق ہے۔ شیخ کی محبت میں کہے ہوئے اشعار ان کی قلبی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن وہاں بھی جس احتیاط اور قدرِ مراتب کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ عام شعراء تو کیا بہت سے ثقہ شعراء کے یہاں بھی نہیں ملتا۔

نگاہِ فیض پڑ جاتی تھی جس پر میرے مرشد کی
محبت اس میں گھر کرتی تھی اللہ اور محمدؐ کی

آپ نے دیکھا کہ مرشد سے اس والہانہ عقیدت کی توجیہ کتنی سچی اور اچھی ہے۔ مرشد کی عظمت ان کی نگاہ میں اس سبب سے ہے کہ وہ اللہ اور رسول سے محبت رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر شاعری اپنے جذب و کیف، نظافت و پاکیزگی اور احتیاط و توازن کے اعتبار سے حضرت کی روحانیت اور باطنی کیف کا پتہ دیتی ہے اور دوسرے شعراء کے لئے اسباب ہدایت فراہم کرتی ہے۔ یہ ان کا فیض جاریہ ہے۔ اللہ رب العزت ہم کو بھی اس فیض سے مستفیض فرمائے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے درجات بلند فرمائے اور ان کی قبر کو ٹھنڈا رکھے۔ آمین ثم آمین۔

از محترم ثناء الحق صدیقی صاحب

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شاعرانہ ذوق بھی نہایت ستھرا تھا اور ان کی شاعرانہ صلاحیتیں بھی ان کی زندگی کی طرح دین و مذہب کے لئے وقف تھیں۔ ان کی منظومات میں عموماً شرعی مسائل اور تصوف کے بعض پہلو بیان ہوئے ہیں۔ کسی دوسری زبان بالخصوص فارسی سے ترجمہ کرتے وقت وہ اس بات کا التزام کرتے تھے کہ نثر کا ترجمہ نثر میں ہو اور اشعار کا اشعار میں۔ شعر بھی نہایت سادہ زبان میں ہوتے ہیں، لیکن نہ بندش الفاظ اور تراکیب میں کہیں جھول دکھائی دیتا ہے، نہ تعقید لفظی و معنوی کا کوئی شائبہ ہے اور نہ زور بیان میں کوئی کمی۔ گلدستۂ مناجات میں انھوں نے بزرگان دین کی یا ان سے منسوب بعض دلکش اور پر تاثیر مناجاتوں کو یکجا کرکے سب کا منظوم ترجمہ بھی شائع کیا ہے جو اثر و تاثیر میں کچھ کم نہیں ہے۔

از محترم ڈاکٹر محمد مظہر بقا صاحب مدظلہ

ایک شعر کے بارے میں غور ہوا کہ یہ کس طرح ہے۔ شعر اس طرح لکھا ہوا ہے:

روم بدوزخ و شکر بہشت باید گفت — کہ ایں بہ نزد و مکافات من بہشت من است

مزد (یہ تصحیح ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی ہے)

میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی تصحیح درست معلوم ہوتی ہے "مزد" کو "مکافات" کی طرف اضافت کے بغیر پڑھنا پڑے گا تب معنی درست ہوں گے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ

پھر وزن کے مطابق نہ رہے گا۔ میں نے عرض کیا کہ زحاف شمار کیا جائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ اضافت میں زحاف جائز نہیں۔

پھر اس پر گفتگو ہوئی کہ دوسرے مصرعہ میں یہ لفظ "کہ ایں" ہے یا "کیں"۔ میں نے عرض کیا کہ یہ پہلے مصرعہ کے "روم" کے وزن پر "کہ ایں" ہے۔ فرمایا کہ ہاں "دند مجموع" ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کو علمِ عروض بھی کتنا مستحضر ہے۔

اس شعر پر گفتگو ہوئی کہ اس میں کیا کمی ہے:

ازاں روے کہ چشم تست احول　　　معبودِ تو پیر تست اول

میں نے عرض کیا تھا کہ بظاہر دوسرے مصرعہ میں لفظ "کہ" لگا دیا جائے تو وزن پورا ہو جائے گا اور اس کا مطلب لینے میں پہلے مصرعہ کا مفہوم مقدم ہو گا۔ یعنی یہ بات کہ تیرا پیر تیرا معبود اول ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ تیری آنکھ بھینگی ہے۔ آج حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ دراصل مثنوی کا وزن ہے اور مثنوی کے وزن متعدد ہوتے ہیں۔ مثلاً مثنوی گلزار نسیم کا وزن یہ ہے۔ یہ کہہ کر مثنوی گلزارِ نسیم کے دس بارہ شعر پڑھ دیئے۔ پھر فرمایا کہ یہ شعر بھی مثنوی کے وزن میں اور دوسرے مصرعہ میں کسی اضافے کی بجائے پہلے مصرعہ میں "ازاں" کے بجائے "زاں" ہے۔

از محترم حاجی محمد اعلیٰ صاحب

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی رحلت سے چند دن قبل اس عاجز نے عرض کیا کہ:

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا　　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

یہ شعر تو موت کے وقت کے تاثرات سے متعلق ہے۔ ایسا شعر ہونا چاہیے جو عام حالات میں بھی اس تاثر کی یاد دہانی کرائے۔ تو آپ نے تھوڑے تامل کے بعد یہ شعر فرمایا۔ اس شعر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ آپ کا آخری شعر ہے۔ ملاحظہ ہو:

تصور موت کا اے دوستو کر کے ذرا دیکھو　　　نظر آتی ہے اپنی عمرِ رفتہ خواب و افسانہ

ازجناب ڈاکٹر وفا رشدی صاحب

مولانا زوار حسین شاہ شاعری بھی کرتے تھے۔ زوار ان کا تخلص تھا۔ شاعری کو تبلیغ دین اور تطہیر ملت کا ایک مؤثر و مفید ذریعہ سمجھتے تھے۔ صرف نظمیں کہتے تھے۔ ان کی نظمیں کہیں مولانا محمد حسین آزاد اور کہیں مولانا الطاف حسین حالی کی یاد دلاتی ہیں۔ حقیقت کی عکاسی، فطرت کی نقاشی اور جذبات و تاثرات کی ترجمانی میں جو طرز اپناتے اس میں انہیں بزرگوں کی پیروی معلوم ہوتی۔

مولانا زوار شاہ کے پیر و مرشد کی وفات حسرت آیات (۱۹۴۴ء) کے موقع پر مسجد سالار گنج پانی پت میں سالانہ اجتماع کا انعقاد ہوا۔ اس جلسے میں شرکت کے لئے شاہ صاحب دہلی سے تشریف لائے۔ راستہ میں ایک نظم بعنوان "یادِ مرشد" کی تخلیق ہوئی، یہ نظم ۲۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم جس والہانہ کیفیت میں کہی گئی، جس وارفتگی و بے ساختگی سے ایک ایک شعر کو جذبات و کیفیات کے سانچے میں ڈھالا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس نظم کا تیسرا حصہ دیکھئے:

مبارک تجھ کو اے زوار پھر روزِ سعید آیا
تجھے پھر یادِ مرشد نے ہے اس محفل میں بلوایا
خدا کی راہ میں مٹ جا خدا کے نام پر بک جا
یہی ایسی تجارت ہے کہ جس کو بے خطر پایا

۲۹ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ "بیادگار خواجہ محمد سعید ہاشمیؒ کی نشستِ الفاظ، چستیِ بندش، روانیِ زبان اور زورِ بیان دیکھئے:

وہ شمسِ معرفت، شیخ طریقت، عارفِ کامل
وہ دانائے شریعت، رہبرِ حق، واقفِ منزل
مرے مولا، مرے مرشد، سعید ہاشمی قریشی
وہ حنفی نقشبندی سہروردی قادری چشتی
توکل صبر و تسلیم و رضا، و شکرِ ربانی
تواضع بندگی بندہ نوازی خندہ پیشانی
تبسم ہی تبسم تھی سراسر گفتگو ان کی
محمدؐ کی غلامی تھی ہمیشہ آرزو ان کی

حضرت شاہ صاحبؒ کا کلام

حمد باری عزاسمہ

حمد کے لائق ہے یارب تیری ذاتِ کبریا
امرِ کن میں رازِ تخلیقِ جہاں مضمر کیا

گنبدِ گردوں کو بخشے انجم و شمس و قمر
انجم و شمس و قمر کو دے دیا نور و ضیا

ابر کو باراں عطا کی خاک کو روئیدگی
گل کو بخشا رنگ و بو اور شاخِ تر کو پھل دیا

کر دیا مٹی کو تو نے لعل و گوہر سیم و زر
قطرہء باراں کو تو نے لو لوئے لالہ کیا

آب و گِل کو تن دیا اور تن کو بخشی جانِ پاک
رتبہ انساں کو دیا فی احسن التقویم کا

انبیاءؑ و مرسلینؑ بھیجے ہدایت کے لئے
چار سو عالم میں پھر توحید کا چرچا ہوا

خیر امت میں کیا مبعوث ختم المرسلینؐ
معجزہ اس فخرِ عالمؐ کو دیا قرآن کا

بھیج یارب سرورِ دیں پر ہزاروں رحمتیں
آلؓ اور اصحابؓ پر بھی روز و شب صبح و مسا

نعت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

کس زباں سے میں کروں نعتِ محمدؐ مصطفٰے
میری گویائی ہے عاجز اور تخیل نارسا

آپؐ کی مدحت سرا توریت و انجیل و زبور
آپ کی تعریف میں رطب اللساں فرقان و نور

ذرہ ذرہ آپؐ کی ختمِ رسالت پر شہید
قطرہ قطرہ آپ کے دستِ سخاوت کی چکید

باعثِ تخلیقِ عالم رحمۃ للعالمینؐ
سرورِ دیں فخرِ موجودات ختم المرسلینؐ

کحل مازاغ البصر سے چشم باطن کی کشود
اسوہء حسنہ سراجِ سالکِ ربِ ودود

ہے سراپا نور ہی نور آپؐ کی ذاتِ کریم
ہے مجسم جود ہی جود آپؐ کا خلقِ عظیم

آپؐ کی ذاتِ گرامی محرمِ رب العلیٰ
آپؐ کے ذکرِ مشرف کا ہے خود رافع خدا

میں ہوں شیدائے محمدؐ غم مجھے زوار کیا
ہیں محمدؐ مصطفٰے جب شافعِ روزِ جزا

الوداعی نظم

ابتدا میں آپ شمسی تخلص فرماتے تھے، یہ نظم اسی دور کی ہے۔

کس فصل کی رخصت پہ چمن خاک بسر ہے
کس رنج و الم کا رخ گل چیں پہ اثر ہے

کس گل کی جدائی سے پریشان ہے بلبل
گلشن ہے کہ صد حسرت و آلام کا گھر ہے

کس کے غم فرقت میں ہے گل چاک گریباں
کیوں داغ سے پر لالہ و نرگس کا جگر ہے

طوطی ہے کہیں نوحہ کناں اور کہیں قمری
طائر بے غم غم و آلام اثر ہے

سنبل ہے پراگندہ تو ہے سرو بھی حیراں
حسرت کا مرقع یہاں ہر ایک شجر ہے

کس غم میں ہوئی دیدہ، پر آب ہے شبنم
کیوں آہ کش رنج و الم بادِ سحر ہے

گلشن سے وداع ہوتے ہیں نہالان چمن آج
افسوس جدا ہوتے ہیں یاران چمن آج

اک وقت وہ تھا باغ تھا سرسبز سراسر
پودے کہیں شاداب کہیں گل تھے معطر

ہم غم سے تھے واقف نہ الم سے تھے خبردار
رنج اور خوشی اپنے لئے سب تھے برابر

گر روٹھتے تھے لڑکے کبھی ملتے تھے باہم
گہ ہوتے تھے دشمن کبھی بنتے تھے برادر

اجلاس میں میدان میں اور سیر گہوں میں
بارونق و پرشور تھا ہر ایک ہی منظر

لیکن یہ گیا وقت گذر چشم زدن میں
یہ عیش یہ آرام ہوئے آج مکدر

رہنے نہ دیا چین سے اس چرخ کہن نے
یاروں سے جدا کر دیا دوران زمن نے

اے دوستو! گو ہم کو گوارا نہیں فرقت
لیکن ہے تمہارے لئے غربت ہی میں عزت

تکلیف اٹھاؤ عمل و علم کماؤ
محنت سے ہی دنیا میں ہے انسان کو راحت

غفلت سے گذارو نہ کوئی دم بھی عزیزو
بربادیء اقوام کا باعث ہے یہ غفلت

عزت ہے یہی عشرت و راحت ہے اسی میں
پڑھ لکھ کے کرو ملک کی اور قوم کی خدمت

داناؤں کا یہ قول ہو معمول ہمارا
اے دوستو! یہ فرصت اندک ہے غنیمت

شمسی کی دعا ہے کہ رہو پھولتے پھلتے
ہو شامل احوال سدا رحمت و برکت

یہ اوج ترقی ہو مبارک تمہیں بچو
اور یاد دعا خیر میں رکھنا ہمیں بچو

یادِ مرشد

مجھے پھر آج وہ دورِ گزشتہ یاد آتا ہے
خیالِ یادِ مرشد میرے دل کو گدگداتا ہے

وہ شمسِ معرفت ، شیخِ طریقت ، عارفِ کامل
وہ دانائے شریعت ، رہبرِ حق ، واقفِ منزل

مرے مولا مرے مرشد ، سعید ہاشمی قرشی
وہ حنفی نقشبندی سہروردی قادری چشتی

مجازِ خواجہ فضل علیؒ شاہ غوث صمدانی
مجدد الف ثانیؒ کی محبت میں جو تھے فانی

کروں توصیفِ مرشد ، یہ کہاں تاب وتواں میری
تخیل میرا ناقص نامکمل ہے زباں میری

جمیل وصائب الرائے حسن سیرت حسین صورت
وہ زاہد متقی ، صاحب نظر ، صاحب دل و الفت

توکل صبر و تسلیم و رضا و شکرِ ربانی
تواضع بندگی بندہ نوازی خندہ پیشانی

تبسم ہی تبسم تھی سراسر گفتگو ان کی
محمدؐ کی غلامی تھی ہمیشہ آرزو ان کی

لطافت میں نظافت میں وہ تقویٰ اور طہارت میں
وہ عفت میں شرافت میں سخاوت میں شجاعت میں

چلن میں سادگی میں وضع میں الطاف و رحمت میں
عمل میں حلم میں عفو و کرم میں اور طاعت میں

وہ اخلاقِ محمدؐ کا سراپا اک نمونہ تھا
کہ آغوشِ شریعت میں اسے فطرت نے پالا تھا

بہاول پور میں ہے شہر احمد پور شرقیہ
وہی تھا مولد و مسکن ہمارے پیر و مرشد کا

وہ دہلی ، پانی پت ، کرنال ، رہتک اور گوہانہ
وہ کیتھل کرکشیتر کاندھلہ ، انبالہ ، کیرانہ

وہ ان شہروں میں جب تبلیغ کو تشریف لاتے تھے
ہزاروں انکی صحبت سے مسلماں فیض پاتے تھے

عجب پر کیف تھا پر جذب تھا اس وقت کا منظر
کہ اللہ اور نبیؐ کے ذکر کا چرچا ہوا گھر گھر

نگاہِ فیض پڑ جاتی تھی جس پہ میرے مرشد کی
محبت اس میں گھر کرتی تھی اللہ کی محمدؐ کی

وہ جب اک بار تھے کرنال میں تبلیغ کو آئے
انھیں اسلام کی خدمات کے جذبات تھے لائے

ہوئے بیمار اٹھا دردِ گردہ سخت شدت کا
انھیں لے آئے پانی پت نہ جب آرام جاں آیا

دوا کرتے رہے جوں جوں مرض بڑھتا ہی جاتا تھا
بالآخر آگئی اجل مسمّی درد نے چھوڑا

کٹائے بال اور پوشاک بدلی ، ہاتھ منھ دھویا
ہوئی رحلت کی تیاری بسوئے عالم بالا

رہی اک روز تک حالت پھر استغراق کی طاری
مگر قلب و زباں پر ذکر تھا اللہ کا جاری

ربیع الثانی تیرہ سو تریسٹھ سال ہجری تھا
بروز جمعہ تھی انیسویں ، رختِ سفر باندھا

تیمم سے نماز ظہر ادا کی نزع تھا طاری
ہوئی پھر روح کی پرواز سوئے حضرتِ باری

بنا اس سر زمین اولیا میں آپ کا مرقد
بنا حکم خدا سے پانی پت میں آپ کا مشہد
کہاں تک اب سناؤں داستان غم مرے بھائی
نہیں باقی ہے اب میری زباں میں تابِ گویائی
تمنا ہے ترے زوار کی مولا عطا کر دے
مرے قلب و جگر کو حبِ مرشد میں فنا کر دے
ہمیں سنت کا تابع کر شریعت کی محبت دے
اور اس پر تادم آخر خدایا استقامت دے
عطا کردے مرے مولا ہمیں اوصافِ عرفانی
دلوں میں سب مسلمانوں کے بھر دے نورِ ایمانی

ہمارا خاتمہ بالخیر ہو ایمان کامل پر
بحق مصطفےٰ آل نبیؐ اصحاب پیغمبرؐ

دیگر

خوشا اے شہر پانی پت کہ برکت کی گھڑی آئی
کہ پھر تیری فضاؤں پر ہے رحمت کی گھٹا چھائی
کہیں تیرے چمن میں غنچہ و گل مسکراتے ہیں
کہیں ہے بلبل رنگیں نوا کی نغمہ پیرائی
جوانان چمن ہیں آج مستِ بادہ، صافی
نسیم صبح نے اک بانکپن سے لی ہے انگڑائی
مجھے بھی آج ذوق سخن بیتاب کرتا ہے
مرے دل میں ہے پیدا آرزوے محفل آرائی
وہ جن کے فیض سے ہر ذرہ مثل مہر تاباں ہے
اکابر ہستیاں اس شہر میں تشریف ہیں لائی

سنانے کو مسلمانوں کے احکاماتِ ربانی
مرے مرشد کی ہے یہ یادگارِ فیض روحانی

تبسم ہی تبسم تھی ادائے گفتگو جس کی
تلطف ہی تلطف جس کا ہر انداز ہوتا تھا
محمدؐ کی غلامی کی سعادت سے مشرف تھا
ولی اللہ تھا اللہ کے پیاروں کا پیارا تھا
شریعت میں وہ راسخ تھا طریقت میں وہ کامل تھا
حقیقت سے وہ واقف تھا فقیری کا سہارا تھا
رضائے حق کا طالب سنت نبویؐ پہ عامل تھا
عزیزوں کا دلارا تھا مریدوں کا وہ پیارا تھا
بتاؤں کیا میں اے زوار کیا کچھ تھا مرا مرشد
مری آنکھوں کا تارا تھا مرے دل کا سہارا تھا

بالآخر آیا پیغام اجل منجانب مولا
کہا لبیک اور رخصت ہوئے وہ حضرت والا

مبارک تجھ کو اے زوار پھر روز سعید آیا
تجھے پھر یادِ مرشد نے ہے اس محفل میں بلوایا
تری سوئی ہوئی تقدیر کے بیدار کرنے کو
محمدؐ کی محبت کا سنگھانے نخجہ آیا

خدا کی راہ میں مٹ جا خدا کے نام پر بک جا
یہی ایسی تجارت ہے کہ جس کو بے خطر پایا
مٹا کر اپنی ہستی جب ہوا اللہ سے واصل
تجھے ہر چیز میں اللہ کا جلوہ نظر آیا
شریعت کے یہ خادم ہیں طریقت بھی حقیقت بھی
مجدد الف ثانیؒ نے ہے یہ ارشاد فرمایا
محمدؐ کی غلامی سے سرِ مو ہو نہ تو باہر
یہی تعلیم دیتے تھے ہمارے مرشد و رہبر

ہزاروں رحمتیں نازل ہوں دائم میرے مرشد پر
اور ان کے مرقد اطہر کو یارب پر ضیا کر دے
مقام قرب میں یارب انھیں ہر دم ترقی دے
انھیں خلدِ بریں میں رتبۂ اعلیٰ عطا کر دے
خدایا دو جہاں میں ان کی اولاد و اقارب کو
سعادت مند کردے بامراد و باصفا کردے
اور انکے سب مریدوں کو سدا یارب ترقی دے
تو ان کو کامیاب و کامراں روزِ جزا کر دے
ہمارے سینے تیرے فیض سے معمور ہو جائیں
ہمیں راہِ طریقت میں خداوندا فنا کر دے
ہمیں یارب تو اپنے راستہ پر استقامت دے
نبیؐ اور آل و اصحابِ نبیؐ کی ہم کو الفت دے

روزہ

ہے صیام ماہِ رمضان فرض عین و رکن دین
اس کا منکر ہے بلاشک منکرِ شرع متین
کس قدر اقبال مندی ہے یہ روزہ دار کی
ہے یہ ارشادِ خداوندی انا اجزی به

زکوۃ

ہے زکوۃ اموال کی بھی فرض عین و رکن دین
منکر اس کا کافر و تارک ہے فاسق بالیقین
جو مسلماں دیتے رہتے ہیں زکوۃ اموال کی
رہتے ہیں خوشحال اور بڑھتے ہیں ان کے مال بھی

حضرت شاہ صاحب کے منظوم ترجمے

حضرت شاہ صاحب کے یہ مترجم اشعار گلدستۂ مناجات، معارفِ لدنیہ، مبدا و معاد اور مکتوباتِ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ کے ابتدائی سو مکتوبات کے اردو ترجمہ سے لئے گئے ہیں۔

مناجات منسوب بہ حضرت ابو بکر صدیقؓ

خذ بلطفک یا الہیٰ من لہ زاد قلیل　　مفلس بالصدق یاتی عند بابک یا جلیل

دستگیری کر مری جس کا کہ توشہ ہے قلیل　　صدق سے در پر ترے آتا ہے مفلس یا جلیل

ذنبہ ذنب عظیم فاغفر الذنب العظیم　　انہ شخص غریب مذنب عبد ذلیل

ہیں گنہ اس کے بڑے پس بخش دے جرم عظیم　　یہ غریب اک بندہ ہے عاصی و خاطی اور ذلیل

منہ عصیان و نسیان و سھو بعد سھو　　منک احسان و فضل بعد اعطاء الجزیل

اس سے عصیان اور نسیان بھول اوپر بھول ہے　　تجھ سے ہے فضل اور احسان بعد اعطاء جزیل

طال یارب ذنوبی مثل رمل لاتعد　　فاعف عنی کل ذنب فاصفح الصفح الجمیل

بیشک اے رب جرم میرے ان گنت ہیں مثل　　رب عفو کر سارے گنہ کر درگذر مجھ سے جمیل

قل لنار ابردی یارب فی حقی کما　　قلت قلنا نار کونی انت فی حق الخلیل

آگ کو تو کہہ کے ٹھنڈی مجھ پہ کر یارب مرے　　تو نے جیسا کہہ دیا یا نارکونی برخلیلؑ

عافنی من کل داء واقض عنی حاجتی　　ان لی قلباً سقیماً انت من یشفی العلیل

دے مجھے ہر دکھ سے راحت اور کر حاجت روا　　تو ہے شافی ہر مرض کا دل ہے میرا بس علیل

انت شافی انت کافی فی مھمات الامور　　انت حسبی انت ربی انت لی نعم الوکیل

سب ہماری مشکلوں میں تو ہے شافی اور بس　　تو ہی کافی تو ہی مالک تو ہی میرا ہے وکیل

رب ھب لی کنز فضلک انت وھاب کریم　　اعطنی مافی ضمیری دلنی خیر الدلیل

کر عطا تو گنج فضل اے دینے والے اے کریم　　کر عطا دل میں جو ہے میرے دکھا بہتر دلیل

کیف حالی یا الھی لیس لی خیر العمل　　سوء اعمالی کثیر زادا طاعاتی قلیل

کیا ہے میرا حال یارب ہیں نہیں اچھے عمل　　بدعمل میرے بکثرت زاد طاعت ہے قلیل

ھب لنا ملکاً کبیراً نجنا مما نخاف　　ربنا اذ انت قاض والمنادی جبرئیل

کر عطا ملکا کبیرا اور دہشت سے بچا　　حشر میں جب تو ہو قاضی اور منادی جبرئیلؑ

این موسیٰ این عیسیٰ این یحییٰ این نوح　　انت یا صدیق عاص تب الی المولی الجلیل

ہیں کہاں موسیٰؑ و عیسیٰؑ، ہیں کہاں یحییٰؑ و نوحؑ　　تو بھی اے صدیق عاصی، توبہ کر سوئے جلیل

مناجات

یامن یری مافی الضمیر و یسمع — انت المعد لکل ما یتوقع
یا خدا سنتا ہے دل کی بات تو — مدعا دیتا ہے ہاتھوں ہاتھ تو
یا من یرجی للشدائد کلہا — یا من الیہ المشتکیٰ و المفزع
سختیوں میں تجھ سے امید نجات — درد دکھ سنتا ہے سب دن رات تو
یا من خزائن رزقہ فی امر کن — امنن فان الخیر عندک اجمع
تیرے کن میں گنج روزی ہے نہاں — ہم پہ احساں کر جلیل الذات تو
مالی سویٰ فقری الیک وسیلۃ — فبالا فتقار الیک فقری ادفع
غیر محتاجی نہیں کچھ میرے پاس — میں فقیر اور قاضی الحاجات تو
مالی سویٰ قرعی لبابک حیلۃ — فلئن رددت فای باب اقرع
کھٹکھٹاتا ہوں تری چوکھٹ کو میں — کیا ٹھکانا گر نہ دے یہات تو
حاشا لجودک ان تقنط عاصیاً — الفضل اجزل والمواہب اوسع
گو کثیر المعصیت انساں ہوں میں — ہے مگر رحمانِ مخلوقات تو
و من الذی ادعو واہتف باسمہ — ان کان فضلک عن فقیرک یمنع
کون ہے ، تجھ بن پکاروں جس کو میں — روک لے گر اپنے انعامات تو

ثم الصلوۃ علی النبی والہ
بھیج پیغمبر اور ان کی آل پر
خیر الا نام و من بہ یتشفع
کل مسلمانوں کے تسلیمات تو

اند کے پیشِ تو گفتم غمِ دل تر سیدم — کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است
بہت تھوڑی کہی ہے ڈرتے ڈرتے داستانِ غم — کہیں آزردہ ہو جائے نہ دل تیرا،میرے ہمدم

ذرہ گر بس نیک وربس بد بود — گرچہ عمرے تگ زند در خود بود

ذرہ خواہ نیک ہو یا بد ، مگر عمر بھر دوڑے ، رہے گا بس وہیں

دیگر

ہو نیک یا کہ بد ہو کوئی ذرہ حقیر بھاگا تمام عمر ، رہا خود میں وہ اسیر

اتصالے بے تکیف بے قیاس ہست رب الناس را باجانِ ناس

لیک گفتم ناس را نسناس نہ ناس غیر از جانِ جاں آشناس نہ

اتصال اللہ کا انسان سے ہے کچھ ایسا ، کب بیاں میں آسکے

ذکر یاں انسان ناقص کا نہیں بلکہ جو ہو مردِ کامل بالیقیں

اے دریغا کیں شریعت ملتِ اعمائی است ملتِ ما کافری و ملتِ ترسائی است

کفر و ایماں زلف و روئے آں پری زیبائی است کفر و ایماں ہر دو اندر راہِ ما یکتائی است

شریعت آہ اندھوں کی ہے ملت وہ کافر کی ہے یا ترسا کی حالت

رخ و زلفِ پری ہیں کفر و ایماں وہی میرے لئے راہِ ہدایت

در تنگنائے صورت معنی چگونہ گنجد در کلبۂ گدایاں سلطان چہ کارِ دارد

صورت پرست غافل معنی چہ داند آخر کوبا جمالِ جاناں پنہاں چہ کارِ دارد

صورت ہے تنگ کوچہ ، معنی کہاں سمائے ؟ منگتے کی جھونپڑی میں کیوں بادشاہ جائے ؟

صورت جو چاہے اسکو معنی سے کیا ہے نسبت ؟ اس کو جمالِ پنہاں کس طرح راس آئے ؟

آسودہ شبے باید و خوش مہتابے تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

پرسکون اور چاندنی ہو ایک رات تجھ سے دلبر کی کہوں ایک ایک بات

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید دیگراں نیز کنند آنچہ مسیحا میکرد

گر کرے امداد پھر روح القدس بس ایک بار دوسرے بھی کر دکھائیں جو مسیحا نے کیا

ہر گدائے مردِ میداں کے شود پشہ آخر سلیماں کے شود

نہیں ہوتا بھکاری مردِ میداں ــ کہ مچھر بن نہیں سکتا سلیماں

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ــ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست
مصلحت کا یہ تقاضا ہے عیاں راز نہ ہو ــ ورنہ رندوں سے تو پوشیدہ کوئی راز نہیں

عشق آں شعلہ است کہ چوں بر فروخت ــ ہرچہ جز مشعوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا درقتل غیر حق براند ــ درنگر زاں پس کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ــ شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت
جبکہ روشن عشق کا شعلہ ہوا ــ ما سوا معشوق کے سب جل گیا
غیر حق کو تیغ لا سے قتل کر ــ بعد ازاں کر اس کے باقی پر نظر
رہ گیا اللہ باقی سب فنا ــ عشق شرکت سوز تجھ کو مرحبا

فریادِ حافظ ایںہمہ آخر بہرزہ نیست ــ ہم قصہء غریب و حدیثِ عجیب ہست
حافظ جو کہہ رہا ہے وہ بے کار تو نہیں ــ یہ بات بس غریب بھی ہے اور عجیب بھی

اتصالے بے تکیف بے قیاس ــ ہست رب الناس را با جانِ ناس
لیک گفتم ناس را نسناس نہ ــ ناس غیر از جانِ جاں آشناس نہ
حق سے انسان کا عجب ہے اتصال ــ عقل و کیفیت میں کیونکر آئے گا
یہ ہے بات انسان کی حیواں کی نہیں ــ جانِ جاں کا بس ہے انساں آشنا

آنکہ از خویشتن چو نیست جنین ــ چہ خبردارد از چناں و چنیں
جبکہ واقف نہیں ہے خود سے جنین ــ پھر وہ کیا جانے ہے چناں و چنیں

دیگر

جو بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں ہے ــ اسے اس کی خبر ہے نہ اس کی

درنیا بدحال پختہ ، ہیچ خام　　پس سخن کوتاہ باید والسلام
حال کامل جب نہ جانے کوئی خام　　پھر تو خاموشی ہے بہتر والسلام

نماند بعصیاں کسے درگرو　　کہ دارد چنیں سید پیشرو
نہیں ہے خوف کچھ عصیاں کا اس کو　　محمدؐ پاک جس کا پیشوا ہو

پایہ آخر آدم است و آدمی　　گشت محروم از مقام محرمی
گرنہ گردد باز مسکین زیں سفر　　نیست ازوے ہیچ کس محروم تر
ہے نزولِ آخری میں آدمی　　پس ہے محرومِ مقامِ محرمی
گرنہ لَوٹے اس سفر سے وہ غریب　　کیا کہوں پس ہے نہایت بدنصیب

عالِم کہ کامرانی وتن . پروری کند　　اوخو یشتن گم است کرا رہبری کند
عالِم جو کامرانی و تن پروری کرے　　بھٹکا ہوا ہے آپ وہ کیا رہبری کرے

تو مرا دل دہ و دلیری بیں　　روبۂ خویش خواں وشیری بیں
دل مجھے دے ، میری دلیری دیکھ　　لومڑی اپنی جان شیری دیکھ

گر برتنِ من زباں شود ہر موئے　　یک شکرِ تو از ہزار نتوانم کرد
ہر رُواں تن کا گر زبان ہو جائے　　شکر کیا ہو ادا ہزار سے ایک

خوابم بشد از دیدہ دریں فکر جگر سوز　　کہ آغوشِ کہ شد منزل و آسائش خوابت
تمام شب مجھے اس فکر میں نہ نیند آئی　　کہ کس کی گود میں تو نے گزاری رات اپنی

قاصرے گرکند ایں طائفہ را طعن و قصور　　حاشَ للہ کہ برآرم بزباں ایں گلہ را
ہمہ شیرانِ جہاں بستہء ایں سلسلہ اند　　روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

اگر کوئی ناداں کرے طعن اس گروہِ پاک پر — حاش للہ گر زبان پر لاؤں میں اس کا گلہ
کل جہاں کے شیر وابستہ ہیں اس زنجیر سے — لومڑی توڑے گی کیوں کر مکر سے یہ سلسلہ

ہر کس افسانہ بخواند افسانہ است — وانکہ دیدش نقدِ خود مردانہ است
آب نیل است وبقبطی خون نمود — قوم موسیٰ را نہ خون بود آب بود
جس نے افسانہ کہا اس کے لیئے افسانہ ہے — جو اسے سمجھے حقیقت بس وہی فرزانہ ہے
قبطیوں کے حق میں آبِ نیل یکسر خوں ہوا — قوم موسیٰ کے لیئے وہ خون نہیں تھا آب تھا

زاں روئے کہ چشمِ تست اَحوَل — معبود تو پیرِتست اول
ابھی جب تک ہے تیری آنکھ احول — ہے مرشد ہی تیرا معبود اول

از پئے ایں عیش و عشرت ساختن — صد ہزاراں جاں ببابد باختن
اس طرح کے عیش و عشرت کے لیئے — صد ہزاراں جان کی بازی کرے

دیگر

اس جہاں کے عیش و عشرت کے لیئے — چاہئیں تجھے ہزاروں جان کے

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں — گرمانہ رسیدیم تو شاید بری
نشاں بتلا دیا ہم نے تجھے گنج سعادت کا — اگر ہم نے نہیں پایا تو شاید تجھ کو مل جائے

من آنچہ شرطِ بلاغ است باتو می گویم — تو خواہ از سخنم پند گیرو خواہ ملال
ادا کرتا ہوں حق تبلیغ کا اور تجھ سے کہتا ہوں — میری باتوں سے ہو تجھ کو نصیحت یا ملال آئے

اند کے پیشِ تو گفتم غمِ دل ترسیدم — کہ دل آزر دہ شوی ورنہ سخن بسیار است
بہت تھوڑی کہی ہے، ڈرتے ڈرتے داستاں دل کی — نہ ہو دل تیرا آزردہ وگرنہ بات ہے لمبی

می توانند کہ دہد اشک مرا حُسنِ قبول — آنکہ درساختہ است قطرہء بارانی را
کیا عجب ہو جائے گر مقبول یہ گریہ مرا — قطرہء باراں کو تو نے لُولُوئے لالہ کیا

گوشش ازبارِ دُر گراں شدہ است — نشنود نالہ و فغاں مرا
کان اس کے موتیوں کے بوجھ سے ہیں بس گراں — اس لئے وہ سن نہیں سکتے مری آہ و فغاں

ہمہ اندر زمنِ بتو ایں است — کہ تو طفلی و خانہ رنگین است
مری تجھ کو نصیحت بس یہی ہے — کہ گھر رنگین ہے تو بچہ ابھی ہے

در آں روزکز فعل پُرسند قول — اولوالعزم را دل بلرزد زہول
بجائیکہ دہشت برند انبیاء — تو عذرِ گنہ را چہ داری بیا
آہ اس پرسش عمل کے روز — دل اولوالعزم کا بھی لرزے گا
انبیاء بھی ڈریں گے دہشت سے — معذرت کس طرح تو کرے گا ؟

عجبے نیست اگر زندہ شود جان عزیز — چوں ازاں یارِ جدا ماندہ پیامے برسد
کیا عجب ہے کہ میری جاں کو ملے تازہ حیات — اگر اس دُور کے محبوب کا آجائے پیام

ایں سخن را چوں تو مبدأ بودۂ — گر فزوں گردد توش افزودۂ
ابتدا ہے اس سخن کی آپ سے — پس ترقی اس میں ہو گی آپ سے

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق — گر ملک باشد سیہ ہستش ورق
ذاتِ حق اور نیک بندوں کی عنایت جب نہ ہو — ہے سیاہ اعمال نامہ خواہ فرشتہ کیوں نہ ہو

گر بگویم شرح ایں بیحد شود — ورنویسم بس قلمہا بشکند

گر لکھوں شرح اس کی حد کوئی نہیں   لکھتے لکھتے ٹوٹ جائیں گے قلم

کِلکے بردند زیں دہلیزۂ پست   بداں درگاہِ والا دست بردست
نیچی چوکھٹ کی مٹی ہاتھوں ہاتھ   اُن کے صدقے میں پا گئی معراج

درنیابد حالِ پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام
کب سمجھ سکتا ہے ناقص کاملوں کے حال کو   چاہیئے اب مختصر کرنا ہی اپنے قال کو

من گم شدہ ام مرا مجوئید   با گمشدگان سخن مگوئید
میں ہوں گم مجھ کو نہ ڈھونڈو دوستو   گم شدہ لوگوں سے باتیں مت کرو

من ہیچم و کم ز ہیچ بسیارے   وز ہیچ و کم از ہیچ نیاید کارے
میں ہیچ ہوں ، ہیچ سے بھی کم ہوں   کیوں کر بنے ہیچ و کم سے کچھ کام !

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   ہرچہ استادِ ازل گفت بگو میگویم
مجھے طوطی کی مانند آئینہ کے پیچھے رکھا ہے   وہی کہتا ہوں استادِ ازل جو مجھ سے کہتا ہے

کرا زہرہ آنکہ از بیمِ تو   کشاید زباں جز بہ تسلیمِ تو
کس کی طاقت ہے کہ تیرے خوف سے   ماسوا تسلیم کچھ بھی کہہ سکے

ہزار بشستم دہن بمشک و گلاب   ہنوز نامِ تو گفتن مرانے شاید
گلاب و مشک سے دھولوں دہن کو پھر بھی مگر   ہے نام آپ کا لینا کمال بے ادبی

شرحِ او حیف است با اہلِ جہاں   ہمچو رازِ عشق باید درنہاں
لیک گفتم وصفِ او تا رہ برند   پیش ازاں کز فوتِ او حسرت خورند

اہل دنیا سے نہ کر اسکو بیاں — مثلِ رازِ عشق رکھ اس کو نہاں
دے رہا ہوں راہ رَو کو کچھ پتا — تا نہ مرتے وقت ہو حسرت زدہ

محمدؐ عربی کا بروئے ہر دوسرا ست — کسیکہ خاکِ درش نیست خاک برسراو
محمدؐ عربی دونوں جہاں کی عزت ہیں — جو منکر آپ کے ہیں مبتلائے ذلت ہیں

دیگر

محمدؐ عربی دونوں جہاں کی عزت ہیں — جو ان کے در کی خاک نہیں ، خاک ہو اس پہ

دیگر

عزت کونین ہیں حضرت محمد مصطفےٰؐ — آپ کا منکر ہوا خوار و ذلیل دوسرا

فراق دوست اگر اندک است اندک نیست — درونِ دیدہ اگر نیم موست بسیار است
نہیں ہے قابل برداشت ہجر یار تھوڑا بھی — گوارا آنکھ کر سکتی نہیں ہے بال آدھا بھی

قاصرے گرکند ایں طائفہ راطعن وقصور — حاش للہ کہ برآرم بزباں ایں گلہ را
ہمہ شیران جہاں بستہء ایں سلسلہ اند — روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را
ایسے لوگوں پر اگر ناقص کرے طعنہ زنی — میں کروں اپنی زباں سے کچھ گلہ توبہ مری
کل جہاں کے شیر وابستہ ہیں اس زنجیر سے — لومڑی توڑے گی اس حلقہ کو کس تدبیر سے ؟

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دیں — خاک برفرقِ قناعت بعد ازیں
جب طمع میری شہِ دیں کو پسند — پھر قناعت پر رہوں کیوں کاربند

بکفر و باسلام یکساں نگر — کہ ہریک زدیوان او دفترے ست
کفر اور اسلام کو یوں جانئے — ہیں دو دفتر ایک ہی دیوان کے

ہر کس کہ کشتہ گشت ازاں خال ہندوش — گرچہ شہید رفت مسلماں نمی رود

اس کے سیاہ تل پہ جو قربان ہو گیا ہو کر شہید بھی وہ مسلماں نہیں رہا

نماند بعصیاں کسے درگرو کہ دارد چنیں سید پیشرو
کب گناہوں میں رہے وہ مبتلا جس کے راہبر ہوں محمد مصطفےٰ

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں کانجا ہمیشہ بادبدست است دام را
اٹھالے جال عنقا کب کسی کے ہاتھ آتا ہے لگاتا ہے یہاں جو جال ، خالی ہاتھ جاتا ہے

ہیچ کس را تانہ گردد اوفنا نیست رہ دربار گاہ کبریا
ہو نہ کوئی شخص جب تک حبِ مولا میں فنا پا نہیں سکتا وہ راہِ بارگاہِ کبریا

اگر پادشہ بر درِ پیر زن بیاید تواے خواجہ سبلت مکن
اگر بڑھیا کے درپہ آئے سلطان تواے خواجہ نہ ہو ہرگز پریشان

در قافلہ کہ اوست دانم نرسم ایں بس کہ رسد زدور بانگِ جرسم
وہ ہے جس قافلے میں جانتاہوں میں نہ پہنچوں گا یہی بس ہے کہ آئے دور سے بانگ جرس ہردم

دیگر

وہ ہے جس قافلے میں جانتاہوں میں نہ پہنچوں گا یہی کافی ہے آوازِ جرس تو مجھ تک آتی ہے

رازِ درون پردہ ز رندانِ مست پرس کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را
راز درون پردہ تو مستوں سے پوچھئے یہ حال کب ہے صوفیِ عالی مقام کا

آنرا کہ در سرائے نگاریست فارغ ست از باغ وبوستاں و تماشائے لالہ زار
موجود جس کے گھر میں ہو محبوبِ گلعذار حاجت نہیں ہے کچھ اسے باغ و بہار کی

تا بجاروبِ " لاَ " نروبی راہ ، نرسی در سرائے " الا اللہ "
لا کی جھاڑو سے نہ ہو راہ کی صفائی جبتک ، کس طرح سے پہنچے گا تو خانہء الا اللہ تک

دیگر

لا کی جھاڑو سے نہ ہو جب تک صفائی راہ کی ، باب الا اللہ میں داخل نہیں ہو گا کبھی

خدائے کہ بالا و پست آفرید ، زبردست ہر زیردست آفرید ،
خدا نے بنایا ہے بالا و پست ، زبردست بالائے ہر زیر دست

من آں خاکم کہ ابرِ نَو بہاری ، کند از لطف برمن قطرہ، باری
اگر بر روید از تن صد زبانم ، چو سبزہ شکر لطفش کے توانم
میں وہ مٹی ہوں جس پہ ابرِ کرم ، گوہر افشاں ہے اپنی بارش کا
مثل سبزہ ہوں سو زبانیں بھی ، کس طرح اس کا شکر ہو گا ادا

وے چوں شہ مرا برداشت از خاک ، سزد گر بگذ رانم سرز افلاک
اٹھایا شہ نے جب مٹی سے مجھ کو ، بجا ہے سر کروں اونچا فلک سے

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند ، نہ ہر کہ سر بترا شد قلندری داند
محض آئینہ رکھنے سے سکندر بن نہیں سکتا ، فقط سر کے منڈانے سے قلندر بن نہیں سکتا

درافگندہ دَف ایں آوازہ از دوست ، کزو بردست دَف کوباں بود پوست
آرہی ہے دَف سے وہ آوازِ دوست ، ہے مگر دف والے کے ہاتھوں میں پوست

بعد از خدائے ہرچہ پرستند ہیچ نیست ، بے دولت است آنکہ بہ ہیچ اختیار کرد
بجز حق کے وہ جس کو پوجتے ہیں ہیچ و باطل ہے ، جو باطل کی کرے پوجا بڑا بدبخت و جاہل ہے

تاتو دربندِ خویشتن باشی عشق گوئی دروغ زن باشی
جب تلک ہے فکر اپنے آپ کی داستان عشق ہے جھوٹی تری

محال است سعدی کہ راہِ صفا تواں رفت جز درپئے مصطفےٰ
تجھے حاصل نہ ہو جب تک نبیؐ کی پیروی کرنا نہیں ممکن کبھی اہلِ صفا کی راہ پر چلنا

ہرچہ جز عشقِ خدائے احسن است گر شکر خوردن بود جاں کندن است
بجز عشق خدا جو کچھ بھی ہے کتنا ہی احسن ہے اگرچہ ہو وہ شیرینی و لیکن جان کندن ہے

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود
بحث بے جا ہے فقط کٹ حجتی کاٹھ کے پاؤں میں دم خم کچھ نہیں

دیگر

پاؤں استدلال کے ہیں چوب کے کوئی ان پر کب بھروسہ کرسکے

آئینہ صورت از سفر دور است کاں پذیرائی صورت از نور است
ہے آئینہ کی مثل جو عاشق سفر سے دور صورت کا عکس دور سے لیتا ہے اس کا نور

ہیچ کس را تانہ گردد او فنا نیست رہ در بارگاہِ کبریا
جب تک انساں کو نہ حاصل ہو فنا پائے کیونکر بارگاہِ کبریا ،

سبحان اللہ زہے خدائے متعال عالی زِ تصور و میرازِ خیال
از نورِ لطافتش ضمائر مشحون وز سر سرا یتش جہاں مالا مال
سبحان اللہ وہ ہے خدائے متعال اس تک نہ پہنچتا ہے تصور نہ خیال
دل جلوہ گہِ نورِ لطافت اس کا پر تو سے ہے اس کے یہ جہاں مالا مال
گویند وجودِ کون ، کون است و حصول نورے بجز از کون نہ کردہ است قبول

واللہ کہ دریں پردہ لسان الغیب است — بر طبقِ قواعد است و بر وفقِ اصول
کہتے ہیں وجودِ کون ، ہے کون و حصول — وہ نور بجز کون نہیں کرتا قبول
واللہ ہے لسان غیب پردے میں نہاں — یہ ہے مطابقِ قواعد و جملہ اصول
بشناس کہ کائنات رو در عدم اند — بل در عدم ایستادہ ثابت قدم اند
ویں کونِ معلق از خیال و وہم است — باقی ہمگی ظہورِ نورِ قِدَم اند
تو جان لے یہ خلق ہے مائل بہ عدم — یعنی کہ عدم میں ہی جمائے ہے قدم
یہ کون ، ہے کیا چیز ؟ محض وہم و خیال — باقی ہے سبھی یہ مظہر نورِ قدم
جامی معاد و مبدأ ما وحدت ست وبس — مادر میانہ کثرتِ موہوم و السلام
ہے ابتدا بھی وحدت اور انتہا بھی وحدت — موہوم ہے یہ جامی تو دیکھتا ہے کثرت

ومن بعد هذا مايدق صفاته — وما كتمه احظى لديه واجمل
بیان کرنا ہی ان اسرار کا مشکل مگر اب ہے — چھپانا ان رموزِ خاص کا اجمل ہے انسب ہے

احب قلبي وما دری بدني — ولو دری ما اقام في السمن
دل اسیر عشق تھا لیکن بدن تھا بے خبر — ورنہ خود اپنے موٹاپے سے اسے ہوتا حذر

كيف الوصول الى سعاد و دونها — قلل الجبال ودونهن خيوف
کس طرح پہنچوں میں اپنے یار تک — راہ میں حائل ہیں کوہ و غار تک

اليك يامنيتي حجي ومعتمری — ان حج قوم الى ترب واحجار
میری امید ، میرا حج اور عمرہ ہے تیری طرف — لوگ حج کرتے ہیں پتھر اور مٹی کی طرف

اهلاً لسعدىٰ والرسول وحبذا — وجه الرسول لحب وجه المرسل
مرحبا اے مرے دلدار و رسول دلدار — تیرے قاصد کی ملاقات ہے تیرا دیدار

هنیئاً لا رباب النعیم نعیمها | وللعاشق المسکین مایتجرع
مبارک منعموں کو ان کی نعمت | مبارک عاشقوں کو رنج و حسرت

دیگر

مبارک نعمتیں جنت کی ہوں ارباب جنت کو | مبارک جرعہ نوشی غم کی ہو بیمار الفت کو

ما ان مدحت محمدا بمقا لتی | لکن مدحت مقالتی بمحمد
ادا حق ہو نہیں سکتا محمدؐ کی ستائش کا | مگر مقبول ہو گا اس کی برکت سے سخن میرا

ومن بعد هذا مایدق صفاته | وما کتمه احظی لدیه واجمل
بعد ازاں باریک ہیں اس کی صفات | ان کے ہے پوشیدہ رکھنے میں نجات

الٰہی نجنا من کل ضیق | بجاہ المصطفی مولی الجمیع
طفیل مصطفیٰ بار الٰہا | ہر اک تنگی ہماری دور فرما
وهب لنا فی مدینته قرارا | بایمان و دفن بالبقیع
رہیں آخر تلک شہر نبیؐ میں | مریں تو دفن ہوں جنت بقیع میں

قطعاتِ تواریخ

از محترم حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ العالی

آہ رفت آں شیخ ما، تسکین قلب و جان ما | رہنما و مقتدائے ہر کبیر و ہر صغیر
حافظ و حاجی کہ ہم ورع و تقویٰ داشتہ | باعمل عالم کہ ساعی بود درخیر کثیر
بے مثال اندر علوم فقہ و تفسیر و حدیث | بے ہمال اندر طریقت در ریاضت بے نظیر
خوش بیان و خوش کلام و خوش مزاج و خوش عمل | از حیائے پاک عثمانیؓ نگاہش مستنیر

قطبِ دیں ، عینِ ولایت ، شاہ زوّار حسین

۱۴۰۰ھ

دارِ جنت بقعہ او ذالک الفوز الکبیر

۱۹۸۰ء

از جناب شمیم صبائی صاحب متھراوی

"سید زوار حسین شاہ امیرِ مکانِ خلدِ بریں"

۱۹۸۰ء

رستگاری موت سے کس کو ملی ۔ موت کے ہاتھوں سبھی لاچار ہیں
ہاتفِ غیبی پکارا اے شمیم ۔ " حاملِ باغِ جناں زوّار ہیں

۱۴۰۰ھ

از سید فضل الرحمٰن

ان المتقین فی جنت و نعیم (الطور آیت ۵۲ - ۱۷)

۱۴۰۰

الشیخ الحاج سید زوّار حسین

۱۴۰۰

سید مغفور

۱۴۰۰

حق آگاہ شمسِ معرفت حضرت حاجی سید زوّار حسین

۱۹۸۰

باب سوم:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات و تالیفات پر مبصرین کی آراء

از جناب مولانا سید محبوب حسن صاحب واسطی

حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے گوناگوں پہلو تھے مگر ان کی تین حیثیتیں یقیناً نمایاں تھیں۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے فقیہ تھے اور مسائل شرعیہ کی معمولی معمولی جزئیات تک ان کی گہری نظر تھی۔ وہ ایک سالک، درویش، صاحبِ ریاضاتِ شاقہ، شب بیدار اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ جنھوں نے اپنے متوسلین، معتقدین اور خلفائے عظام کے سامنے اتباعِ شریعت کا ایک کامل نمونہ پیش فرمایا اور ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا کو شریعت و سلوک سے قریب کیا۔ وہ ایک عظیم سوانح نگار، محقق اور بشری خصوصیات پر عمیق نظر رکھنے والے اہل قلم تھے، جنھوں نے بعض کاملین نقشبندیہ و متبعین شریعتِ غرہ رحمہم اللہ کو اپنی قلمی و تحقیقی کاوش کے لئے مخصوص فرمایا۔

حضرت مولانا زوار حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ پاک نے علم فقہ کے تینوں درجات نصیب فرمائے: درجہ تفقہ فی الدین بھی، درجہ انذار قوم بھی اور درجہ نگہداشت براثراتِ انذار بھی۔ عمدۃ الفقہ اور زبدۃ الفقہ حضرتؒ کی علم فقہ پر دو معرکۃ الآراء تالیفات ہیں۔ پہلی چار جلدوں پر پھیلی ہوئی احکام شرعیہ کی تفصیل اور دوسری بالکل ہی ابتدائی ضروری احکام کی تلخیص۔

درحقیقت عمدۃ الفقہ کی دو بہت بڑی خصوصیات ہیں۔ پہلی دقتِ نظری، جامعیت اور جزئیات و مسائل کا حیران کن حد تک استقصاء اور دوسری حسن ترتیب و سلامت زبان اور شگفتگیِ بیان۔ حضرت مولانا منتخب الحق صاحب مدظلہ نے صحیح فرمایا "یہ کتاب ایسی ہے کہ جس گھر میں موجود ہو اس گھر میں ایک مفتی موجود ہے۔"

○ عمدۃ الفقہ

از حضرت العلامہ شیخ الحدیث مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ

مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

" فقہ ہی وہ علم ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ہاں بھی اس کی قدر ہے اور بندوں کو اسی کی ضرورت۔ دنیا میں فقہ ہی علم دین ہے، جس کی ضرورت ہر وقت پڑتی رہتی ہے۔ "فقیہ" ہی عالم دین ہے۔ عربی زبان میں تو اس علم کے اتنے ذخائر جمع ہو گئے ہیں کہ عقل حیران ہوتی ہے، لیکن اردو زبان کا دامن ابھی ان جواہرات و خزانوں سے خالی ہے۔ اگرچہ فتاویٰ کے موضوع پر بہت کچھ ذخیرہ آگیا ہے پھر بھی موضوع تشنہ تھا۔ مستقل چند کتابیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ ان سے فقہی مسائل و جزئیات کا حق ادا نہیں ہوا۔ ان دنوں حضرت مولانا سید زوار حسین صاحب نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کی کتاب "عمدۃ الفقہ" نظر سے گذری۔ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ موصوف نے جزئیات و مسائل کا اتنا استقصاء فرمایا ہے کہ "عربی کی کسی ایک کتاب میں اتنا ذخیرہ بمشکل نظر آئے گا" اور نہایت عمدہ، شگفتہ، سلیس اردو زبان میں اتنا ذخیرہ جمع کرنا اسی کتاب کی خصوصیت ہے۔ مختلف مقامات کے مطالعہ کا اتفاق ہوا، الحمد للہ ہر حیثیت سے کتاب انتہائی قابل قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف محترم کی خدمت کو قبول فرمائے اور امت محمدیہؐ کے عوام کو اس سے عظیم فائدہ پہنچائے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں خلعتِ قبول سے سرفرازی مؤلف اور مؤلف دونوں کو ہو۔ آمین۔"

از فاضل جلیل حضرت مولانا منتخب الحقؒ صاحبؒ

سابق صدر شعبہء اسلامیات کراچی یونیورسٹی

اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں فقہ و فتاویٰ کی چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں ہیں اور علمائے ربانی نے دین کی اہم ترین خدمت کو انجام دینے میں اپنی مساعی جمیلہ کے غیر فانی آثار

چھوڑے ہیں، لیکن ضرورت ایک ایسی سلیس اور جامع کتاب کی باقی تھی جو فقہی ابواب سے متعلق تمام ضروری گوشوں پر حاوی ہو اور اپنی زبان و بیان کے اعتبار سے اتنی سلیس ہو کہ استاد کے بغیر ہر سمجھ دار اردو خواں اس سے مستفید ہو سکے، نیز مسائل کے بیان کرنے میں پوری احتیاط سے کام لیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے شیخ طریقت حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب مدظلہ کو اس کام کے لئے منتخب فرمایا اور حضرت محترم نے غایت استقصاء اور حسن ترتیب کے ساتھ اس کو مرتب فرمایا اور اس میں بعض ایسے ضروری امور آگئے ہیں جو اردو اور عربی کی عام فقہی کتابوں میں موجود نہیں ہیں۔

از حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ العالی

ماہنامہ "بینات" کراچی

شوال المکرم ۱۳۷۸ھ

"علم فقہ وہ پاکیزہ علم ہے جس سے انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی پہچان حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے فقہائے امت ہر دور میں اسے آسان شکل میں مرتب کرکے امت کے سامنے پیش کرنے کی خدمت میں مشغول رہے ہیں۔ عربی اور فارسی کے بعد غالباً اردو سب سے زیادہ خوش قسمت زبان ہے جس کا دامن ان جواہر سے مالامال ہے۔ لیکن ہنوز ایسے فقہی دائرۃ المعارف کی ضرورت باقی تھی جس میں حتی الامکان فقہی ابواب کے اکثر جزئیات کو بالغ نظری اور حسن ترتیب سے جمع کر دیا گیا ہو۔ یہ سعادت ہمارے بزرگ مکرم جناب مولانا سید زوار حسین صاحب کے حصہ میں آئی۔ موصوف نے "عمدۃ الفقہ" کی تالیف کا کام شروع کرکے پیرانہ سالی میں جوانوں کی ہمت کو مات کر دیا۔ اس وقت اس عمدہ تالیف کے دو حصے ہمارے سامنے ہیں: حصہ اول کتاب الایمان اور کتاب الطہارۃ پر مشتمل ہے اور حصہ دوم کتاب الصلوٰۃ کے لئے وقف ہے۔ عام فہم اور سادہ زبان، پسندیدہ اور مناسب ترتیب اور دقیق جزئیات کا استقصاء اس کتاب کے نمایاں خصائص ہیں۔ اگر اسی انداز میں یہ کتاب پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی تو انشاء اللہ اپنے موضوع پر جامع ترین اور مفید ترین کتاب ہوگی۔ واللہ الموفق۔"

ماہنامہ "بینات" کراچی

صفر المظفر ۱۴۰۱ھ

"حج و زیارت کے موضوع پر بہت سی معتبر اور نامعتبر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر عمدۃ الفقہ کی یہ ضخیم جلد اس موضوع پر جامع ترین مجموعہ ہے جس میں حج و مناسک کے تمام جزئیات و مسائل کا حیرت انگیز استیعاب کیا گیا ہے۔ اس کتاب سے علماء کرام اور اصحابِ فتوی بطورِ خاص مستفید ہوں گے۔"

سہ ماہی "العلم" کراچی

جنوری تا مارچ ۱۹۸۰ء

"بے جا نہ ہو گا اگر کہا جائے کہ اتنی جامع کتاب ابھی تک کسی زبان میں نہیں لکھی گئی اس کو "حج کی انسائیکلوپیڈیا" کہنا مناسب رہے گا۔ ویسے تو شاہ صاحب جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کے کسی پہلو کو بھی تشنہ نہیں رہنے دیتے، چنانچہ اس سلسلہ کی دوسری کڑیاں یعنی کتاب الصلوۃ، کتاب الزکوۃ اور کتاب الصوم بھی اسی طرح کافی شرح و بسط کے ساتھ لکھی گئی ہیں، لیکن اس کتاب نے اپنی جامعیت و وسعت کے لحاظ سے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ موصوف نے کسی گوشے کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے یہاں تک کہ حج کے ذیل میں جن اور مقامات کی زیارت کی جاتی ہے ان مقامات کے فضائل اور ان کی تاریخی اہمیت بھی بتادی گئی ہے۔ پھر اپنے طرزِ بیان اور سلجھے ہوئے اندازِ تحریر سے ہر بات کو نہ صرف قابل فہم بنا دیا ہے بلکہ دل کشی کا عنصر بھی پیدا کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ واقعی حج کے ارکان و مناسک ادا کر رہا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے مذہبی لٹریچر میں نہایت گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔"

از مولانا محمد سعید الرحمن علوی

مدیر، ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور

عربی اور فارسی میں فقہ کی کتابوں کا ایک شاندار ذخیرہ موجود ہے جو ہمارے ملی و دینی لٹریچر کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔ اردو میں بھی اچھا خاصا مواد موجود ہے۔ مثلاً امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنوی کی کتاب علم الفقہ، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا بہشتی زیور اور حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ شاہجہان پوری ثم الدہلوی کی تعلیم الاسلام تو وہ کتابیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ مقبولیت بخشی، اس کے علاوہ بھی اس فن میں کتابوں کی کمی نہیں لیکن ہمارے شاہ صاحبؒ کی یہ کتاب عمدۃ الفقہ تو گویا شاہکار ہے۔ افسوس اس کے چار ہی حصے شائع ہو سکے اور پھر شاہ صاحب وہاں پہنچ گئے جہاں ہر کسی کو جانا ہے لیکن قوم کو جو دے گئے وہ بھی عظیم سرمایہ ہے۔ اس کتاب کی چار جلدیں تیار ہوئیں بڑے سائز کی خوبصورت، کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلی جلد ایمان اور طہارت کے مسائل پر ہے تو دوسری نماز کے مسائل پر اور تیسری زکوٰۃ و روزہ جبکہ چوتھی حج کے مسائل پر۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے فقہ کے قدیم ذخیرہ کو سامنے رکھ کر بقول کسے "ہندی کی چندی" نکالی ہے اور ہر باب کی ایک ایک جزئی کو شامل کر لیا ہے سچ پوچھیں تو مجھے اس کتاب نے بے حد متاثر کیا اور اگر کبھی یہ سوال ہوا کہ تمہیں کون سی کتابیں پسند آئیں تو میں عمدۃ الفقہ کا نام ضرور لوں گا...... عمدۃ الفقہ جیسا کہ عرض کیا ایک ضخیم اور مفصل کتاب ہے، کہنا چاہیئے کہ یہ فقہی مسائل کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔

○ زبدۃ الفقہ

ماہنامہ "بینات" کراچی

دسمبر ۱۹۷۳ء

"حضرت مصنف کی ضخیم تالیف "عمدۃ الفقہ" کی تین جلدوں پر ان صفحات میں تبصرہ آچکا ہے۔ زیر نظر کتاب اس کا خلاصہ ہے۔

مسائل اس " زبدہ " میں بھی لتنے جمع کر دیئے گئے کہ اس " خلاصہ " پر بھی طوالت کی تہمت دھری جائے تو بعید نہیں ۔ زبان شستہ اور عبارت بڑی سلیس ہے ۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور عام پڑھے لکھے حضرات بھی بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں ۔ "

سہ ماہی "العلم" کراچی

اپریل تا جون ۱۹۷۳ء

" عمدۃ الفقہ حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب کی تالیف ہے اور اس کا خلاصہ بھی انھوں نے خود ہی تحریر کیا ہے ۔ موصوف کو ہر قسم کے مسائل کو سلجھا کر اور نہایت عام فہم زبان میں بیان کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے ۔ عمدۃ الفقہ بھی ان خصوصیات کا مظہر ہے ۔ اس میں ایمان طہارت اور صلوۃ پر بہت تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور کوئی گوشہ ایسا نہیں بچا جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو ۔ پھر ان کو ایسے آسان اور عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر شخص ہر بات کو بغیر کسی کی مدد کے سمجھ سکتا ہے ۔ لیکن اس کتاب کی ضخامت اتنی زیادہ ہے کہ عام آدمی اس کے مطالعہ کے لئے مشکل سے وقت نکال سکتا ہے ۔ صرف کتاب الصلوۃ ہی بڑے سائز کے کئی سو (۵۶۰) صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں اتنی تفصیلات دی گئی ہیں کہ کسی ایک کتاب میں کہیں اور دکھائی نہیں دیتیں ۔ جو شخص تمام تفصیلات جاننے کا خواہش مند ہو اس کے لئے اس سے اچھی کتاب اردو زبان میں دوسری نہیں ملے گی ۔ لیکن جو لوگ تھوڑے الفاظ میں تمام جزئیات و تفصیلات جاننا چاہتے ہیں وہ اتنی ضخیم کتاب کو پڑھنے میں دشواری محسوس کریں گے ۔ حضرت مولانا زوار حسین شاہ صاحبؒ نے ایسے ہی لوگوں کی دقت کو محسوس کرتے ہوئے یہ خلاصہ زبدۃ الفقہ کے نام سے مرتب کیا ہے ۔ اس میں جس ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے ۔ چنانچہ ایمان اور طہارت کے تمام جزئی مسائل کو صرف سوا سو صفحات میں اس انداز سے پیش کر دیا کہ اس کو پڑھنے کے بعد قاری کسی قسم کی کمی محسوس نہیں کرتا اور اس کی تشنگی باقی نہیں رہتی ۔

از محترم مولانا محمد سعید الرحمن صاحب علوی مدظلہ العالی

مدیر ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور

جنوری ۱۹۷۸ء

"حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب مدظلہ العالی ظاہری و باطنی علوم کے جامع اور صاحبِ قلم بزرگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے مختلف محاذوں پر بے پناہ کام لیا ہے، جس میں آپ کے تصنیفی سلسلہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی بسوط و ضخیم سوانح حیات کے علاوہ آپ کا مثالی کام وہ ہے جو آپ "علم فقہ" کے سلسلہ میں کر رہے ہیں۔ آپ نے "عمدۃ الفقہ" کے نام سے اردو زبان میں ایک سلسلہ شروع فرمایا جس کی دو جلدیں چھپ کر اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے اردو زبان کو اس لئے منتخب فرمایا کہ عربی وغیرہ میں فقہ و فتاویٰ کی بے شمار کتابیں موجود ہیں جن میں لاتعداد فقہی جزئیات کو حضرات مصنفین نے مرتب صورت میں پیش کیا اور یہ سرمایۂ علمی ملتِ اسلامیہ کی رہنمائی کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ لیکن چونکہ یہ سب کچھ ایسا ہے جس سے اہل علم ہی مستفید ہو سکتے ہیں اس لئے آپ نے اردو زبان کا انتخاب فرمایا، لیکن اس میں یہ اہتمام کیا کہ فقہ و فتاویٰ کی کتابوں سے ہر ہر مسئلہ کی جو جزئی آپ کو ملی آپ نے اسے نقل فرما دیا۔ اس طرح گویا آپ کی یہ کتاب فقہی مسائل کا عظیم الشان مجموعہ بن گئی۔ تاہم بعد میں آپ کو خیال آیا کہ آج کی مصروف زندگی میں جبکہ عام علمی استعداد بہت کم ہے اس مجموعہ کا خلاصہ تیار ہونا چاہئے، جس سے ہر چھوٹا بڑا فائدہ اٹھا سکے۔

اسی نقطۂ نظر سے "عمدۃ الفقہ" کا خلاصہ "زبدۃ الفقہ" کے نام سے تیار کیا۔

موصوف نے ان حصوں میں کوئی ایسی بات نہیں چھوڑی جس کا جاننا ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ ہماری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ اس کتاب کو مدارس و اسکولز کے نصاب میں شامل کرنا چاہئے تاکہ نئی نسل جہاں سائنس و جغرافیہ اور تاریخ و اکنامکس پڑھے وہاں اسے اپنے دین اور اس کے متعلقات کا پتہ چل سکے اور اس طرح "طلبِ علم" کا فرض پورا ہو سکے۔ امید ہے کہ عام قارئین کتاب سے بھرپور استفادہ فرمائیں گے۔"

○ عمدۃ السلوک

"عمدۃ السلوک" تصوف پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معرکتہ الارا تالیف ہے اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ جس میں عام امور اور مسائل تصوف کا بیان ہے، عوام کے لئے ہے اور دوسرا حصہ جس میں تصوف کے دقیق مسائل، لطائف عشرہ، تنزلاتِ ستہ اور اسباق سلسلہء نقشبندیہ وغیرہ کا تفصیلی بیان ہے، خواص کے لئے ہے۔

از محترم جناب ثناء الحق صاحب صدیقی مدظلہ العالی

ماہنامہ "انجمن" کراچی

مارچ۔ اپریل ۱۹۸۱ء

"تصوف و سلوک پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر ہمیشہ اس موضوع کو کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا کہ یا تو وہ شریعت سے ماورا کوئی چیز معلوم ہونے لگی یا ترکِ دنیا کے مترادف کوئی شے دکھائی دینے لگی۔ خصوصاً توحید وجودی یا وحدت الوجود کے نظریہ کو مصنفین نے ایسا پیچیدہ بنا دیا کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اس کے سمجھنے سے قاصر رہے۔ بعض حضرات نے اس کے بیان میں ایسا غلو برتا کہ اس کی سرحدیں حلول اور زندقہ سے ملا دیں۔

شاہ زوار حسین صاحبؒ نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا تو سب سے پہلے سلوک و تصوف کی پرپیچ وادی میں قدم رکھا۔ چونکہ وہ خود راہِ طریقت میں گامزن تھے اس لئے انھوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا وہ واقفِ راز کی حیثیت سے لکھا۔ انھوں نے سلوک و تصوف کے مختلف مسائل پر سیر حاصل بحث کی اور شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، فنا، بقا، عالم خلق، عالم امر، عالم مثال، توحید وجودی اور توحید شہودی جیسے پیچیدہ موضوعات کو ایسے عام فہم انداز میں بیان کیا ہے کہ معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی ان کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ انھوں نے راہِ سلوک طے کرنے کے لئے شرعی امور کی ادائیگی پر زور دیا ہے اور عبادات میں اخلاص پیدا کرنے ہی کو سلوک و تصوف سے تعبیر کیا ہے۔

غرض شاہ صاحبؒ نے ان دقیق مسائل کو ایسے سلجھے ہوئے اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ جو لوگ تصوف کا مذاق نہیں رکھتے وہ بھی اس کتاب کے مطالعہ کے دوران اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے بلکہ ایک گونہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔"

○ "حضرت مجدد الف ثانی"

از مولانا محبوب حسن واسطی صاحب

حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ کے مزاج میں بڑا اعتدال تھا۔ آپ کی سوانح نگاری کی ایک بڑی خصوصیت ایسی حقیقت پسندی اور اعتدال ہے جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط، بلکہ تاریخ کی روشنی میں واقعات کا صحیح تجزیہ آپ کا مقصود اولین ہے۔ آپ کی سوانح نگاری کی دوسری بڑی خصوصیت آپ کی انتہائی کوشش و کاوش ہے کہ اس مقدس ہستی کی سیرت کا کوئی بھی پہلو جس پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے تشنہ تکمیل نہ رہ جائے اور سیرت و تعلیمات کا ہر پہلو سے مطالعہ کیا جائے آپ کی سوانح نگاری کی تیسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر رطب و یابس کو جگہ نہیں دی گئی ہے۔ جو بیان ہے وہ مستند اور تاریخ کے حوالے سے، خلفا کے چشم دید واقعات سے معاصر، شعراء، ادباء اور دانشوروں کی آراء سے خود اس ہستی کی تصانیت، تالیفات اور تحریروں کی مدد سے ان خطوط کی روشنی میں جو معاصرین نے اس ہستی کو لکھے ان جوابات کی روشنی میں جو ان خطوط بھیجنے والوں کو لکھوائے گئے، ان تاریخوں کی مدد سے جو اس ہستی کے وصال پر لکھی گئی یا اس دور کے اہم واقعات کے متعلق کہی گئیں۔ آپ کی سوانح نگاری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ جس ہستی کی سوانح پر قلم اٹھا رہے ہیں نہ صرف اس کے ذاتی و خاندانی حالات انتہائی تفصیل سے بیان فرماتے ہیں بلکہ اس کی تعلیمات اور ان تعلیمات کے تاریخی نتائج سے بھی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ شرح و بسط سے بحث فرماتے ہیں۔ تعلیمات، مکتوبات، ارشادات، انسان کے ذاتی جوہر اور اخلاص کا پرتو ہوتی ہیں۔ جتنا کسی کا اخلاص زیادہ اور کردار مثالی ہوتا ہے اتنا ہی اس کی تعلیمات پر اثر اور کردار ساز ہوتی ہیں۔ کسی بزرگ کے خلفاء کے حالات کا مطالعہ در حقیقت اس بزرگ کے اخلاص

اور کردار سازی کا مطالعہ ہے ۔ خلفاء کی عظمت سے خود اس بزرگ کی عظمت کا کسی درجہ میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔

از حضرت مولانا حکیم حافظ پیر محمد ہاشم جان صاحب مجددیؒ

ٹنڈو سائیں داد ، ضلع حیدر آباد

" حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب دام مجدہ کو حق سبحانہ ، و تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی کہ انھوں نے بڑی محنت و جستجو سے حضرت مجددؒ کے حالات جمع کئے اور ان کی زندگی کے ہر ایک شعبہ پر تفصیلی معلومات بہم پہنچائے اور پھر اس کو منظر عام پر لائے ۔ مسلمانوں پر یہ ان کا احسان عظیم ہے کہ جس کی منت پذیری کی اب یہی صورت ہو سکتی ہے کہ ہم اس مفید کتاب کی اشاعت میں پورا حصہ لیں ۔ باقی اس محنت و جان کاہی کا اجر تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی ان کو دے سکتا ہے ۔ میں نے جستہ جستہ بعض مقامات سے اس کتاب کو پڑھا ہے اور مجھے بہت پسند ہے ۔ فارسی زبان میں اگرچہ امام ربانی رحمتہ اللہ کے حالات اور ان کے فضائل و کمالات کی تفصیل پر متعدد قیمتی کتابیں خود حضرت ہی کے خلفا اور اہل سلسلہ کے قلم سے موجود ہیں لیکن اردو زبان کا دامن ابھی تک اس سلسلہ میں ایسی جامع تالیف کے وجود سے تقریباً خالی تھا کہ جس میں آپ کے مفصل حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ آپ کی تعلیمات اور کارناموں پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی جائے اور منصبِ تجدید اور مقام مجددیت پر بھی سیر حاصل بحث ہو ۔ الحمد للہ کہ اس کتاب کی تالیف سے یہ کمی بڑی حد تک پوری ہو گئی ۔ (پھر چند سطور کے بعد تحریر فرماتے ہیں) حضرت شاہ صاحب ممدوح کے اوقات میں جو حق تعالیٰ نے برکت عطا فرمائی ہے اس کا نمایاں اثر یہ ہے کہ ایک مدت قلیل میں جناب ممدوح کے قلم سے متعدد ضخیم کتابیں تالیف ہو کر شائع ہو چکی ہیں ۔ انھی تالیفات میں پیش نظر کتاب " حضرت مجدد الف ثانیؒ " بھی ہے ۔ حق تعالیٰ ان کو اس کارِ خیر کی تکمیل پر اپنے شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائے اور اس تالیف کو قبول عام اور شہرت دوام نصیب کرے ۔

از محترم جسٹس مولانا محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی

ماہنامہ "البلاغ" کراچی

ذیقعدہ ۱۳۹۳ھ

" امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات والا صفات ان مقدس اور نورانی ہستیوں میں سے ہے جن کے احسانات سے یہ سرزمین تا قیامت سبکدوش نہیں ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس علاقے میں ان سے اپنے دین کی تجدید کا جو انقلابی کام لیا وہ تاریخ میں خال خال ہی کسی کو میسر آتا ہے۔ فارسی زبان میں حضرت مجدد صاحبؒ کی متعدد سوانح حیات موجود ہیں لیکن اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی اتنی جامع اور مفصل کتاب نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب مدظلہ کو جنھوں نے بڑی محنت، کاوش اور عرق ریزی سے اس خلاء کو پر کیا ہے۔ یہ کتاب چودہ بڑے عنوانات پر، جنہیں دراصل ابواب کہنا چاہیے، مشتمل ہے۔ پہلا عنوان ہے " حضرت مجددؒ کا سلسلہ نسب" اور اس میں حضرت مجدد صاحبؒ کا صرف نسب نامہ ہی بیان نہیں کیا گیا بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک تمام آباؤ اجداد کے مختصر حالات بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح دوسرے باب میں حضرت موصوف کا سلسلہ طریقت بیان کیا گیا ہے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ تک اس سلسلہ کے تمام مشائخ کے حالات فرداً فرداً بیان کئے گئے ہیں۔ تیسرا باب حضرت مجدد صاحبؒ کے ذاتی سوانح و حالات پر مشتمل ہے اور تقریباً سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ چوتھے باب میں آپ کے روز مرہ کے معمولات کا بیان ہے۔ پانچواں باب آپ کے کشف و کرامات سے متعلق ہے۔ چھٹے باب میں آپ کے خاص خاص ملفوظات بیان کئے گئے ہیں۔ ساتواں، آٹھواں، نواں اور دسواں باب اس کتاب کی خاص چیز ہے اور اس میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہ کون سے کارنامے انجام دیئے جن کی بنا پر آپ کو " مجدد الف ثانیؒ " کا مقبول عام لقب دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلے اکبر کے دین الٰہی کی تفصیلات بیان کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ اس دور میں کس طرح سرکاری ڈنڈے کے زور سے دین اسلام کو مسخ کیا جا رہا تھا؟ کیسے کیسے فاسد اعتقادات اور کتنی خطرناک رسوم کو رواج دیا جا رہا تھا؟ پھر تفصیل کے ساتھ اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت مجدد صاحبؒ نے کس محنت اور حکمت کے ساتھ اس

طاغوتی فتنے کا مقابلہ فرمایا۔ یہ پوری تاریخ انتہائی سبق آموز، ولولہ انگیز اور انتہائی دلچسپ ہے اور خاص طور سے علم دین کے ہر طالبِ علم کو اس کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہئے۔ گیارہواں باب حضرت مجددؒ کی خاص خاص تعلیمات پر مشتمل ہے۔ بارہویں باب میں آپ کی تصانیف کا تذکرہ ہے۔ تیرہویں باب میں آپ کے اولاد امجاد کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور آخری باب میں آپ کے خلفا اور مکتوب الیہم کی نہ صرف فہرست بلکہ ان کی مختصر سوانح بھی بیان کی گئی ہے۔ سوانح میں کوئی واقعہ بلا حوالہ بیان نہیں کیا گیا اور ماخذ زیادہ تر مستند کتابیں ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو میں جامع ترین کتاب ہے اور اس نے اردو کے اسلامی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب ہر لائبریری، ہر دینی مدرسے اور ہر علمی ذوق رکھنے والے مسلمان تک پہنچنی چاہیے۔"

از محترم ثناء الحق صاحب صدیقی مدظلہ

سہ ماہی "العلم" کراچی

اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۲ء

" ایسی عظیم ہستی کے حالات زندگی اور آپ کے کارناموں سے لوگوں کو پوری طرح واقف کرنے کے لئے ایک اچھی کتاب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ خصوصاً دورِ حاضر کے مذاق و رجحان کے مطابق ان حالات و مباحث کو پیش کرنا نہایت ضروری ہو گیا تھا۔ اس موضوع پر فارسی اور اردو میں کچھ کتابیں موجود تھیں، لیکن ان سے موجودہ دور کے قاری کی تشنگی دور نہیں ہو سکتی تھی۔ اس بات کا احساس کرتے ہوئے حضرت شاہ زوار حسین صاحب نے جو اس سلسلہ کے ایک شیخ طریقت ہیں اس اہم ذمہ داری کو ادا کیا اور اس خوبی سے یہ کام انجام دیا کہ موضوع کا حق ادا کر دیا۔ زیرِ تبصرہ تالیف آپ ہی کے قلم اعجاز کا ایک اعلیٰ نقش ہے۔ ایک طرف حضرت شاہ صاحبؒ کو اس سلسلہ سے منسلک ہونے کی وجہ سے شیخ مجدد کی تعلیمات سے گہری واقفیت ہے دوسری جانب قدرت نے آپ کو تصنیف و تالیف کا ایک اعلیٰ اور ستھرا اور نکھرا ہوا مذاق عطا کیا ہے۔ دقیق مضامین کو نہایت سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرنے کا آپ میں جو سلیقہ

ہے وہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے ۔ چنانچہ زیرِ تبصرہ تالیف میں بھی آپ نے اپنی اس خوبی کو پوری طرح قائم رکھا ہے اور اسی نے اس کتاب کو خاص چیز بنا دیا ہے ۔ مواد کی فراہمی میں بھی آپ نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور موضوع کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جس پر آپ نے روشنی نہ ڈالی ہو ..... آپ نے حضرت مجدد صاحب کے حالاتِ زندگی بھی نہایت حزم و احتیاط سے جمع کئے ہیں اور تعلیمات و نظریات کو بھی نہایت عام فہم انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔ حضرت امام ربانی کے مکتوبات جو حقائق و معارف کا ایک بڑا خزانہ ہیں اور جن کو پڑھے بغیر مجدد صاحبؒ کے کمالات کا پورا اندازہ کرنا مشکل ہے ۔ حضرت شاہ زوار حسین صاحب نے اپنی اس تالیف میں ان مکتوبات کا گویا عطر نکال کر رکھ دیا ہے ۔ یہ تالیف دیکھنے کے بعد قاری مکتوبات کے مطالعہ سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے ..... (چند سطور کے بعد) کتاب کے سب عنوانات علیحدہ علیحدہ تبصرہ اور رائے کے محتاج ہیں لیکن اس میں طوالت کا اندیشہ ہے لہٰذا اس سے قطع نظر کر کے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حضرت مجدد صاحبؒ کے حالات و افکار پر اس سے زیادہ جامع کتاب ابھی تک کسی زبان میں نہیں لکھی گئی ۔ اس وقت اس کو حرفِ آخر کی حیثیت حاصل ہے اور یقین ہے کہ اس کی یہ انفرادیت ایک طویل عرصہ تک باقی رہے گی ۔ فی الحقیقت اس کتاب سے اردو کے دینی ادب میں ایک گراں قدر تالیف کا اضافہ ہوا ہے ۔"

از ڈاکٹر خان رشید مرحوم

ماہنامہ "قومی زبان" کراچی

فروری ۱۹۷۶ء

" شاہ صاحب موصوف ایک جید عالم دین اور سلسلہ نقشبندیہ کے ایک ذی وقار بزرگ ہیں ۔ ان کی عالمانہ تالیفات " عمدۃ الفقہ " اور " عمدۃ السلوک " بھاری خراج تحسین وصول کر چکی ہے اور انھیں علمی و دینی حلقوں اور درس گاہوں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ یہ کتاب پاک و ہند کی عظیم شخصیت حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے سوانح سیرت اور ان کے کارناموں کا ایک بسوط تحقیقی جائزہ ہے جس سے ان کی عظمت اور ان کے انقلابی اور مجددانہ کارناموں کے

سیاسی اور تاریخی پس منظر، عوامل و محرکات اور دور رس نتائج کے بعض ایسے اہم گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے جو ابھی تک عام نگاہوں میں نہ آسکے تھے۔ اس کتاب میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات اور دیگر تصانیف کے علاوہ ان تمام کتابوں اور مقالات پر غائر نگاہ ڈالی گئی ہے جو ان پر اب تک لکھے گئے تھے۔ اس طرح ان کی سیرت، زندگی اور تعلیمات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جس کا احاطہ نہ کیا گیا ہو۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی مؤلف کا حسن انتخاب ان کی بالغ نظری اور ان کا بے لاگ محاکمہ ہے جس کے سبب اگرچہ یہ ایک تالیف ہے لیکن حقیقی معنوں میں یہ ایک ایسی تصنیف بن گئی ہے کہ اسے اس دور کے گراں مایہ علمی کارناموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ موصوف نے اس پر بڑی محنت کی ہے اور ایک ایک فقرہ لکھنے سے پہلے اس کی جامعیت اور صداقت پر اچھی طرح غور کیا ہے۔ (چند سطروں کے بعد آخر میں)، بہرکیف بحیثیتِ مجموعی یہ کتاب بڑی قابل قدر ہے اور اسی لئے اسے پوری دنیا میں قدر دانی کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔

○ انوار معصومیہ

از حضرت مولانا محمد سعید الرحمن صاحب علوی مدظلہ العالی

مدیر ہفت روزہ "خدام الدین"

دسمبر ۱۹۸۰ء"

"یہ کتاب حضرت الامام مجدد الفِ ثانی قدس سرہ کے خلف الرشید اور جانشین خواجہ محمد معصوم صاحب قدس سرہ کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ ہمارے خیال میں خواجہ صاحب کا اس قسم کا مفصل تذکرہ اردو زبان میں پہلی بار سامنے آیا ہے، بلکہ میرے ناقص علم کی حد تک کسی دوسری زبان میں بھی ایسی دلاویز تصنیف سامنے نہیں آئی۔ شاہ صاحبؒ نے اس سے قبل حضرت مجدد صاحب علیہ الرحمۃ کی سوانح حیات سپردِ قلم فرمائی تھی اور وہ اردو لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ سمجھی گئی تھی اور وقت کے عظیم لوگوں نے اسے سراہا تھا، اس کے بعد (شاہ صاحب) مرحوم نے حضرت خواجہ محمد معصوم صاحبؒ کے مکتوبات کا اردو ترجمہ کر کے ایک لازوال کارنامہ سر انجام دیا جسے علم و تحقیق کی دنیا میں بے حد سراہا گیا۔"

از محترم جناب ثناء الحق صاحب صدیقی مدظلہ العالی

سہ ماہی رسالہ "العلم"

اپریل تا جون ۱۹۸۱ء

"حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف "حضرت مجدد الف ثانیؒ کافی خراج تحسین وصول کر چکی ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فرزند رشید اور خلیفہ اول خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و کوائف نہایت جامعیت سے بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت مجدد صاحبؒ کے حالات سے متعلق تو پہلے بھی چند کتابیں موجود تھیں، گو ان میں وہ تفصیل اور جامعیت نہیں تھی جو کتاب "حضرت مجدد الف ثانیؒ" میں ہے لیکن خواجہ محمد معصوم کے حالات و کوائف سے ابھی تک کسی نے اعتناء نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ اسی سلسلہ کے شیخ طریقت تھے اس لئے ان سے بہتر اس موضوع کو کون بیان کر سکتا تھا۔ انھوں نے اس مضمون پر قلم اٹھایا اور قطعہ، قرطاس پر اس قدر مواد جمع کر دیا جس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جہاں پہلے سے کچھ نہ ہو وہاں اتنا کچھ مواد فراہم کر دینا ایک اعجاز ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک ایک ریزہ اکٹھا کر کے یہ انبار لگایا ہے اور پھر ان ریزوں کو اس خوبصورتی سے ترتیب دیا ہے کہ وہ حسن و دلکشی کا ایک منبع بن گیا ہے۔

ماہنامہ "بینات" کراچی

ربیع الاول ۱۴۰۱ھ

"حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب نقشبندی مجددی قدس سرہ کو حق تعالیٰ نے علوم مجددیہ کی نشر و اشاعت کی خاص توفیق عطا فرمائی تھی۔ موصوف نے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے متعدد رسائل کو اردو میں منتقل کیا۔ حضرت مجددؒ کے سوانح پر ایک ضخیم کتاب مرتب فرمائی، حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم قدس سرہ کے مکتوبات کا اردو میں ترجمہ کیا اور حضرت خواجہؒ کے حالات پر زیر نظر کتاب "انوار معصومیہ" مرتب فرمائی۔ کتاب کے اصل ماخذ

" زبدة المقامات " ، " روضتہ القیومیہ " اور " مکتوباتِ معصومیہ " ہیں ، ان کے علاوہ ساٹھ کے قریب کتابوں سے مدد لی گئی ہے ۔

از حافظ رشید احمد ارشد صاحب مرحوم

سابق صدر شعبہ عربی، کراچی یونیورسٹی

آپ کی علمی ، روحانی اور فقہی قابلیت کا ثبوت آپ کی تصانیف ہیں ۔ چنانچہ عبادت و ریاضت اور رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ آپ کا سلسلہ تصنیف و تالیف بھی آخری وقت تک جاری رہا اور اس مختصر حیاتِ مستعار میں آپ متعدد بلند پایہ تصانیف اپنی یادگار میں چھوڑ گئے ہیں عمدة السلوک ، عمدة الفقہ ، زبدة الفقہ اور حیاتِ حضرت مجدد الفِ ثانیؒ آپ کے مایہ ناز شاہکار ہیں آپ سلوک و تصوف کے دقیق مسائل کو بھی اس قدر آسان زبان اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان فرماتے تھے کہ ایک عام آدمی اور معمولی لکھا پڑھا انسان آسانی سے انہیں سمجھ جاتا تھا ۔ عمدة الفقہ کئی جلدوں میں ہے اس میں تمام متعلقہ مسائل کو جامعیت کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے کئی دفعہ مجھے کسی فقہی مسئلہ کی ضرورت ہوئی اور میں نے کئی مشہور کتب میں اس کو تلاش کیا تو وہاں مجھے وہ مسئلہ نہیں مل سکا مگر جب آپ کی کتاب عمدة الفقہ میں اسے تلاش کیا تو فوراً مل گیا ، یہ میرا ذاتی تجربہ ہے ۔ حیات مجددؒ بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حالات اور تعلیمات پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے ۔ اس کے علاوہ آپ نے حضرت مجدد صاحبؒ کی دیگر کتب مع ترجمہ شائع کرائی ہیں اور مشائخ نقشبندیہ مجددیہ کے حالات و تعلیمات پر نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ کتابیں شائع فرمائی تھیں ۔ آپ نے مکتوباتِ معصومیہ کے تینوں دفتروں کا اردو میں ترجمہ شائع فرمایا اور اب آپ کی وفات کے بعد آپ کی آخری تصنیف انوارِ معصومیہ شائع ہوئی ہے ۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
کی جملہ تصانیف و تالیفات

نمبر شمار	نام کتاب	سنہ تالیف	صفحات
۱	عمدۃ السلوک اول و دوم	۱۹۴۴ء	۳۶۸
۲	گلدستہ مناجات	۱۹۴۵ء	۳۲
۳	حیاتِ سعیدیہ	۱۹۵۵ء	۲۵۶
۴	عمدۃ الفقہ جلد اول	۱۹۶۴ء	۲۷۲
۵	عمدۃ الفقہ جلد دوم	۱۹۶۶ء	۵۶
۶	مبداء و معاد (ترجمہ)	۱۹۶۸ء	۲۲۴
۷	معارف لدنیہ (ترجمہ)	۱۹۶۸ء	۱۹۲
۸	عمدۃ الفقہ جلد سوم	۱۹۶۹ء	۴۳۲
۹	حضرت مجدد الفِ ثانیؒ	۱۹۷۲ء	۸۳۲
۱۰	زبدۃ الفقہ حصہ اول	۱۹۷۳ء	۱۲۸
۱۱	مقاماتِ فضلیہ	۱۹۷۳ء	۱۹۲
۱۲	زبدۃ الفقہ حصہ دوم	۱۹۷۴ء	۲۵۶
۱۳	زبدۃ الفقہ حصہ سوم	۱۹۷۸ء	۱۲۸
۱۴	مکتوباتِ معصومیہ دفتر اول (ترجمہ)	۱۹۷۸ء	۴۴۸
۱۵	عمدۃ الفقہ جلد چہارم	۱۹۷۹ء	۷۳۶
۱۶	مکتوباتِ معصومیہ دفتر دوم	۱۹۷۹ء	۲۸۸
۱۷	مکتوباتِ معصومیہ دفتر سوم	۱۹۸۰ء	۳۳۶
۱۸	انوارِ معصومیہ	۱۹۸۰ء	۳۸۴
۱۹	ریڈیو تقاریر	۱۹۸۴ء	۴۳۲
۲۰	عمدۃ الفقہ بزبان عربی کتاب الطہارۃ، زکوٰۃ، صوم، حج	تقریباً	۵۰۰
۲۱	مکتوباتِ حضرت مجدد الف ثانیؒ (ابتدائی ۱۰۰ مکتوبات کا ترجمہ)	تقریباً	۲۰۰

باب چہارم:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
کی فقہی بصیرت

اتباع شریعت کے ذوق نے حضرت شاہ صاحبؒ کو علم فقہ کی جانب مائل کیا۔ کیونکہ مسائل علم فقہ ہی سے معلوم ہوتے ہیں اسی لئے آپ نے "عمدۃ الفقہ" تصنیف فرمائی جس میں مسائل کو بڑی تفصیل اور انتہائی احتیاط کے ساتھ تحریر کیا۔ عمدۃ الفقہ کی تصنیف کی وجہ سے آپ کو فقہ کے جزئی مسائل اتنے مستحضر ہیں کہ عام طور سے علماء اور مفتیان کرام کو اتنے مسائل مستحضر نہیں ہوتے۔ اور اس تصنیف کی وجہ سے حضرت شاہ صاحبؒ کو فقہ میں اتنی محققانہ بصیرت پیدا ہو گئی ہے کہ کسی مسئلہ کے بارے میں تحقیق کے بعد جو رائے قائم کرتے ہیں وہ مستقل رائے ہوتی ہے اور بلا دلیل کسی عالم یا مفتی کے اس کے خلاف کہنے سے اپنی رائے نہیں بدلتے اور دوسروں کے دلائل سامنے آئیں تب بھی اس وقت تک اپنی رائے پر قائم رہتے ہیں جب تک کہ وہ مخالف دلائل سے مطمئن نہ ہو جائیں۔ (ڈاکٹر محمد مظہر بقا صاحب)

ہوائی جہاز کے حاجیوں کا احرام:

جب یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ جو شخص بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان سے حج کے لئے جائے تو اسے جدہ پہنچ کر احرام باندھنا چاہیے یا احرام باندھ کر ہوائی جہاز میں سوار ہونا چاہیے، تو اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے یہ تھی کہ احرام یہیں سے باندھنا واجب ہے کیونکہ جدہ پہنچنے سے پہلے ہوائی جہاز ایک میقات (قرن المنازل) سے گذرتا ہے اور احرام کے بغیر تجاوز جائز نہیں۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی رائے یہ تھی کہ جدہ پہنچ کر احرام باندھا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں دونوں حضرات کے مضامین ماہنامہ "بینات" کراچی میں شائع ہوئے۔

پاک و ہند کے حجاج کے لئے میقات:

اگر محاذات کی صحیح تعریف و تعین ہو جائے تو پاک و ہند اور دیگر بلادِ شرقیہ سے آنے والے حجاج کرام کے لئے میقات کا صحیح فیصلہ ہو سکتا ہے کہ آیا ان حجاج کو یلملم کے محاذ سے سمندر ہی میں جہاز پر احرام باندھنا لازمی ہے یا جدہ بلکہ اس سے آگے حدہ و بحرہ تک بغیر احرام باندھے جاسکتے ہیں اور وہاں سے ان پر احرام کا وجوب لازم آئے گا؟ حضرت مولانا شیر محمد صاحب مہاجر مدنی مرحوم و مغفور کی تحقیق کے مطابق جو خطوط مواقیت کو ملاتے ہیں وہی خطوط محاذاتِ مواقیت ہیں جو ایک مخمس غیر منتظم کی شکل میں واقع ہیں۔ جو حاجی عین میقات سے نہیں گذرتے بلکہ دو میقاتوں کے درمیان کی کسی جگہ سے حل میں داخل ہوتے ہیں ان کو ان خطوط میں سے کسی خط کی حد تک بغیر احرام باندھے جانا جائز ہے اور اس خط سے آگے مکہ مکرمہ کی طرف جانے کے لئے وہاں سے احرام باندھنا واجب ہے۔ یہاں سے وہ بغیر احرام باندھے آگے نہ بڑھے ورنہ جنایت کا مرتکب ہو گا اور اس پر جزا لازم ہو گی، اس خط سے پہلے تک بغیر احرام آنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن ان کی یہ تحقیق اس عاجز کے نزدیک درست نہیں ہے۔

مواقیت کو ملانے والے خطوط محاذات کے خطوط ہرگز نہیں ہو سکتے بلکہ محاذات سے مراد یہ ہے کہ جس جگہ احرام باندھا جارہا ہے وہاں سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ میقات اور مکہ معظمہ کے درمیانی فاصلہ کے برابر ہو۔ چنانچہ در مختار میں ہے: "ولو لم یمر بها تحری واحرم اذا حاذی احدها وابعدها افضل" علامہ شامی رحمۃ اللہ نے ابعدھا کی شرح میں لکھا ہے ای عن مکۃ یعنی مکہ مکرمہ سے میقات کے فاصلہ کے برابر فاصلہ ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لئے اقرب میقات کا بھی اعتبار کیا جائے گا، لیکن ابعد کی محاذات ہونا افضل ہے۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ محاذات سے مراد یہ ہے کہ اس جگہ سے مکہ معظمہ کا فاصلہ میقات اور مکہ معظمہ کے درمیانی فاصلہ کے برابر ہو اور چونکہ اس کا کم سے کم فاصلہ ان دو میقاتوں میں سے جن کے درمیان سے وہ گذر رہا ہے اقرب من مکہ سے لگایا جائے گا اور وہ فاصلہ کسی بھی حالت میں مکہ سے مرحلتین کی مسافت سے کم نہیں ہونا چاہیے، اس لئے کہ اقرب المواقیت کا فاصلہ بھی مکہ مکرمہ سے مرحلتین ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محاذات کا علم کسی ذریعہ یا ظن غالب سے نہ ہو سکنے کی صورت میں بھی فقہائے کرام نے احرام کا باندھنا مکہ سے مرحلتین کے

فاصلہ پر لازمی قرار دیا ہے۔
اب جاننا چاہیے کہ یہ مسئلہ ریاضی اور جغرافیہ سے متعلق ہو گیا، یعنی اب ریاضی کے طریقہ پر ان مواقیت کی محاذات کو مقرر کرنا ہو گا اور عرب کے نقشہ میں اس کو متعین کرنا ہو گا کہ وہ محاذات کے خطوط کہاں کہاں سے گذرتے ہیں۔ یہ بات تو یقیناً ثابت ہو گئی کہ مواقیت کے نقاط کو ملانے والے خطوط، خطوط محاذات نہیں ہے اور جس نے ان کو خطوط محاذات قرار دیا ہے کھلی غلطی کی ہے، اس لئے کہ یلیلم اور جحفہ کو ملانے والا خط بالکل حدود حل میں سے گذرتا ہے اور کئی جگہ پر مکہ، مکرمہ سے مرحلتین سے بہت ہی کم فاصلہ پر گذرتا ہے جو کسی اصول سے درست نہیں ہے۔ جزیرہ نما عرب کا صحیح و مستند نقشہ دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ یلملم سے مکہ، مکرمہ تک جو فاصلہ ہے اگر اس کے برابر فاصلہ کی قوس نقطہ محل وقوع مکہ سے لگائی جائے تو وہ قوسی خط اس محاذات کو ظاہر کرے گا جو مکہ، مکرمہ سے یلیلم کی محاذات ہے اور وہ قوسی خط بحر قلزم کے اندر سے اتنی دور سے ہو کر گذرتا ہے کہ جو بحری جہاز پاکستان و ہندوستان وغیرہ سے آتے ہیں وہ اس خط قوسی کے اندر مکہ، معظمہ کی طرف والے حصہ میں سے گذرتے ہیں۔ یعنی جدہ پہنچنے سے پہلے ایک معتدبہ فاصلہ ان کو حدود حل میں سے گزرنا پڑتا ہے اور بلکہ خود جدہ بھی اس قوسی خط محاذات کے اندر کی طرف واقع ہے اور اس حساب سے جدہ بھی حدود حل میں واقع ہے۔ اگرچہ جدہ بھی مکہ، مکرمہ سے مرحلتین پر واقع ہے لیکن اس کا فاصلہ مکہ، مکرمہ سے یلملم کی بہ نسبت کچھ کم ہے، جیسا کہ مطبوعہ نقشہ، عرب سے مفہوم ہوتا ہے۔ اس کی مزید تحقیق کسی ایسی کتاب سے کی جا سکتی ہے جس میں ان سب مقامات کا فاصلہ مکہ، مکرمہ سے میلوں کے حساب سے درج کیا گیا ہو۔ عام کتابوں میں مرحلتین لکھتے ہیں جس سے معمولی کمی بیشی کا پتہ نہیں چلتا، البتہ نقشہ، مطبوعہ سے نظری طور پر فرق واضح ہے اس کے علاوہ کتب فقہ کا ایک مسئلہ اس کی واضح دلیل ہے کہ جدہ بھی حدود حل میں داخل ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ جیسا کہ در مختار میں بھی مذکور ہے "اما لو قصد موضعا من الحل کخلیص وجدة حل له مجاوزته بلا احرام فاذا حل به التحق باهله فله دخول مکة بلا احرام، وقال الشامی ای مالم یرد نسکا" پھر در مختار میں کہا ہے کہ "وهو الحیلة لمرید ذلک یعنی یہ قصد مذکور اس شخص کے لئے حیلہ ہے جو مکہ، مکرمہ میں بلا احرام داخل ہونا چاہے۔ اس کی وضاحت کے لئے شرح اللباب میں ہے کما اذا قصد مدنی جدة لبیع وشراء ولا یکون فی خاطره انه اذا فرغ منه ان یدخل مکة ثانیا بخلاف من جاء

من الهند مثلاً بقصد الحج أو لا و أنه يقصد دخول جدة تبعا ولو قصد بيعا وشراء۔

ان عبارتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدہ بھی خلیص وغیرہ کی طرح حدود حل میں واقع ہے اور صرف اس شخص کے لئے جس کو محاذاتِ میقات کا علم نہ ہو سکے یا کسی ایسے بحری راستہ سے آرہا ہو جس میں کوئی میقات یا اس کی محاذات راستہ میں نہ آئے ۔ مرحلتین سے احرام باندھنے کے لئے جدہ کی مثال دی گئی ہے اور اہل پاک و ہند کا معاملہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان کا جہاز محاذات یلیم لم سے کچھ آگے بڑھ کر زمین کے اندر حدود حل میں داخل ہو کر کافی فاصلہ حدود حل کے اندر طے کر کے جدہ پہنچتا ہے جو حدود حل میں داخل ہے، اس لئے لازمی ہے کہ بلادِ شرقیہ پاک و ہند وغیرہ کے حجاج کرام اس محاذات سے پہلے پہلے جہاز کے کپتان وغیرہ کے اعلان پر اپنے ظن غالب پر عمل کرتے ہوئے احرام باندھ لیں تاکہ مجاوزت میقات بلا احرام کے گناہ سے بچیں اور ان پر جزائے جنایت لازم نہ ہو ۔ پس اگر یہ لوگ بغیر احرام باندھے اس سے آگے سفر کریں گے تو گنہگار بھی ہوں گے اور دم جنایت بھی ان پر لازم ہوگا اور بے علمی کی وجہ سے نہیں کریں گے تو وہ ان کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوگا اور علمائے کرام و مفتیان عظام بھی ان کو مجاوزتِ محاذات بلا حرج کا فتویٰ دینے کی وجہ سے اس گناہ میں شریک ہوں گے ۔

واضح رہے کہ کسی دوسری طرف سے خشکی سے آنے والے حجاج پر اس بحث کا کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ باقی خطوط بین نقاط المواقیت کا فاصلہ ہر جگہ مواقیت کے فاصلہ سے زیادہ ہی رہتا ہے یا پھر اس کے برابر تو ضرور ہوتا ہے، صرف جو خط یلیم لم اور جحفہ کو ملاتا ہے اس پر یہ اثر ہے کیونکہ وہ خط بہت سی جگہ مکہ مکرمہ سے ایک مرحلہ بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ پر گذرتا ہے جو کسی بھی طرح محاذاتِ میقات نہیں بن سکتا اور سمندری راستہ سے بلادِ شرقیہ سے آنے والے حجاج پر اس کا اثر پڑتا ہے جیسا کہ اوپر کے بیان سے ظاہر ہے اور اہل مصر وغیرہ پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اس لئے کہ ان کو جحفہ کی محاذات کے اندر سے حدود حل میں براستہ سمندر جدہ تک آنا پڑتا ہے جبکہ جدہ خود بھی حل میں داخل ہے اس لئے ان کو بھی جحفہ کی محاذات سے بغیر احرام باندھے آگے نہیں بڑھنا چاہیے ۔ چنانچہ منہاج کی شرح تحفہ کی عبارت جو الفرقان میں نقل کی گئی ہے اس میں آگے یہ ہے بخلاف الجائی فیه من مصر لیس له ان یؤخر احرامه من محاذاة الجحفة لان کل محل من البحر بعد الجحفة اقرب الی مکة منها. غور فرمائیے ، حدود حرم کو ملانے والے خطوط سے بھی ایک مخمس غیر منتظم بنتا ہے جو چاروں طرف سے ہر جگہ کی حدود حرم کو

ظاہر کرتا ہے یہ بالکل صحیح ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے اور اسی کو جناب ملا اخون خان مرغینانی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے جس کا حوالہ عمدۃ المناسک میں بھی دیا گیا ہے۔ غالبًا اسی پر قیاس کر کے جناب مولانا شیر محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مواقیت خمسہ کی حدود مخمستہ الشکل کو بھی محاذاتِ مواقیت قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حدودِ حرم کے خطوط کہیں بھی اس طرح نہیں گذرتے کہ کسی جگہ مکہ مکرمہ سے اقرب مقام سے کم فاصلہ رہ جاتا ہو بخلاف مواقیت کے خطوط کے کہ جحفہ اور یلیم لم کے مابین کا خط مکہ مکرمہ سے ایک منزل سے بھی کم فاصلہ پر سے گذرتا ہے جیسا کہ اوپر بتایا ہے۔

فقاہت نفس:

کاپڑیا صاحب نے حضرت قاری فتح محمد صاحب کے واقعہ کا ذکر کیا کہ وہ طواف کے دوران خود بھی جو کنکریاں محسوس ہوتی ہیں پیروں سے اٹھاتے ہیں اور دوسروں سے بھی اٹھانے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ بتایا کہ قاری صاحب نے ایک مرتبہ تین بار سعی کا اعادہ کیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ قاری صاحب صوفی بھی ہیں عالم بھی ہیں لیکن ان کی یہ باتیں فقاہتِ نفس کی کمی کی علامات ہیں۔ اگر وہ پہلے مسئلے کی تحقیق کر لیتے تو انھیں تین بار سعی کی مشقت نہ برداشت کرنی پڑتی۔ اسی طرح کنکریاں اٹھانا یا اٹھانے کا دوسروں کو حکم دینا یہ بھی فقاہتِ نفس کے خلاف ہے۔ کنکریاں اٹھانا زیادہ سے زیادہ مستحب ہے اور اس سے فرض میں خلل واقع ہوتا ہے۔ پھر اس ہجوم میں کنکریاں اٹھانے کے لئے رکنا بعض اوقات اپنے آپ کو گرانے اور ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہو گا۔

مسائل جان لینا یہ فقاہتِ نفس نہیں بلکہ محل اور موقع کے لحاظ سے مسائل پر عمل کرنا یہ فقاہتِ نفس ہے۔ نیز فرمایا کہ امام ابو حنیفہؒ کی سوانح میں میں نے پڑھا ہے کہ ایک سفر کے موقع پر تنگ وقت میں امام صاحبؒ کو فجر کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا اور انھوں نے امام ابو یوسفؒ کو امامت کے لئے بڑھایا۔ امام ابو یوسفؒ کو تردد ہوا کہ مسنون قرات اور سنن و مستحبات کے ساتھ نماز پڑھاتا ہوں تو وقت میں اتنی گنجائش نہیں اور اگر جلدی جلدی پڑھاتا ہوں تو امام صاحب کہیں ناراض نہ ہوں کہ یہ کیسی نماز پڑھائی۔ میں نے جلدی جلدی ہی نماز ختم کی اور سنن و مستحبات کا لحاظ نہیں رکھا۔ فراغت کے بعد امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ صار یعقوب (امام ابو یوسفؒ کا نام اور

وہ حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں سے بھی ہیں) فقیہا (یعقوب فقیہ ہو گیا) تو یہ فقاہتِ نفس ہے کہ کس موقع پر کس طرح عمل کیا جائے۔

ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنا:

مولانا تھانویؒ نے غالباً بوادر النوادر میں لکھا ہے کہ ہوائی جہاز میں نماز جائز نہیں کیونکہ سجدہ یا تو زمین پر ہونا چاہیے یا تخت، سواری یا پانی وغیرہ ایسی چیز پر جو زمین پر قائم ہو اور ہوائی جہاز زمین پر قائم نہیں۔ اسی بنا پر نہ مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم ہوائی جہاز پر نماز پڑھنے کے قائل تھے اور نہ مولانا بنوریؒ قائل ہیں۔ فرق یہ ہے کہ مفتی صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ پڑھ لینا چاہیے اور بعد میں اعادہ کرنا چاہیے اور مولانا بنوری فرماتے ہیں کہ پڑھنا ہی نہ چاہیے۔

اگر سجدہ کے لئے زمین ہی بلاواسطہ یا بالواسطہ ضروری ہے تو جس طرح پانی کا جہاز زمین پر پانی کے واسطے سے قائم ہے اسی طرح ہوائی جہاز زمین پر ہوا کے واسطے سے قائم ہے (اگر یہ کہا جائے کہ ہوائی جہاز قائم نہیں کیونکہ وہ مسلسل پرواز کرتا رہتا ہے اور ہوا بھی زمین پر قائم نہیں ادھر سے ادھر چلتی رہتی ہے تو کہا جائے گا کہ پانی کا جہاز بھی پانی پر قائم نہیں اور پانی بھی، خصوصاً سمندر کا پانی، زمین پر قائم نہیں، متحرک رہتا ہے۔ لہٰذا دونوں کی کیفیت یکساں ہے اور ہیلی کوپٹر تو ایک جگہ ٹھہر بھی جاتا ہے۔) لہٰذا جو حکم پانی کے جہاز کا ہے وہی ہوائی جہاز کا ہونا چاہیے۔ اور ہوائی جہاز کے زمین پر ہوا کے توسط سے قائم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ بلندی پر جہاں بعض اوقات ہوا نہیں ہوتی ایئر پاکٹ (Air Pocket) آجاتا ہے وہاں ایک دم ہوائی جہاز نیچے ہوا کی جگہ تک آجاتا ہے۔

پھر یہ کہ سجدہ کے لئے زمین ہی کیوں ضروری ہے۔ تخلیق آدمؑ کے وقت فرمایا گیا: فسجد الملئکة کلهم اجمعون (ص ۳۸، آیت ۷۳) پھر سجدہ کیا سب فرشتوں نے اکٹھے ہو کر، ان میں ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے بھی شامل تھے، کیا زمین کے بغیر ان کا سجدہ نہیں ہوا۔ نیز فرمایا گیا الم تر ان الله یسبح له من فی السموت والارض والطیر صفت کل قد علم صلاته وتسبیحه (النور ۲۴، آیت ۴۱) (کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے جو پر پھیلائے ہوئے ہیں، سب کو اپنی اپنی دعا اور اپنی تسبیح معلوم ہے) تو کیا پرندے اور من فی السموات کا زمین نہ ہونے کی وجہ سے سجدہ نہیں ہوتا؟

نماز جمعہ کے لئے جامع مسجد کی شرط ہونا:

۲۷۔ فروری ۱۹۷۶ء جمعہ کے دن اعلان ہوا کہ جمعہ کی نماز مسجدِ نبوی کے امام صاحب مولانا عبدالعزیز بن صالح کوچنگ سینٹر کے میدان میں پڑھائیں گے۔ صبح ساڑھے نو بجے امام صاحب مدرسہ بنوری ٹاؤن میں مدعو تھے۔

ناشتہ سے فراغت کے بعد مسجد میں امام صاحب کی تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد جب لوگ متفرق ہوئے تو مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب سے دو تین آدمیوں کی موجودگی میں دوران گفتگو حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جمعہ کی نماز کے لئے مسجد جامع ضروری ہے جہاں جمعہ پہلے سے ہوتا ہو، یا اگر کسی مسجد میں ابتدا کی جائے تو یہ ارادہ ہو کہ اب یہاں ہمیشہ جمعہ ہوتا رہے گا، میدان میں نمازِ جمعہ جائز نہیں۔ جب رخصت ہونے لگے تو مجھ سے فرمایا کہ آپ کہاں جائیں گے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کے ساتھ جمعہ پڑھ کر پھر گھر جاؤں گا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے گھر پہنچے تو حضرت شاہ صاحبؒ شامی نکال کر لائے اور مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا فتویٰ بھی لائے کہ میدان میں جمعہ جائز نہیں۔

اسی طرح جب ۱۹۷۶ء میں حرم مدینہ و حرم مکہ کے ائمہ اور شاہ خالد پاکستان تشریف لائے اور میدان میں جمعہ کی نماز پڑھی گئی تو حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جمعہ کے لئے مسجد جامع شرط ہے کہ یا تو اس میں پہلے سے جمعہ ہوتا ہو یا جب شروع کیا جائے تو اس مسجد میں جمعہ جاری رکھا جائے۔ میدان میں جمعہ کی نماز جائز نہیں۔ اس سلسلہ میں حاجی محمد حسین کاپڑیا صاحب نے بذریعہ فون مولانا محمد تقی صاحب سے حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی رائے معلوم کی تو انھوں نے فون پر جواب دیا کہ میدان میں نمازِ جمعہ کی گنجائش ہے۔ خود میں نے مفتی ولی حسن صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے بھی فرمایا کہ گنجائش ہے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا کہ اگر گنجائش ہے تو یہ بتایا جائے کہ یہ گنجائش کس جزئیہ یا کس کلیہ سے معلوم ہوئی۔ صرف گنجائش ہے کہہ دینا کافی نہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ "منیٰ میں صرف مسجدِ خیف میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، جس میں مشکل سے اطراف کے آدمی ملا کر زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار آدمیوں کی گنجائش ہو سکتی ہے جبکہ منیٰ میں کئی لاکھ حاجی ہوتے ہیں۔ اگر میدان میں جمعہ کی نماز جائز ہوتی تو یقیناً منیٰ کے میدان یا کئی میدانوں میں جمعہ کی نماز پڑھی جاتی اور کبھی تو پڑھی گئی ہوتی

میں نے مولانا منتخب الحق صاحب سے یہ مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے بھی فرمایا کہ گنجائش ہے لیکن جب میں نے کہا کہ حضرت شاہ صاحبؒ منیٰ کے عمل سے بھی استشہاد کرتے ہیں تو فرمایا کہ واقعتاً اس پر مزید غور کی ضرورت ہے کیونکہ منیٰ کا متوارث عمل جب سامنے ہے تو اس کے خلاف اگر کوئی صریح جزئیہ ہو تو وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔

بندے کی قدرت واختیار:

جس طرح اللہ تعالیٰ بندوں کا خالق ہے اسی طرح ان کے افعال کا بھی خالق ہے خواہ وہ افعال خیر ہوں یا شر اور نیک ہوں یا بد وہ سب اللہ تعالیٰ کے ارادے و مشیت و قضا و قدر سے ظہور میں آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ خیر کی کسب کرنے والے بندے سے پہلے راضی ہوتا ہے اور شر کا کسب کرنے والے بندے سے ناراض ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو افعال کے کسب پر قدرت و اختیار عطا فرمایا ہے کہ وہ افعال خیر و شر میں سے جس کو چاہیں اختیار کریں۔ خیر کے کسب کرنے پر ان کو اچھا بدلہ ملے گا اور شر کے کسب کرنے پر سزا ملے گی۔ جب بندہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔ اگر بندہ اس قدرت کو نیک کام پر لگائے تو بھی اس کو اختیار ہے اور وہ اس اختیار کی وجہ سے اس کے کسب پر جزا کا مستحق ہوگا اور اگر برے کام میں خرچ کرے تب بھی اسکو اختیار ہے اور اس برے استعمال پر سزا کا مستحق ہوگا۔

بندے کی قدرت و اختیار کو ثابت کرنا اس معنی کے لحاظ سے نہیں ہے کہ بندہ جو چاہے کرے اور جو کچھ نہ چاہے نہ کرے، اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ یہ بات تو بندہ ہونے سے بہت دور ہے اور بندگی کی شان کے منافی ہے، بلکہ اس معنی کے اعتبار سے ہے کہ بندہ کو جن امور کا مکلف کیا گیا ہے ان میں اس کو قدرت و اختیار دیا گیا ہے کہ جس کے ذریعہ وہ ان امور کو بجالاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں کو ایسے کام کا حکم نہیں دیتا جو بندوں سے نہ ہوسکے۔

تسمیہ سورۃ کا جزء نہیں:

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام اعظمؒ تسمیہ کو سورۃ کا جز نہیں مانتے، اس کے باوجود اس کے پڑھنے کے استحباب کے قائل ہیں۔ جہری نمازوں میں بھی تسمیہ آہستہ پڑھنا مستحب ہے

لیکن امام عاصمؒ جن کی روایت کے مطابق ہم قرآن پڑھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جہری نمازوں میں تسمیہ بھی جہر سے ہونا چاہیے ۔ اب اگر جہر سے ہو تو وہ سورۃ کا جز ہو گا اور یہ امام اعظمؒ کے مسلک کے خلاف ہے جن کے ہم مقلد ہیں ، اس لئے ہم اس مسئلہ میں فقہی مسئلہ کو قراءت قرآن کے روایتی مسئلہ پر ترجیح دیتے ہیں ۔

فقہی نزاکت:

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فقہا ان نزاکتوں کا لحاظ رکھتے ہیں: فرمایا کہ ایک مسئلہ ہے کہ اگر وقت اتنا تنگ ہو کہ عصر کی نماز پڑھتا ہے تو وقوفِ عرفات فوت ہوتا ہے اور اگر وقوف کے لئے جلدی کرتا ہے تو نماز فوت ہوتی ہے ۔ ایسی صورت میں کیا کرے ؟ اس مسئلہ میں فقہا دونوں جانب گئے ہیں ۔ لیکن بعض باریک بین فقہا نے دونوں کو اس طرح جمع کر دیا کہ چلتا جائے اور اشارے سے نماز پڑھتا جائے ۔ فرمایا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ فقہا اپنی رائے سے کہتے رہتے ہیں ۔ آخر اپنی رائے سے نہ کہیں تو ہر ہر مسئلہ میں قرآن و حدیث کہاں سے لائیں ، جو چیز قرآن و حدیث میں وارد ہو گئی وہاں تو رائے کو دخل نہیں ، لیکن جہاں قرآن و حدیث ساکت ہوں وہاں رائے نہ ہو گی تو کیا ہو گا ۔ جو اعتراض کرتے ہیں رائے سے ، وہ بھی بہت سی باتوں میں رائے رکھتے ہیں ۔ فرق یہ ہے کہ انھیں اپنی رائے پر اعتماد ہوتا ہے اور ہم صاحب الرائے کی رائے پر اعتماد کرتے ہیں ، ذاہب الرائے کی رائے پر اعتماد نہیں کرتے ۔ اگر کوئی شخص مقدمہ میں پھنس جاتا ہے تو خود پیروی نہیں کرتا وکیل کے مشورہ پر عمل کرتا ہے ، اسی طرح ہم صاحب الرائے فقہا کی بات پر عمل کرتے ہیں ۔

اجتماعی اذانیں:

ایک بار حاضر خدمت ہوا ، بھٹو کی حکومت کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کا جو ایجی ٹیشن جاری ہے اس سلسلہ کی ایک کڑی اذانیں بھی ہیں جو مسجدوں اور مکانوں سے مختلف شہروں میں دی جا رہی ہیں ۔ میں نے عرض کیا کہ ان اذانوں کا شرعی حکم کیا ہے ؟ ...... حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اذانیں کئی مواقع پر مسنون ہیں جن کی تفصیل عمدۃ الفقہ اور مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے فتاویٰ میں اور مشکوٰۃ کی شرح مرقاۃ میں موجود ہے اور اسی وقت عمدۃ الفقہ اور مفتی کفایت اللہ

صاحبؒ کے فتاویٰ نکال کر دکھائے اور فرمایا کہ موجودصورت حال میں اذانوں کو مسنون تو نہیں کہا جاسکتا لیکن ان کے مباح ہونے سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس کا اہتمام کرلینا چاہیے کہ اس سے لوگوں کو ایذا نہ ہو کہ لوگ سو بھی نہ سکیں۔ مثلاً ایسا وقت مقرر کرلینا چاہیے جو سونے کا وقت نہ ہو اور سب جگہ اسی وقت اذانیں ہوں۔ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے فتاویٰ سے اس طرح کے مواقع پر اذان کی اباحت معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں پانی پت کے بارش کے واقعہ کا بھی ذکر فرمایا کہ بارش کی کثرت کی وجہ سے حضرت خواجہ محمد سعید صاحب قریشی رحمۃ اللہ علیہ نے اذانوں کا حکم دیا تھا چنانچہ میں نے اذان شروع کی اور اس کی آواز سن کر پورے شہر میں اذانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بارش رک گئی۔

قسطوں پر لئے ہوئے سامان کی زکوۃ:

بعض لوگ حکومت کے اداروں یا پرائیویٹ مالی اداروں سے یا انفرادی طور پر لوگوں سے قسطوں پر مشینری وغیرہ سامان خریدتے ہیں اور اس مشینری کی رقم اپنے ذمہ قرض (دین) سمجھ کر اس رقم کو مانع وجوبِ زکوۃ سمجھتے ہیں اور سال گزرنے پر جب وہ اپنے مال کی زکوۃ نکالنے کے لئے حساب کرتے ہیں تو مشینری کی پوری رقم کو جس کی ادائیگی ان کے ذمہ باقی ہے اپنی سالانہ بچت میں سے منہا کرکے جو رقم بچتی ہے اس پر زکوۃ ادا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسے اکثر لوگوں کے ذمہ مشینری وغیرہ کے قرضہ کی رقم جو انھوں نے بالاقساط ادا کرنی ہوتی ہے اتنی ہوتی کہ اس سب رقم کے منہا کرنے کے بعد وہ صاحبِ نصاب نہیں رہتے بلکہ پھر بھی وہ مقروض ہی رہتے ہیں، اس لئے وہ اپنے آپ کو زکوۃ کی فرضیت سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں۔ خصوصاً بڑی بڑی ملوں اور فیکٹریوں کے مالک مختلف حکومتی یا پرائیویٹ اداروں سے بالاقساط قرضوں پر بڑی بڑی مشینریاں خرید کر کارخانے لگاتے ہیں اور ان قرضوں کی وجہ سے اپنے آپ کو زکوۃ کے وجوب سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں اور ابھی پہلے قرضوں کی قسطوں سے فارغ نہیں ہونے پاتے کہ حکومت کی مزید اسکیموں سے وہی لوگ اپنے سرمایہ دارانہ حقوق وغیرہ کی وجہ سے مزید مشینری بالاقساط حاصل کرکے قرضوں کے زیر بار بنے رہتے ہیں۔ اس بارے میں عرض یہ ہے کہ ہدایہ جلد ثالث باب المرابحۃ والتولیۃ میں ہے "ولو لم یکن الاجل مشروطا فی العقد و لکنہ منجم معتاد قیل لا بد من بیانہ لان المعروف کالمشروط وقیل یبیعہ و لا یبینہ لان الثمن حال"، وفی حاشیتہ تحت

قولہ معتاد یعنی من عادات الناس اذا باعوا شیئا ثمن غال من غیر شرط الاجل فی البیع یاخذون الثمن نجما فنجما . عینی وتحت قولہ لان الثمن حال لعدم ذکر الاجل والاصل الحال فی الثمن واستیفاؤہ منجما لا یخرجہ من ان یکون حالا ، ان عبارتوں سے معلوم ہوا مذکورہ بالاصورتوں میں جو مشینری وغیرہ قسطوں پر خریدی گئی ہے وہ شرعاً دین کے حکم میں نہیں بلکہ اس کی قیمت ثمن حال یعنی نقد ہے اور قسطوں پر رقم کی ادائیگی کرنے سے وہ ثمن حال ہونے سے خارج نہیں ہوتی ۔ پس جب وہ کوئی قسط ادا کرے گا شرعاً وہ ادائیگی نقد کہلائے گی قرضہ کی ادائیگی نہیں کہلائے گی ۔ اس لئے ہر سال زکوٰۃ کا حساب کرنے کے دن بالاقساط خرید کی ہوئی مشینری کی کل قیمت یا اس کی کسی قسط کو زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے اپنی سالانہ بچت میں سے وضع نہیں کیا جائے گا بلکہ بلا وضع کل بچت پر چالیسواں حصہ مد زکوٰۃ میں ادا کرنا لازم ہوگا ۔ یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے ، لوگ اس غلط فہمی کی وجہ سے کہ یہ دین (قرض) ہے اس رقم کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے بلکہ اس کو دین (قرض) سمجھ کر اپنی باقی بچت کو اس دین میں مستغرق سمجھتے ہیں اور اس پر زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ۔ بعض معتبر ذرائع سے ایسا ہی عمل معلوم ہوا ہے اور بادی النظر میں ان کا یہ عمل اگرچہ صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن مذکورہ بالا فقہ کی عبارت اس کے برعکس حکم لگاتی ہے واللہ اعلم بالصواب ۔

نوافل کی جماعت:

ایک مسئلہ دریافت کیا گیا " اگر تراویح کی یہ شکل ہو کہ ایک حافظ بارہ رکعت میں سوا پارہ پڑھ دے اور باقی آٹھ رکعت میں سورہ تراویح پڑھے اور سامع ان آٹھ رکعتوں میں شامل نہ ہوں ۔ پھر سامع تراویح کی نیت سے آٹھ رکعتیں پڑھے اور ان میں وہ سوا پارہ پڑھے اور جو لوگ اس کے ساتھ شامل ہونا چاہیں وہ نفل کی نیت سے شامل ہو جائیں تو کیا یہ جائز ہے اور کیا اس طرح تراویح کی جماعتِ ثانیہ جائز ہوگی ؟ فرمایا کہ یہ صورت بھی جائز ہے اور جماعتِ ثانیہ بھی جائز ہے ۔ جماعتِ ثانیہ صرف فرض کی مکروہ ہے ۔

فرمایا کہ نفل نماز کی جماعت مکروہ ہے تاکہ اہتمام میں فرض سے تشبہ نہ ہو لیکن اگر یہ صورت ہو کہ ایک شخص نفل کی نیت باندھ کر کھڑا ہوا اور ایک یا دو شخص نے اس کی اقتدا کر لی

پھر دوسرے لوگ آتے گئے اور اس کی اقتدا کرتے گئے تو نفل کی اس طرح کی جماعت عدم اہتمام کی وجہ سے مکروہ نہیں۔

حج کے مہینوں میں مکی کا عمرہ:

حج کے اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی کہ اگر کوئی مکی اشہر حج میں میقات سے باہر جائے اور وہاں سے عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ آئے اور پھر اسی سال حج کرے تو کیا اس کا یہ عمرہ اور حج "تمتع شمار کیا جائے گا اور چونکہ تمتع مکی کے لئے مشروع نہیں اس لئے کیا اس پر دم جنایت یا جبر لازم ہو گا؟" مختلف فقہ کی کتابیں دیکھی گئیں اور معلوم ہوا کہ اگر مکی احرام باندھنے کے ارادہ سے نہیں گیا بلکہ کسی اور ارادہ سے گیا ہے مثلاً زیارت کے قصد سے مدینہ منورہ گیا تو اس کا یہ عمرہ نہ تمتع کا عمرہ شمار ہو گا، نہ وہ ممتع ہو گا اور نہ اس پر جبر یا جنایت کا دم آئے گا۔

مسجدِ حرام کی نماز:

عرض کیا گیا کہ جو نمازیں یہاں پڑھتے ہیں ان میں نسبتاً سکون و خضوع ہوتا ہے اور حرم شریف میں عموماً جلدی جلدی نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور اژدحام کی وجہ سے نہ سکون ہوتا ہے اور نہ خشوع و خضوع اور نماز کی حالت میں بھی عموماً جائے سجدہ پر نظریں ہونے کی بجائے بیت اللہ کی جانب اٹھی رہتی ہیں تو کیا مسجدِ حرام کی ایسی نماز بھی یہاں کی ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔ فرمایا کہ جب ارکان و شرائط پورے ہو گئے اور نماز ہو گئی تو وہ یہاں کی ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہوتی ہے، خواہ خشوع و خضوع ہو یا نہ ہو۔ رہا خشوع و خضوع تو یہاں اور وہاں دونوں جگہ خشوع و خضوع ہونے اور نہ ہونے سے ثواب میں فرق ہوتا ہے۔ اور جہاں تک خانہ کعبہ کو دیکھنے کا تعلق ہے، بہر حال یہ خود عبادت ہے، کیونکہ وہ فضا (تعمیر نہیں) تجلیاتِ ذاتیہ کا مہبط ہے، ہر جگہ اور ہر چیز پر تجلیاتِ صفاتیہ کا ورود ہے حتیٰ کہ انبیاء و رسل پر بھی اور بیت اللہ پر تجلیاتِ ذاتیہ کا ورود ہوتا ہے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام کو بھی بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا نمازوں میں حکم ہے۔

نوٹ کی شرعی حیثیت

نوٹ کی حقیقت میں علمائے کرام کا اختلاف ہے، علمائے بریلی و رام پور کے نزدیک نوٹ عرفاً "ثمن" اور "مال متقوم" ہے، اس لئے ان کے نزدیک نوٹ میں تمام احکام مال متقوم کے جاری ہوں گے۔ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی لکھنوی اور مولانا فتح محمد صاحب نائب تلمیذ مولانا عبدالحی صاحب رحمتہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نوٹ ثمن اور مال متقوم نہیں ہے بلکہ "سکہ، بتذل" ہے۔ فتاویٰ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی و فتاویٰ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ و فتاویٰ مظاہر العلوم سہارن پور و فتاویٰ دار العلوم دیوبند کا ماحصل یہ ہے کہ نوٹ نہ ایسا مال متقوم ہے کہ اس کی اتنی بڑی قیمت قرار دی جائے اور نہ ہی سکہ ہے بلکہ "سند زر" اور "حوالہ" ہے۔ پس نوٹ کی حقیقت میں علمائے ہند و پاکستان کے تین قول ہوئے، اول یہ کہ یہ بھی عرف میں دوسرے اموال کی طرح مال ہے، دوم یہ کہ سکہ بتذل ہے یعنی ایسا سکہ ہے جو سکہ ہونے سے پہلے یا سکہ نہ رہنے کے بعد ایسا کم قیمت ہے کہ سکہ ہونے کی صورت میں جو قیمت ہے اس کے حساب سے لاشئ اور بے قیمت سمجھا جائے، البتہ سکہ ہونے کے زمانے میں وہ اصلی سکہ کی برابر قیمتی ہے۔ سوم یہ کہ تمسک اور حوالہ نامہ ہے۔ قول اول والے علمائے کرام کے نزدیک نوٹ کو حکام نے مال قرار دیا ہے اس لئے عرف و اصطلاح قوم میں اس میں ثمنیت و مالیت ثابت ہو گئی اس لئے جب تک یہ رائج ہیں ثمن ہیں، جب رائج نہ رہیں ثمن بھی نہیں رہیں گے۔ اور نوٹ کا تعین کہ فلاں سو روپیہ کا ہے اور فلاں ہزار یا پانچ سو روپیہ کا ہے یہ "تقدیری" ہے۔ اس سے "اتحادِ جنس و قدر" ہر گز لازم نہیں آتا اس لئے ان کے نزدیک نوٹ کو کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت کرنا جائز ہے۔ البتہ اس طرح پر قرض دینا کہ ننانوے روپے دیتا ہوں اور اس کے بدلے سو روپیہ کا نوٹ لے لوں گا بیشک ممنوع ہے۔ فان کل قرض جر نفعا فھو ربٰو (اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان حضرات کے نزدیک نوٹ زکوٰۃ میں دینے سے فقیر کے نوٹ پر قبضہ کرتے ہی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور اسی طرح سے نوٹ کے ساتھ خرید و فروخت وغیرہ کرنے میں روپیہ کے احکام جاری ہوں گے)۔ قول دوم کے علمائے کرام کے نزدیک یہ سکہ بتذل اور ثمن اصطلاحی ہے بلکہ عین ثمن خلقی ہے گو عینیت خلقیہ نہیں، بلکہ عینیت عرفیہ ہو، یعنی نوٹ تمام احکام میں عین ثمن خلقی کی مانند ہے، اس بنا پر انھوں نے کچھ مسائل فقہیہ کی تفریع کی ہے

تیسرے قول والے علمائے کرام کے نزدیک پہلا قول بہت ضعیف اور ناقابل التفات ہے اور دوسرا قول گو اتنا ضعیف نہیں ہے لیکن مولانا فتح محمد صاحب تائب نے سکہ کی جو تعریف فرمائی ہے وہ پوری نوٹ پر صادق آتی معلوم نہیں ہوتی اور حکومت نے بھی اس کو سکہ قرار نہیں دیا اور نہ اس پر قانوناً سکوں کے احکام جاری ہوتے ہیں اور اگرچہ نوٹ کو جبراً سکوں کی طرح واجب القبول بنایا گیا ہے، اس کے باوجود اس کا سند زر اور حوالہ ہونا ہی زیادہ صحیح ہوا، البتہ عام "رقعاتِ زر" اور اس رقعہ، زر میں بس اتنا فرق ہے کہ حکومت کے اعتماد یا جبر کی وجہ سے ہر شخص اس کو قبول کرتا ہے۔ دوسروں کے رقعاتِ زر صرف وہی شخص قبول کرتا ہے جس کو ان پر اعتماد ہوتا ہے۔ پس نوٹ سندِ زر اور بے نام کا رقعہ ہے۔ ہر وہ شخص جس کے پاس نوٹ موجود ہے اس کا روپیہ مانگ سکتا ہے۔ جو لوگ نوٹ سے آپس میں لین دین کریں گے گویا وہ اس کے جاری کرنے والے پر اس کی رقم کا حوالہ کریں گے اور سب احکام میں حوالہ کے اصول کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ درحقیقت اس کی بیع نہیں ہو سکتی بلکہ بطریق حوالہ ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ان حضرات نے اس بنا پر کچھ مسائل فقہیہ کی تفریع کی ہے، اس طرح علمائے ہند و پاکستان کے ان تینوں گروہوں کا نوٹ کے متعلق متفرع مسائل فقہیہ میں کافی اختلاف ہے جس کی تفصیل ان حضرات کے فتاویٰ و کتب فقہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ فقہ اسلامی استنباطی مسائل میں علوم و فنون عقلیہ و نقلیہ دونوں کو مدنظر رکھ کر جزئیات و تفریعات مرتب کرتی ہے اس لئے اس مسئلے میں زر کے متعلق اصول معاشیات کو معلوم کرنا ضروری ہے۔

زر کا ارتقاء:

قدیم زمانہ میں سادہ بود و باش کے باعث لوگوں کی ضرورتیں بڑی مختصر تھیں۔ ہر شخص اپنی حاجت خود ذاتی کوشش اور محنت سے پوری کر لیتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ جب تہذیب و تمدن میں ترقی ہوئی اور انسان کی ضرورتیں بڑھ گئیں اور ہر شخص کو اپنی ذاتی کوشش سے اپنی تمام ضروریات کا پورا کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا تو لوگوں نے اپنے طور پر کاموں کی تقسیم کر لی۔ ہر ایک نے کوئی ایک کام سنبھال لیا اور ایک دوسرے کے ساتھ اپنی چیزوں کا براہِ راست تبادلہ کر کے کام چلاتے رہے۔ اس کو "براہِ راست مبادلہ" یعنی بارٹر سسٹم (BARTER SYSTEM) کہا جاتا ہے۔ انسانی تہذیب کے اولین دور میں جب زر کا وجود نہ تھا اور خرید و

فروخت میں زر یعنی روپیہ پیسہ وغیرہ کا استعمال نہیں ہوتا، تھا لوگ اشیاء کا مقابلہ براہِ راست اشیاء سے کرلیتے تھے، کسان اپنی ضرورت کی ہر چیز اناج کے بدلے حاصل کرتا تھا، جولاہا کپڑوں کے عوض، موچی جوتے کے عوض، بڑھئی فرنیچر کے عوض علیٰ ہذا القیاس ہر شخص ایک چیز دیتا اور اس کے بدلے دوسری چیز لے لیتا۔ جوں جوں آبادی بڑھتی گئی اور حالات و ضروریات میں ترقی ہوتی گئی اس نظام میں انسان کو بڑی سخت دقتیں پیش آنے لگیں، جن سے نجات حاصل کرنے کے لئے زر اور سکوں کا رواج وجود میں آیا، اور تلاش و تجربات کے بعد قیمتی دھاتوں خصوصاً سونے اور چاندی کو اس مقصد کے لئے منتخب کرلیا۔ یہ دھاتیں مقدار میں کمیاب تھیں اور افادیت کے لئے اہم، اس لئے لوگ ان کے ٹکڑے دیتے اور اشیاء حاصل کرلیتے۔ ان کا سنبھالنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا آسان تھا، اس سے خرید و فروخت میں کافی آسانی ہو گئی (دوسری دھاتوں کے مقابلہ میں سونا، چاندی خرید و فروخت میں صرف ثمن کی حیثیت سے ہی استعمال ہوتا ہے اور ضروریاتِ زندگی میں اس کا استعمال شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، وہ بھی تبدیلی ہیئت کے ساتھ اور زیورات کا بنانا صرف اس کی حفاظت اور ذخیرہ اندوزی کے لئے رواج پا گیا ہے، بخلاف دوسری دھاتوں کے کہ ان سے مختلف چھوٹی بڑی استعمال کی چیزیں کثرت سے بنتی ہیں۔ اسی لئے فقہانے سونے اور چاندی کو "ثمن خلقی" کہا ہے اور سونا چاندی اور انکی مصنوعات پر ہر حال میں شرع شریف نے زکوٰۃ فرض کی ہے، خواہ ان کو بڑھانے کے لئے استعمال کیا جائے یا ذخیرہ کیا جائے ان دونوں دھاتوں کو خلقی طور پر بڑھنے والا تسلیم کیا ہے،) غرض زر کی دریافت سے براہِ راست مبادلہ کی تمام دقتوں پر قابو پا لیا گیا اور اشیاء کے لین دین اور خرید و فروخت میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی۔

عمدہ زر کے اوصاف

(۱) قبولیت عامہ، یعنی اسے ایسی قبولیت حاصل ہو کہ ہر شخص بلا حیل و حجت اس کے عوض اپنی چیزیں دینے کے لئے تیار ہو، (۲) انتقال پذیری حجم میں کم ہو اور قدر میں زیادہ تاکہ اسے سنبھالنے، اٹھائے پھرنے، منتقل کرنے اور لینے دینے میں آسانی رہے، (۳) پائیداری یعنی اس کا پائیدار اور دیرپا ہونا ضروری ہے تاکہ اپنی قدر و قیمت ہمیشہ برقرار رکھ سکے، (۴) شناخت پذیری زر ایسا ہونا چاہیے جس کے کھرے کھوٹے کی پہچان ہر شخص کو آسانی سے ہو سکے، (۵) یکسانیت،

یعنی زر کی ہر اکائی ہر اعتبار سے یکساں اور ایک جیسی ہو، (۶) تقسیم پذیری، کم اور زیادہ قیمت والی چیزوں کے خریدنے کے لئے اسے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کی مالیت میں کوئی فرق نہ آئے، (۷) تشکیل پذیری، زر کی شے اتنی نرم ہونی چاہئے کہ سانچوں میں ڈھال کر اس کے سکے بنائے جا سکیں اور حکومت اس پر اپنے ٹھپے لگا کر خاص قسم کے نقوش ابھار سکے تاکہ اصلی اور جعلی سکوں میں تمیز ہو سکے، لیکن وہ اتنی نرم بھی نہ ہو کہ جلد گھس جائے یا اس کے نقوش مٹ جائیں، (۸) ثباتِ قدر، سب سے اہم خوبی جو زر کی شے میں موجود ہونی چاہئے وہ اس کی قدر کا ثبات و استحکام ہے اگر مذکورہ بالا خوبیوں کے پیش نظر مختلف اشیاء کی پرکھ کی جائے تو معلوم ہو گا کہ سونا اور چاندی ہی مطلوبہ معیار پر پورے اترتے ہیں۔

سکہ سازی:

زر کی منازل ارتقاء ابھی درجہ کمال کو نہیں پہنچی تھیں کیونکہ دھاتوں کے محض ٹکڑے بہترین آلہ مبادلہ کا کام نہیں دے سکتے تھے۔ جب بھی کوئی چیز خریدی یا بیچی جاتی ان ٹکڑوں کا وزن کرنا پڑتا اور کھوٹے کھرے میں تمیز کرنی پڑتی، اس لئے اس دقت کو دور کرنے کے لئے سکوں کو رائج کیا گیا اور رفتہ رفتہ اس کی ذمہ داری حکومت نے سنبھال لی۔ اس طرح سکہ سازی کی، مختلف مدارج طے کرتے ہوئے اب یہ پوزیشن ہو گئی ہے کہ آج کل بیشتر ممالک میں سکہ سازی کا کام خود حکومت ہی سرانجام دیتی ہے اور عوام کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ اپنی مرضی سے دھات ٹکسال میں لے جا کر سکوں میں ڈھلوا لیں۔ کیونکہ آج کل سکے سونے، چاندی کے نہیں بنائے جاتے بلکہ سستی دھاتوں کے بنائے جاتے ہیں جن کی اپنی مالیت تو کم ہوتی ہے لیکن حکومت ان کی مالیت زیادہ قرار دیتی ہے۔ مثلاً ہمارے ملک میں ایک روپیہ میں جو دھات استعمال ہوتی ہے اس کی مالیت ایک روپیہ سے بہت کم ہوتی ہے چنانچہ حکومت ملک کی تجارت اور کاروبار کی ضروریات کے مطابق خود سکے بناتی رہتی ہے اور آزادانہ "تسکیک" کا رواج ختم کر دیا گیا ہے۔

زر کی تعریف:

زر کے ارتقاء پر بحث کے بعد اب ہم زر کا صحیح مفہوم اور اس کی قسمیں بیان کرتے ہیں۔ زر کی تعریف ماہرین نے مختلف طور پر کی ہے لیکن زر کی جامع تعریف وہ ہے جو پروفیسر کراتھر نے

وضع کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " زر سے مراد وہ شے ہے جسے آلہ مبادلہ کی حیثیت سے عام قبولیت حاصل ہو اور جو ساتھ ہی پیمائش قدر اور ذخیرہ قدر کا فرض بھی انجام دے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زر بننے کے لئے قبولیت عامہ حاصل ہونی چاہئے ، یعنی ہر شخص اسے بلا روک ٹوک قبول کرے اور اس کے بدلے چیزیں دے ۔ دوسرے لفظوں میں زر کی صحیح ترین اور عالمگیر تعریف یہ ہوئی کہ تمام وہ آلات جنہیں قرضوں یعنی خریدی ہوئی اشیاء و خدمات کی قیمت کی ادائیگی کے لئے قانونی طور پر قبول کرنا پڑے ۔

زر کی اقسام:

(۱) زر معیاری (STANDARD MONEY) : اسے "زر مستند" بھی کہا جاتا ہے ۔ اس سے مراد وہ سکہ ہے جس کے معیار پر تمام دوسرے سکوں کو جانچا جاتا ہے ، اس میں اتنی دھات ہوتی ہے جتنی اس سکہ کی مالیت ہوتی ہے .... (۲) زر وضعی (TOKEN MONEY) : اسے " علامتی زر " بھی کہا جاتا ہے ۔ اس سے مراد ایسا سکہ ہے جس کی وہ قیمت جو اس کے اوپر لکھی ہوئی ہوتی ہے اس کی حقیقی قیمت سے زیادہ ہو ۔ آج کل ہمارا روپیہ ایک وضعی سکہ ہے ۔ اسے سکہ کی حیثیت صرف سرکاری حکم کے باعث حاصل ہے .... (۳) زر کاغذی یا اعتباری (PAPER MONEY OR CREDIT MONEY) : " زر کاغذی " سے مراد ایسے نوٹ ہیں جو حکومت یا ملک کے مرکزی بینک کی طرف سے جاری کئے جاتے ہیں اور وہ بغیر کسی حیل و حجت یا روک ٹوک کے ملک میں گردش کرتے ہیں ۔ " زر اعتباری " سے مراد ایسے کاغذات اور دستاویزات ہیں جن کا اجراء عام بینکوں کی طرف سے ہوتا ہے ۔ ان میں چیک ، ہنڈیاں ، ڈرافٹ وغیرہ شامل ہیں ۔ نوٹ اور اعتباری زر ، وضعی زر کے زمرہ میں آتے ہیں .... (۴) زر قانونی (LEGAL TENDER MONEY) : " زر قانونی " سے مراد وہ زر ہے جو کسی شے کی قیمت کے لئے یا قرضہ کی ادائیگی کے لئے قانوناً دیا جاسکتا ہے اور ملک کے قانون کی رو سے اسے قبول کرنا پڑتا ہے ۔ پاکستان کے سکے اور نوٹ سب زر قانونی ہیں ۔

زر کے فرائض:

زر کے ذمہ یہ پانچ کام ہیں ۔ (۱) آلہ مبادلہ : زر کا اولین فرض یہ ہے کہ یہ آلہ مبادلہ کا کام دیتا ہے ، ہر شخص اپنی اشیاء و خدمات زر کے عوض فروخت کر دیتا ہے .... (۲) معیار قدر : اشیاء

کی قدر و قیمت کو زر کے معیار پر جانچا جاتا ہے اس سے ہر شخص کسی چیز کی مالیت کا اندازہ بآسانی کر سکتا ہے اور چیزوں کے تبادلہ کا کام بڑا سہل ہو جاتا ہے ..... (۳) ذخیرہ قدر: قدر و قیمت کے ذخیرہ کے لئے زر سب سے اچھا کام دیتا ہے کیونکہ یہ آسانی کے ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے ۔ اس کی قدر عام اشیاء کی طرح بہت زیادہ نہیں بدلتی اور اس کے ضائع و خراب ہونے کا احتمال بھی بہت کم ہوتا ہے ..... (۴) آئندہ ادائیگیوں کا پیمانہ زر کی قدر میں قرض کے لینے دینے میں بڑی حد تک ثبات و استحکام پایا جاتا ہے ۔ اگر قرضہ زر کی صورت میں لیا اور دیا جائے تو پوری مالیت میں ادا کیا جا سکتا ہے ..... (۵) انتقال قدر کا ذریعہ: زر کی بدولت یہ آسان ہو گیا ہے کہ ہم اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر لیں، یعنی ایک جگہ کی جائیداد فروخت کر کے زر حاصل کر لیں اور اس زر کی مدد سے دوسری جگہ ویسی ہی جائیداد خرید لیں ۔

زر کاغذی:

اس سے مراد ایسا زر ہے جو سکوں کے بجائے کرنسی نوٹوں پر مشتمل ہے ۔ یہ عام طور پر حکومت یا مرکزی بینک کی طرف سے جاری کئے جاتے ہیں اور لوگ چیزوں کی خرید و فروخت کے لئے انھیں بلا تامل قبول کرتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو حکومت یا بینک کے اوپر اعتماد ہوتا ہے ۔ زر کاغذی کی تین صورتیں ہیں ۔

۱..... "مبادلہ پذیر زر": اس سے مراد ایسا زر کاغذی ہے جو ملک کے مستند یا معیاری زر میں تبدیل کیا جا سکتا ہو ۔ حکومت یا مرکزی بینک اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ حامل نوٹ جس وقت چاہے اسے کاغذِ زر کے عوض زرِ مستند ادا کر دیا جائے گا جیسا کہ نوٹوں پر لکھی ہوئی عبارت سے بھی ظاہر ہے ۔ اس غرض کے لئے حکومت عموماً جاری کردہ نوٹوں کی مالیت کے برابر سونا یا چاندی اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے تاکہ جب لوگ تبدیل کرنا چاہیں تو اسے کوئی دقت پیش نہ آئے لیکن موجودہ زمانہ میں جبکہ کرنسی نوٹ کی بہت بڑی مقدار جاری کی جاتی ہے، سو فیصد زر محفوظ رکھنا بہت مشکل ہے ۔ اس لئے حکومتیں سو فیصد کی بجائے چالیس یا پچاس فیصد سونا یا چاندی محفوظ رکھتی ہیں اور یہ نسبت کافی سمجھی گئی ہے ۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ زرِ کاغذی آلہ مبادلہ کی حیثیت سے بڑی سہولتیں مہیا کرتا ہے اس لئے لوگ روز مرہ کے لین دین کے لئے نوٹ ہی استعمال کرتے ہیں اور شاذ و نادر ہی ان کو تبدیل کرانے کے لئے حکومت یا بینک کے پاس جاتے

ہیں (ممکن ہے اب محفوظ سونا یا چاندی اس سے بھی کم فیصد مقدار میں رکھا جاتا ہو بلکہ بعض حالات میں سونے یا چاندی کی کسی محفوظ مقدار کے بغیر بھی کاغذی نوٹ چھاپنا تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن ایسا کرنا اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔)

۲ .... "غیر مبادلہ پذیر زر": جب حکومت یا مرکزی بینک مطالبہ کرنے پر زرِ کاغذی کو زرِ مستند میں بدلنے کا وعدہ نہ کرے تو ایسے زرِ کاغذی کو غیر مبادلہ پذیر زر کہا جاتا ہے۔ ایسے نوٹ یا تو شروع ہی سے غیر مبادلہ پذیر ہوتے ہیں یا بعد میں حکومت ان کو غیر مبادلہ پذیر ہونے کا اعلان کر دیتی ہے۔ اس قسم کے نوٹ عام طور پر معاشی بدحالی کے زمانہ میں جاری کئے جاتے ہیں۔

۳ .... "امانتی زرِ کاغذی": بینک کے لئے ایک خاص حد مقرر کر دی جاتی ہے جس تک وہ اپنے پاس سونا یا چاندی رکھے بغیر نوٹ جاری کر سکتا ہے اور جب اس حد سے زائد نوٹ جاری کرنا چاہے تو اسے ہر نوٹ کے بدلے اتنی مالیت کی قیمتی دھات رکھنی پڑتی ہے۔ اس کو "امانتی" حد کہتے ہیں۔

منتظم زرِ کاغذی کا معیار:

ملک کے نوٹ سونے میں تبدیل نہیں کئے جاتے بلکہ ان کے عوض محض "وضعی سکے" دینے کا وعدہ دیا جاتا ہے۔ دورِ حاضر کے ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ یہ معیار ایک طرف تو طلائی معیار کی تمام خوبیوں کا حامل ہے اور دوسری طرف اس کے نقائص سے پاک ہے، نیز مرکزی بینک سونے کا کافی ذخیرہ رکھے بغیر ہی زر کی قدر میں استحکام پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک اپنے بعض قومی اور ملکی مفادات کی خاطر مکمل آزادی کے ساتھ مالی اور معاشی پالیسی اختیار کر سکتا ہے اس نظام کو "کرنسی ایکس چینج" کا معیار بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے تحت ہماری کرنسی سٹرلنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے جو خود کاغذی زر ہے اور سونے میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔

بہترین نظامِ زر:

بہترین نظامِ زر وہ نظام ہے جس میں یہ پانچ خوبیاں ہوں .... (۱) قیمتوں میں استحکام برقرار رہے، (۲) شرح مبادلہ بھی مستحکم رہے، (۳) نظام سادہ اور قابل فہم ہو، (۴) نظام لچکدار ہو، (۵) کامل روزگار کی سطح برقرار رکھنے میں معاون ہو۔ زرِ کاغذی میں بھی یہ خوبیاں بدرجہ اولیٰ پائی جاتی

ہیں ۔ زرِ کاغذی کے اور بھی بہت سے فوائد ہیں مثلاً دھات کی بچت، سکہ سازی کی بچت، خرد برد ہونے سے بچاؤ، وافر مقدار، سہل انتقال، بینکوں کا فائدہ، حکومت کو فائدہ، قرضہ بلا سود ۔ اگرچہ زر کاغذی کے کچھ نقصانات بھی ہیں ۔ مثلاً غیر مستحکم قدر، افراط زر کا اندیشہ، غیر ملکی ادائیگیوں میں دشواری ۔ کاغذی زر کی ان خوبیوں اور فوائد کی وجہ سے سونا چاندی کے سکے جو اب تک معیاری زر کا کام دیتے تھے، بعض وجوہات کی بنا پر ان کا استعمال ترک ہوتا جاتا ہے اور ان کی جگہ " کاغذی اور " اعتباری زر " لے رہا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ سونے اور چاندی جیسا قیمتی اور قلیل المقدار آلہء مبادلہ کسی دن ماضی کی یادگار بن کر رہ جائے گا اور اس کے بجائے کاغذی نوٹ اپنی مخصوص خوبیوں کی بدولت عام قبولیت حاصل کر لیں گے اور قیمتی دھاتوں کا استعمال صرف غیر مہذب اور پسماندہ ممالک ہی میں رہ جائے گا، (اصول معاشیات خلاصہ تصرف کے ساتھ) بلکہ آج کل تقریباً ایسی ہی حالت پیدا ہو گئی ہے اور عمدہ زر کے اوصاف جو پہلے بیان ہو چکے ہیں یعنی قبولیتِ عامہ، انتقال پذیری، پائیداری، شناخت پذیری، یکسانیت، تقسیم پذیری، تشکیل پذیری، ثباتِ قدر ۔ یہ سب اوصاف زر کاغذی یعنی کرنسی نوٹ میں بدرجہ اولیٰ پائے جاتے ہیں، اس لئے نوٹ کی حیثیت معاشیات کے ماہرین کے نزدیک وہی ہے جو "سکہء وضعی" (سکہء متبذل) کی ہے ۔

اصول معاشیات کے یہ چند اقتباسات نقل کرنے کے بعد چند فقہی اصول درج کئے جاتے ہیں تاکہ نوٹ کی شرعی حیثیت متعین کرتے وقت ان کو بھی پیش نظر رکھا جائے ۔

(۱) کان صلی اللہ علیہ وسلم یحب ماخفف عن امتہ والدین یسر، (ش، ج ۴، ص ۲۲) ۔ (۲) الثابت عرفا کالثابت نصا یعنی عرفی ثبوت صریح ثبوت کا حکم رکھتا ہے ۔
قال فی المستصفی التعامل العام ای الشائع المستفیض والعرف المشترک لا یصح الرجوع الیہ مع التردداھم العرف العام ھو عرف الناس کافۃ فی البلد ان کلھا فیکون اجماعا ما لا جماع حجۃ، (ش، تصرف ج ۴، ص ۱۹) ۔ (۳) جو چیز بیچی جائے اس کو بیع کہتے ہیں اور جس چیز کے بدلہ میں بیچی جائے اس کو ثمن کہتے ہیں (مرتب) ۔ بیع کے معنی ایک مال کو دوسرے مال کے ساتھ باہمی رضامندی سے بدلنا (ع) ۔ (۴) مایتعین فی العقد فھو مبیع وما لا یتعین فھو ثمن الا ان یقع علیہ لفظ البیع، الاعیان ثلث، اثمان ابدا، ومبیع ابدا، وماھو بین مبیع وثمن، اما ما ھو ثمن ابدا فالدراھم والدنانیر قابلھا امثالھا او اعیان

آخر صحبها حرف الباء ام لا والفلوس اثمان لا يتعين بالتعيين كالدراھم ، الخ
(عالمگیری) ۔(۵) ثمن کی دو قسمیں ہیں، اول ثمن خلقی اور وہ سونا چاندی اور ان دونوں کے سکے
اور وہ سکے جن میں سونا یا چاندی غالب ہو اس کو ثمن ابدی اور نقود بھی کہتے ہیں، دوم ثمن اصطلاحی
یا عرفی یعنی جو خلقی ثمن نہ ہو بلکہ اصطلاح و عرف عام میں اس کو ثمن کہتے ہوں اور یہ وہ سکہ ہے
جس میں سونا یا چاندی مغلوب ہو یا بالکل نہ ہو، جیسے آج کا روپیہ اور فلوس (پیسے، آنے وغیرہ) کہ
جب تک یہ رائج ہیں ثمن ہیں اور جب ان کا رواج بند ہو جائے ثمن نہیں رہتے بلکہ متاع (سامان)
بن جاتے ہیں اس کو "سکہ متبذل"، "بدل نقود" اور "ماھو بین مبیع و ثمن" بھی کہتے ہیں، بلکہ
عرف عام میں عین ثمن کا حکم رکھتا ہے اگرچہ خلقاً عین ثمن نہیں ہے۔ اس لئے ایسا سکہ جب تک
رائج ہے اس کی وہی قیمت ہے جو اس سونے یا چاندی کے سکہ کی ہے جس کے بدلہ میں اس کو
جاری کیا گیا ہے اور جب اس کا رواج بند ہو جائے اس کی حیثیت اس دھات کے دیگر سامان کی سی
ہو جاتی ہے جس دھات سے یہ بنایا گیا ہے، پس وہ بھی اسی بھاؤ میں خرید و فروخت کیا جاتا ہے۔
اس تفصل سے معلوم ہوا کہ فلوس کی طرح کرنسی نوٹ بھی ثمن اصطلاحی و عرفی ہے اور بدل نقود
ہے اور اس کو "زرِ اصطلاحی" و "زرِ کاغذی" بھی کہتے ہیں اور اسی لئے کرنسی نوٹ بھی کہا جاتا ہے
اور ہمارے ملک میں نوٹ روپیہ کے بدل میں جاری کئے گئے ہیں اور آج کل روپیہ بھی خود زرِ
اصطلاحی ہے جو چاندی کے زرِ معیاری یعنی ثمن خلقی کے بدل میں جاری ہوا ہے اس لئے موجودہ
روپیہ اور مروجہ کرنسی نوٹ دونوں کا ایک ہی حکم ہے اور دونوں چاندی کے سکہ کے بالمقابل
ہیں جب تک رائج ہیں اور اسی کے حکم میں ہیں۔(۶) آج کل مسکوک روپیہ بالکل نایاب ہو گیا ہے
حالانکہ وہ بھی سکہ اصطلاحی ہی ہے اور حکومت کی نظر میں ایک روپیہ کے نوٹ اور ایک روپیہ
مسکوک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے اپنی اور عوام کی
سہولت کے پیش نظر مسکوک روپیہ بنانا بالکل بند کر دیا ہے اور ایک روپیہ کے نوٹ نے پوری
طرح سے اس کی جگہ لے لی ہے اور جو پانچ، دس، سو اور پانچ سو روپے کے نوٹ اسٹیٹ بینک
آف پاکستان جاری کرتا ہے وہ بھی حکومت کی مرضی اور حکم سے ہی جاری کرتا ہے۔ چنانچہ ان
نوٹوں پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے "حکومت پاکستان کی ضمانت سے جاری ہوا۔" اور حکومت کی
دی ہوئی ضمانت کی وجہ سے کرنسی نوٹ بھی مستند زر کی طرح عوام میں گردش کرتے ہیں، اسی لئے
یہ قانونی زر میں شمار کئے جاتے ہیں اور آج کل یہ حالت ہے کہ جب بھی بینک سے ان نوٹوں کے

روپے لینے جاؤ تو بدلہ میں نوٹ ہی دیتے ہیں اگرچہ ایک ایک روپیہ کے ہی ہوں ۔ اس لحاظ سے خواہ ایک روپیہ کا نوٹ ہو یا پانچ و دس و سو وغیرہ کا سب کی ایک ہی حیثیت ہے اور سب کا ایک ہی حکم ہے ۔ نقد روپیہ کی شکل بمشکل ان لوگوں کے پاس دیکھنے میں آتی ہے جن کے پاس پہلے کے روپے ابھی تک موجود ہوں ۔ (۷) یہ جو کہا جاتا ہے کہ نوٹ پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہوتی ہے کہ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ حامل ہذا کو جس دار الاجراء سے وہ چاہے عند الطلب ...... روپے ادا کر دوں گا ۔" اس سے نوٹ کا ہنڈی یا حوالہ ، زر یا رقعہ ، زر ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ نقد نہیں بلکہ اس دین کا تمسک ہے جو گورنمنٹ یا بینک کے ذمہ ہے اور اس پر تمام احکام حوالہ ، زر کے جاری ہوں گے ۔ یہ بات ہر لحاظ سے صحیح معلوم نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک لحاظ سے صحیح ہے کہ اگر حامل نوٹ کسی وقت بازار میں چلانے کی بجائے اس کے کسی "دار الاجراء" سے اس کا روپیہ لینا چاہے تو لے سکتا ہے ۔ لیکن بینک بھی تو آج کل ایک ایک روپیہ والے نوٹ ہی دے گا ، نقد روپیہ تو اب ان کے پاس بھی اس قدر نہیں ہے کہ سب نوٹوں کا جو ملک میں جاری ہیں دے سکیں ، البتہ جو سونا یا چاندی نوٹ کی جگہ بینک میں محفوظ رکھا جاتا ہے وہ عند الطلب اگر دیا جائے تو مذکورہ نوٹ کی عبارت کا کچھ مطلب رقعہ ، زر کے مترادف ہو سکتا تھا ، حالانکہ نہ عملاً ایسا ہے اور نہ ہی حقیقیاً ایسا ہے ، کیونکہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ محفوظ سرمایہ سے کہیں زیادہ کے نوٹ اندرون ملک جاری ہیں اور اگر ایسا ہو بھی تو آج کل اس انداز پر بینک سے نوٹ کا سونا یا چاندی طلب کرنے والا شاید ہی کوئی ہوتا ہو ۔ پس نوٹ کی رقعہ ، زر ہونے کی حیثیت بہت ہی ناقابل عمل ہے ، بلکہ عرف عام میں اس کی حیثیت بالکل زر اصطلاحی کی ہے حتیٰ کہ خود حکومت کی نظر میں بھی اس کی یہی حیثیت متعین و متعارف ہے ۔ (۸) کٹے پھٹے نوٹ ہر بینک میں آسانی سے تبدیل کئے جاسکتے ہیں اور لین دین ، خرید و فروخت ، مہر معجل وغیرہ تمام معاملاتِ زندگی میں اس کا چلن بطور نقد عام ہے ۔ کوئی اس کو رقعہ ، زر اور حوالہ ، دین کی حیثیت سے نہیں لیتا دیتا اور اس کے لینے سے انکار کرنا قانوناً کرنسی کے لینے سے انکار کرنے کی طرح جرم ہے ، رقعہ ، زر میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں ۔ (۹) عمدہ زر کی تمام صفات جو اوپر مذکور ہو چکی ہیں کرنسی نوٹ میں بطریق احسن پائی جاتی ہیں اور اس زمانہ میں کرنسی نوٹ بہترین آلہ ، مبادلہ قرار دیا گیا ہے اور یہ بدل نقود ہے ۔ (۱۰) نوٹ کو صرف حوالہ ، زر اور سندِ زر قرار دینے کی صورت میں روزمرہ کے اکثر معاملات میں بڑی مشکل اور پیچیدگی پیش آئے گی اور فقہی مسائل کا ایک کافی حصہ اس سے متاثر ہو گا اور عوام الناس میں جس حد تک اس کا نقد

روپیہ کی طرح عام چلن ہو گیا ہے اس کے پیش نظر عوام و خواص کو اس خیال سے ہٹا کر رقعہ، زر کی تسلیم سے پیدا شدہ فروعات پر چلانا محال کے درجہ میں ہے اور پھر نقد روپیہ کی نایابی یا کمیابی کے باعث اور بھی ناممکن العمل ہو گیا ہے، واللہ اعلم۔ اور شرح شریف میں حرج کو دور فرمادیا ہے اس لئے بھی نوٹ کے بازار میں نقدی کی حیثیت سے عام رواج کے پیش نظر اس کو نقد روپیہ کی حیثیت سے تمام شرعی امور میں تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ لہٰذا آج کل جو نقد روپیہ کسی درجہ میں رائج ہے اور ملتا ہے اور اب سے کئی سال پہلے تو عام ملتا تھا وہ چونکہ خالص یا غالب چاندی کا نہیں ہے اس لئے وہ سکہ اصطلاحی ہونے کی وجہ سے جب تک رائج ہے وہ چاندی کے معیاری سکہ کے حکم میں ہے اور اس روپیہ کی قیمت سولہ آنے یا آج کل کے سو پیسہ ہے۔ اس روپیہ کے متعلق جو فروعاتِ مسائل زکوۃ و خرید و فروخت و بیع صرف و ربوا وغیرہ میں، ہمارے علمائے کرام و فقہائے عظام نے تحریر فرمائی ہیں وہی مروجہ کرنسی نوٹ کے متعلق بھی تسلیم کی جانی چاہئیں، کیونکہ مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں نقد روپیہ اور کرنسی نوٹ کی ایک ہی حیثیت ہے۔ چنانچہ چند جزئیات درج ذیل ہیں:-

۱.... آج کل ہند و پاکستان میں جو روپیہ رائج ہے اس میں چاندی بالکل نہیں ہے اور بعض جگہ کے روپیہ میں چاندی مغلوب ہے۔ نوٹ بھی اسی روپیہ کے حکم میں ہیں اور چونکہ چاندی کے روپیہ کا بدل ہیں اس لئے چاندی کی طرح منسوب ہوں گے۔ سونے اور اشرفی سے ان کا تعلق نہیں ہے اسی لئے نوٹ میں باعتبار روپیہ کے زکوۃ ہے اور نوٹوں کو روپیہ کے بدلہ میں کمی بیشی کے ساتھ بیچنا جائز نہیں، البتہ ان نوٹوں یا بلا چاندی کے روپیوں سے سونا چاندی خرید نا نقد یا ادھار اور کم و بیش ہر طرح سے جائز ہے اور اس میں بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ لیکن جس روپیہ میں چاندی ہو، اگرچہ مغلوب ہو، ان سے سونا چاندی خریدنے میں بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے کیونکہ ان میں جو چاندی ہے اس کو پگھلا کر علیحدہ کیا جاسکتا ہے اور علیحدہ ہو کر وہ قابل انتفاع ہو سکتی ہے اور چونکہ ایک ملک کا روپیہ دوسرے ملک کے روپیہ سے الگ جنس ہے اس لئے ایک ملک کا روپیہ یا نوٹ کو دوسرے ملک کے روپیہ یا نوٹ سے کمی و بیشی کے ساتھ خرید و فروخت کرنا جائز ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

۲.... جس طرح ان روپیوں سے زکوۃ کے نصاب کا حساب چاندی کی قیمت سے کیا جائے گا اور چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی ہے اس لئے جتنے روپیوں کی ساڑھے باون تولہ چاندی

آئے گی اتنے ہی روپے نصاب قرار دیئے جائیں گے، اسی طرح نوٹوں میں بھی اتنے ہی روپے کے نوٹ نصاب قرار پائیں گے۔

۳.... جس طرح روپے زکوۃ میں کسی فقیر کو دینے سے فقیر کے ان پر قبضہ کرتے ہی زکوۃ ادا ہو جاتی ہے اسی طرح نوٹ زکوۃ میں دینے سے نوٹ پر فقیر کا قبضہ ہوتے ہی زکوۃ ادا ہو جائے گی اور اسی طرح نوٹ کے ساتھ خرید و فروخت کرنے وغیرہ میں نقد روپیہ کے احکام جاری ہوں گے۔

۴.... جب نوٹ پر سرکاری حکم سے بٹہ لگے تو بٹہ لگنے کے بعد جو قیمت ہوگی وہی سمجھی جائے گی اور اس سے جو نقصان مالکان نوٹ کا ہوا وہ بذمہ سرکار رہا، اس لئے کہ اموال خلق میں سلطانی تصرفات معتبر نہیں ہیں۔

۵.... ایسے نوٹ جب ایسے مقام پر جائیں جہاں رواج نہ ہو تو حکم مسکوکیت باقی نہ رہے گا، بلکہ اب وہ تمسک ہو گئے اس لئے اب ان کی زکوۃ دوسرے قرضوں کی مانند وصول ہونے کے بعد دینی ہوگی اور ان کی بیع مدیوں یا اس کے گماشتہ کے ذریعہ سے ہوگی اس کے سوا نہیں اور ایسی حالت میں کمی بطور اسقاط فرضی یا زیادتی ناجائز ہوگی۔

۶.... ایسے نوٹوں سے اگر کچھ خریدا جائے یا کسی عوض میں لازم ہوں پھر رواج نہ رہے تو روپیہ واجب الادا ہوگا۔

۷.... نوٹ اگر امانت ہوں یا رہن یا کسی کے حکم سے خریدے پھر رواج نہ رہا تو قابض بعینہ وہی نوٹ دے دے، ضامن نہیں ہوگا لیکن اگر خلط و منع سے ضامن ہو جائے تو قیمت واجب ہوگی۔

سماع:

ساز اور باجوں کے ساتھ کسی قسم کا بھی گانا حتیٰ کہ حمد و نعت بھی ناجائز ہے۔ بغیر ساز کے چند شرائط کے ساتھ جن کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے صرف وقتاً فوقتاً سن سکتے ہیں مثلاً پڑھنے والا معمر باشرع ہو، سننے والا صاحبِ دل ہو۔ محفل میں نابالغ بچے اور عورتیں نہ ہوں، کسی قسم کا ساز نہ ہو وغیرہ۔ کسی سالک کو راہ سلوک میں قبض ہو جاتا ہے تو اس کے قبض کو توڑنے کے لئے شیوخ کبھی نعت اور حمد کو سننے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ آواز میں چونکہ جادو ہے اس لئے انسان جلد مسحور ہو جاتا ہے۔ .... لوگ نماز کی حقیقت سے ناواقف ہیں یہی وجہ ہے کہ صوفیوں کا ایک جم غفیر اپنے اضطراب اور قبض کی تسکین و علاج، راگ و نغموں کے پردے میں

دیکھتے ہیں اور اپنے مطلوب کو سماع و وجد و تواجد میں تلاش کرتے ہیں، اسی لئے وہ رقص و سماع کو اپنی عبادت بنالیتے ہیں۔ اگر نماز کے کمالات کا ایک شمہ بھی ان پر ظاہر ہو جاتا تو کبھی بھی سماع و نغمہ کا دم نہ بھرتے اور وجد و تواجد کو یاد نہ کرتے۔

انگوٹھے چومنا:

بریلویوں کے کچھ شعار ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اشھدان محمد رسول اللہ پر انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر تو ایسا نہیں کرتے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر کرتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ محبت رسول کے غلبہ کا نتیجہ ہے، لیکن انگوٹھے چومنا حدیث کی کسی معتبر کتاب میں موجود نہیں۔ البتہ صوفیہ کی روایت میں ملتا ہے اور صوفی مزاج فقہا مثلاً فتاوی صوفیہ، کوہستانی اور شامی میں اس کا ذکر ہے۔ شامی کے مزاج میں بھی تصوف ہے۔ اگرچہ شامی نے اس کی تصریح بھی کر دی ہے کہ یہ روایت حدیث کی کسی معتبر کتاب میں نہیں۔ پھر اگر انگوٹھے چومنا کسی روایت میں ہو بھی تو زیادہ سے زیادہ مستحب ہو گا اس کا شعار بنالینا اور اتنی اہمیت دے لینا کہ جو نہ کرے اس پر نکیر کی جائے مستحب کو اس کے درجہ سے بڑھا دیتا ہے جو ناجائز ہے۔

پھر اس پر عقلی حیثیت سے غور کرو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے نام پر اگر چومنا ہے تو اس اذان یا اقامت کہنے والے کے منھ کو چومو جس سے یہ مبارک نام نکلا ہے یا چونکہ لوگ اذان و اقامت کا جواب بھی دیتے ہیں تو ایک دوسرے کے منھ کو چومو۔

قد قامت الصلوۃ پر کھڑے ہونا:

بریلویوں کا ایک شعار یہ بھی ہے کہ سب لوگ قد قامت الصلوۃ پر کھڑے ہوں۔ فرمایا کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانے میں عموماً یہ ہوتا تھا کہ صحابہ کرامؓ صف بنا کر منتظر رہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارکہ سے برآمد ہوتے ہی اقامت شروع ہو جاتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے جیسے آگے آتے جاتے تھے لوگ کھڑے ہوتے جاتے تھے، آپؐ مصلے پر تقریباً اس وقت پہنچتے تھے جب مکبر قد قامت الصلوۃ کہہ رہا ہوتا تھا۔ آپؐ آکر مصلے پر کھڑے ہو جاتے تھے اور اسی وقت سب صحابہ کھڑے ہو جاتے تھے۔ لہذا قد قامت الصلوۃ پر کھڑے ہونا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ثابت ہے ۔ اب بھی اگر کوئی امام یہ کرے کہ حجرہ سے برآمد ہو اور تکبیر شروع کی جائے اور امام مصلے پر آکر کھڑا ہو جائے اور لوگ بھی قد قامت الصلوۃ پر کھڑے ہو جائیں تو یہ سنت کے مطابق ہو گا ۔ لیکن کرتے یہ ہیں کہ امام پہلے سے آکر مصلے پر بیٹھ جاتا ہے اور پھر سب لوگ قد قامت الصلوۃ پر کھڑے ہوتے ہیں اور جو پہلے کھڑا ہو جائے اسے برا سمجھتے ہیں، یہ طریقہ درست نہیں اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو پہلے سے کھڑا کر کے صفیں سیدھی کر دیا کرتے تھے اور پھر اقامت شروع ہوتی تھی لہذا جو پہلے سے کھڑا ہو جائے اس پر نکیر نہیں کرنی چاہیئے ۔

مردوں کو ثواب پہنچانا:

مردوں کو ثواب پہنچانے کے بارے میں علماء کی دو رائیں ہیں، بعض کہتے ہیں کہ ہر ایک کو ثواب پورا پورا ملتا ہے اور اکثریت کی یہی رائے ہے اور بعض کہتے ہیں کہ تقسیم ہو کر ملتا ہے ۔ فرمایا کہ جن کو پہنچایا جائے ان کو تو ایک ایک ملتا ہے لیکن پہنچانے والے کو اپنا بھی ملتا ہے اور جن کو پہنچایا ہے ان میں سے ہر ایک کا ثواب بھی ملتا ہے ۔ مثلاً ایک بار سورۃ احد پڑھ کر سو آدمیوں کو بخشی تو ہر ایک کو ایک ایک قل ھو اللہ کا ثواب ملے گا لیکن بخشنے والے کو ایک سو ایک قل ھو اللہ کا ثواب ملے گا ۔ ایک پڑھنے کا اور سو سو آدمیوں کو بخشنے کا ۔

تبلیغ کے لئے امر و نہی کا جاننا:

نیکی کا امر کرنا اور برائی سے روکنا امت کے ہر فرد پر اس کی استطاعت و قدرت کے مطابق واجب ہے ۔ تبلیغ دین کے لئے معروف و منکر کا پوری طرح اور صحیح صحیح علم ہونا ضروری ہے ۔ کیونکہ جس شخص کو خود ہی علم نہ ہو اور وہ اپنے ذہن کے مطابق دوسروں کو نیکی کا حکم کرنے لگے یا برائی سے روکے تو ظاہر ہے کہ اصلاح کی بجائے فساد ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ناواقفیت کے باعث کسی نیک کام سے منع کرنے لگے یا کسی برے کام کا حکم کرنے لگے ۔ اس لئے اس فریضہ کے عائد ہونے سے پہلے اس شخص پر اس کا علم حاصل کرنا فرض ہے اور جب تک وہ ان امور کے متعلق جن کی وہ تبلیغ کرنا چاہتا ہے ، صحیح علم حاصل نہ کر لے اس کو امر بالمعروف و نہی منکر کے لئے کھڑا نہیں ہونا چاہیئے ورنہ اس کا فعل معاشرے کی اصلاح کی بجائے خرابی اور فساد کا سبب ہو گا

تبلیغ دین میں صحابہ کا حصہ:

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ صحابہ کرام نے دین کی اشاعت و تبلیغ میں اپنی جان و مال سے جس قدر حصہ لیا ہے دنیا کی کسی قوم اور کسی مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر جس قدر عمل کیا ہے اس قدر جامعیت کے ساتھ صحیح عقائد و اخلاص اعمال کا عشر عشیر بھی کسی غیر صحابی سے ظہور میں نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی غیر صحابی بڑے سے بڑا ولی بھی کسی ادنیٰ درجہ کے صحابی کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا اور کسی ادنیٰ صحابی کا ایک مد جو راہِ خدا میں خرچ کرنا کسی غیر صحابی شخص کے کوہ احد کے برابر سونا راہِ خدا میں خرچ کرنے سے بھی افضل ہے۔

بدعت:

دین میں جو مداخلت کی جائے وہ بدعت کہلاتی ہے، دین کے لئے جو چیز کی جائے، وہ بدعت نہیں۔ اگر یہ اعتراض درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس طرح تو مدرسوں میں بخاری شریف پڑھنا بھی بدعت ہو گا کیونکہ اس زمانہ میں اس طرح علم نہیں پڑھایا جاتا تھا، حالانکہ علما کے ذریعے ظاہری علوم ہم تک پہنچے ہیں اور صوفیا کے ذریعہ باطنی علوم ہم تک پہنچے ہیں۔ یعنی دین کے لئے کوئی نئی چیز وجود میں آئے یہ بدعت نہیں ہے۔ دین کے اقسام میں کسی نئی چیز کا وجود میں آنا اور احکام الٰہی اور سنت نبوی علیہ الصلوۃ والسلام میں اپنی طرف سے گھٹانا یا بڑھانا بدعت ہے۔ احکام شریعت آٹھ ہیں:۔ فرض، واجب، سنتِ مؤکدہ، سنتِ غیر مؤکدہ یا مستحب، مباح، حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی۔ ان کو اپنے مقام سے آگے پیچھے کرنا بھی سخت بدعت ہے یعنی جو چیزیں مستحب ہیں ان کو فرض کا درجہ دینا۔

مشینی مرغی کا حکم:

وہ جانور جس کا سارا جسم خالص حرام غذا سے بنا ہوا ہو حرام ہے اور جس کا کچھ جسم غالب حلال غذا سے بنا ہو اس میں کراہت ہے۔ شریعت ہر مسئلے کی پوری تفصیل بتا دیتی ہے، آدمی کو اپنی کیفیت کے مطابق اس پر عمل کرنا چاہیئے اور یہ ہر آدمی کی اپنی نیت پر منحصر ہے۔ بعض دفعہ فتویٰ

پر عمل کرنا تقویٰ سے افضل ہے۔ عموم بلویٰ کے بارے میں شریعت نے یہاں تک تفصیل دی ہے کہ اگر آدمی دو حرام میں پھنس جائے تو ہلکے حرام کو اختیار کر لے۔ بعض دفعہ آسانی چھوڑ کر تنگی میں پڑنے سے آدمی کفر کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ مثلاً بنک کی ملازمت چھڑانے سے آدمی افلاس میں پھنس جائے گا اور بعض دفعہ افلاس کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

سماعِ موتیٰ:

انک لا تسمع الموتی (النمل ۲۷-آیت ۸۰) [تحقیق آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔
سماعِ موتیٰ تو صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ قلیب بدر کے مردوں کو حضور علیہ الصلوۃ و السلام نے مخاطب کر کے فرمایا: ہمارے رب نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ تو ہم نے سچ پالیا کیا تم نے بھی وہ وعدہ سچ پالیا، جو تم سے تمہارے رب نے کیا تھا۔ بعض صحابہؓ نے جب عرض کیا کہ حضور! آپ ان مردوں سے کیا باتیں کر رہے تھے جو کچھ بھی نہیں سنتے، تو آپ نے فرمایا کہ وہ اتنا سن رہے ہیں کہ تم بھی ان سے زیادہ نہیں سن سکتے۔ پھر جب کوئی قبور پر پہنچے تو سلام کرنے کا حکم ہے۔ اگر وہ نہیں سنتے تو شارع کا یہ حکم عبث ہو گا۔ اس لئے اس آیت کی یہ تاویل کی گئی ہے کہ کسی کی طاقت نہیں کہ براہِ راست مردے کو کچھ سنا سکے، اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سنوا دیتا ہے۔

طہارت و تطہیر:

گلاس میں جب پانی لیا جائے تو احتیاط رکھنی چاہیے کہ اس میں ناخن یا انگلیاں نہ ڈوبیں کیونکہ اس طرح پانی مستعمل ہو جاتا ہے اور مستعمل پانی میں خواہ طہارت کی صفت باقی رہے لیکن تطہیر کی صفت باقی نہیں رہتی۔

امر اور نہی:

شرع میں حکم کی دو قسمیں ہیں، ایک امر اور دوسری نہی۔ امر میں فرض، واجب، سنت، مستحب، مباح شامل ہیں اور نہی میں حرام، مکروہِ تحریمی اور مکروہِ تنزیہی ہو گی۔ پس انہی باتوں سے ہر چیز اور عمل کی نوعیت معلوم ہو سکتی ہے، یہ ایک کسوٹی ہے جس سے سب چیزیں جانچی جا سکتی

ہیں۔

ایک گر کی بات یہ ہے کہ جو عمل سنت ہو گا وہ ہر جگہ اور ہر ملک میں یکساں ہو گا۔ عرب یمن، ہندوستان، ایران اور پاکستان وغیرہ وغیرہ۔ اور جو کام بدعت ہو گا وہ ہر جگہ اور ہر ملک میں یکساں نہیں ہو گا۔ کسی ملک میں کسی طرح رائج ہو گا اور کسی ملک میں کسی اور طرح۔ مثلاً محرم یعنی ایران میں محرم منانے کا اور طریقہ ہے، عراق میں اور طریقہ اور ہندوستان میں اور طریقہ ہے محرم کا منانا چونکہ خود بدعت ہے اس لیے الگ الگ طریقے سے منایا جاتا ہے مگر دسویں محرم کا روزہ رکھنا سنت ہے۔ لہٰذا یہ ہر جگہ اور ہر ملک میں رکھا جاتا ہے۔

وضو کے آداب:

وضو اور نماز میں سنت کی پیروی کا لحاظ رکھیں تو یہ بڑی بات ہے اور ترقی کا راز بھی اسی میں ہے۔ مثلاً وضو کرتے وقت بات نہ کرے، صحیح طریقے سے وضو کرے، جب نمازی وضو کرنا شروع کرتا ہے تو فرشتے نور کی چادر اس کے سر پر تان لیتے ہیں۔ اگر وہ ایک مرتبہ بولے تو ایک کونہ چھوڑ دیتے ہیں، پھر بولے تو دوسرا، پھر تیسرا اور پھر چوتھا کونہ چھوڑ دیتے ہیں، پھر وہ نور کی چادر اوپر اڑ جاتی ہے۔ کیسی بدنصیبی ہے کہ تھوڑی دیر خاموش نہ رہنے سے اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت سے محروم ہو گیا۔

سائیں توکل شاہ انبالویؒ ایک مرتبہ وضو کر رہے تھے، مولانا اشرف علی تھانویؒ کھڑے دیکھتے رہے، جب پیر دھونے لگے تو پنڈلیاں کچھ کھل گئیں۔ مولانا صاحبؒ نے دیکھا کہ سائیں صاحبؒ کی پنڈلیوں میں گڑھے پڑھے ہوئے ہیں۔ مولانا نے دوران وضو ہی فرمایا: سائیں صاحب آپ نے تو نفس کا حق بھی مار دیا۔ سائیں صاحبؒ نے جواب نہ دیا۔ جب وضو کر چکے تو فرمایا: مولانا صاحب! میں جاہل آدمی حق وق تو جانتا نہیں، ہاں اتنا جانتا ہوں کہ اتنا کرنے پر بھی کمبخت قابو میں تو آیا نہیں۔

قرآن شریف کا جیب میں رکھنا:

جیب کا حکم غلاف کا سا ہونا چاہئے لیکن بہتر ہے کہ قرآن کریم کو کسی پلاسٹک وغیرہ کے غلاف میں رکھ کر جیب میں رکھا جائے۔

نوافل کھڑے ہو کر پڑھنا:

بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھے، اب لوگوں نے بیٹھ کر پڑھنے ہی کو شعار بنالیا ہے۔ حالانکہ حضور علیہ الصلوۃ و السلام کے اقوال سے ثابت ہے کہ کھڑے ہو کر نفل پڑھنا اقوی ہے اور فعلی اور قولی حدیث میں سے قولی کو ترجیح ہوتی ہے لہذا وتر کے بعد کے ان نوافل کو بھی کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے اور اسی لئے حضورؐ کے بیٹھ کر پڑھنے کو یا تو آپ کی خصوصیت پر محمول کیا جائے گا یا اس کی یہ تعلیل کی جاتی ہے کہ کثرت عبادت سے تھک کر آپؐ نے بیٹھ کر نوافل پڑھے ہوں۔

قرآن میں تدبر:

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں غور و فکر اور تدبر کی عام دعوت دی ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

افلا یتدبرون القرآن (محمد، آیت ۲۴) کیا لوگ قرآن مجید میں غور نہیں کرتے۔

پس تدبر کا حکم صرف اماموں اور مجتہدوں ہی کے لئے نہیں بلکہ یہ حکم عام ہے۔ البتہ تدبر و تفکر کے درجات علم و فہم کے درجات کے موافق مختلف ہوں گے۔ ائمہ مجتہدین کا تفکر ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل کا استنباط کرے گا اور عام علماء کا تفکر ان مسائل کے سمجھنے تک پہنچے گا اور عوام اگر قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر اپنی زبان میں پڑھ کر تدبر کریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت اور آخرت کی فکر پیدا ہوگی جو کامیابی کی کنجی ہے۔ البتہ عوام کے لئے بہتر یہ ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر کسی مستند عالم سے سبقاً سبقاً پڑھیں اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کسی مستند و معتبر تفسیر کا مطالعہ کریں اور جہاں کہیں کوئی اشکال ہو وہاں اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کے بجائے مستند و ماہر علماء کرام سے رجوع کریں۔

اگر قرآن مجید کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کے معانی و مضامین میں کوئی اختلاف نہیں۔ اگرچہ تدبر کے بغیر محض سرسری مطالعہ سے اس میں بہت سے اختلاف نظر آنے لگیں اور جب غور و فکر کے بعد اس میں کوئی اختلاف نظر نہیں آئے گا تو ماننا پڑے گا کہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی نے نازل فرمایا ہے اگر اس کے سوا کوئی اور اس کو بنانے والا ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلافات و تضادات پائے جاتے۔

نماز میں خشوع و خضوع:

نماز میں خشوع و خضوع پیدا کرنے کے لئے یکسوئی، نیت میں خلوص اور حضورِ قلب ہونا چاہیئے۔ نماز سے جس قدر لگاؤ اور دلچسپی ہو گی نماز اتنی ہی کامل ہو گی اور نماز میں اسی قدر خشوع و خضوع ہو گا۔ نماز کی نیت دل سے کرے اس طرح کم از کم نماز شروع کرتے وقت تو دل حاضر ہو گا زبان سے کہہ لے تو بہتر ہے۔ صحابہ کرامؓ سے زبان سے نیت کرنا ثابت نہیں، یہ بعد کے علماء کا خیال ہے۔

نماز میں نیت کرتے وقت ہاتھ اٹھاتے ہوئے یہ خیال کرے کہ میں نے ساری دنیا کو پس پشت ڈال دیا اور اب اپنے رب خالق و مالک کے سامنے اس کی عبادت کے لئے کھڑا ہوا ہوں۔ جو کچھ پڑھے اس کا خیال کرے، اس کے مطلب و معنی کا دھیان رکھے، ادب و احترام سے کھڑا رہے اور یہ خیال کرے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں، اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم یہ خیال تو کرے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے، جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے خدا اسے سن رہا ہے۔ کم از کم فرض نمازیں مسجد میں ادا کرے، نوافل کے لئے گھر میں کوئی ایسی جگہ مقرر کرلے جہاں گھر والوں کی آمدورفت نہ ہو۔ تنہائی ہو گی تو یکسوئی ہو گی۔ عمل کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے، جیسی نیت ہو گی ویسا ہی عمل ہو گا اس لئے نیت کا درست ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔

شریعت و طریقت:

بزرگوں نے شریعت اور طریقت کو ایک ہی درخت فرمایا ہے۔ شریعت ایک جڑ ہے تو اس کی شاخیں اور تنا طریقت ہے اور پھل پھول معرفت۔ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خلافتِ راشدہ میرے بعد تیس سال تک رہے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خلفائے راشدین میں ہر طرح کی جامعیت موجود تھی، یہ چاروں مبارک ہستیاں ہر چیز کا مرکز تھیں۔ شریعت، طریقت، سیاست اور تصوف وغیرہ کا۔ اس لئے ان کے زمانے میں تصوف کوئی الگ چیز نہ تھی، بلکہ شریعت اور طریقت یکجا موجود تھیں۔ خلفائے راشدین کے بعد وہ بات نہ رہی اور ہر چیز کے الگ الگ گروہ بن گئے۔ چنانچہ ایک گروہ صوفیائے کرام کا بن گیا، ایک گروہ محدثین کا اور ایک گروہ کے ذمہ صرف حکومت کا انتظام رہ گیا۔ اس طرح بہت سے الگ الگ طبقے بن گئے۔ حضور اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے بیعت لی ہے۔آپؐ کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بھی بیعت لی ہے، یہ بیعت بیعتِ توبہ کہلاتی ہے، لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں یا صحابہؓ کے زمانے میں بیعت کا طریقہ نہیں تھا۔اس بیعت توبہ میں ہر چیز شامل تھی یعنی گناہ سے توبہ، ذکر کرنا اطاعت کرنا وغیرہ وغیرہ۔

صحابہ کرامؓ کے بعد حکومت بادشاہی میں تبدیل ہو گئی اور خلافت کی بیعت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔جوں جوں نبوت کا زمانہ گذرتا گیا بیعت کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور صوفیائے کرام نے دوبارہ اس سنت کو زندہ کیا اور لوگوں سے بیعت لینا شروع کی، یہ بیعت بیعتِ توبہ کہلاتی ہے۔

زکوۃ کی ادائیگی:

عرض کیا گیا کہ جب زکوۃ فرض ہے تو فرض کو پوشیدہ رکھنے میں کیا مصلحت ہے؟ فرمایا: اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ اس امر سے اس کے ورثاء میں کسی قسم کی ناگواری ہو، کیونکہ وہ اس کے مرنے کے بعد مال کے وارث ہیں، اس لئے پوشیدہ دینا افضل ہے ورنہ علی الاعلان بھی دے سکتا ہے۔

زکوۃ کا نصاب:

آج کل جو ہمارے پاس روپے اور نقدی ہے اس کا شمار چاندی میں ہوتا ہے اور جس آدمی کے پاس نقدی بالکل نہ ہو اور اس کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا ہے وہ صاحبِ نصاب ہے ورنہ نہیں۔اگر اس کے پاس کچھ سونا ہے اور کچھ چاندی (نقدی) یا خالص چاندی، اگر دونوں کی قیمت لگائیں اور چاندی والا نصاب بن جائے تو اس پر زکوۃ ہے ورنہ نہیں۔

عرض کیا گیا کہ عورتوں کے پاس کچھ سونا ہوتا ہے اور کچھ چاندی ان دونوں کی قیمت لگائی جائے تو صاحبِ نصاب بن جاتی ہیں لیکن ان کی گذر اوقات تنگ ہوتی ہے اور ان زیورات کو وہ خزانہ بناتی ہیں۔حالانکہ اگر ان کے پاس یہ چیزیں نہ ہوں تو وہ واقعی زکوۃ کی مستحق ہوتی ہیں، لیکن اب نہیں۔فرمایا کہ ان کو صرف ایک ہی مسئلہ بتایا جائے تو وہ کیسے سمجھیں گی کیونکہ شروع ہی سے ان کا مزاج تو ایسا نہیں ہے۔

علم غیب:

یہ مسئلہ جب عوام میں آتا ہے تو زیادہ سنگین ہو جاتا ہے خواص کی حد تک رہے تو اتنا سنگین نہیں رہتا۔ فرمایا کہ دیوبندی اور بریلوی دونوں گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہرِ اتم مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت عالم الغیب بھی ہے۔ لہٰذا آپؐ اس کا بھی مظہرِ اتم ہوئے۔ اس میں کسی گروہ کا اختلاف نہیں، اور خواص کے درمیان اس پر بھی اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم غیر محدود اور آپؐ کا علم محدود ہے۔ چنانچہ بہارِ شریعت میں مصنف نے لکھا ہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہر ذرہ کا علم ہے تو لوگ اعتراض کرتے ہیں حالانکہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کا غیر محدود ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ذرات بھی تو محدود ہیں۔ اس پر بھی دونوں گروہوں کا اتفاق ہے کہ غیب کا جتنا علم اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دیا اور کسی کو نہیں دیا۔ اس پر بھی سب متفق ہیں کہ جب آپ پر درود شریف بھیجا جاتا ہے تو وہ آپ کو پہنچتا ہے، خواہ بلاواسطے پہنچے یا فرشتوں کے واسطے سے۔ جب روضہ مبارک پر صلوٰۃ وسلام پڑھا جائے تب تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خود سنتے ہیں، اس پر بھی دونوں گروہ کا اتفاق ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی مٹی اور اتنی دیواروں کے حائل ہوتے ہوئے یہ سننا خرق کے طور پر ہے تو یہ خرق بعدِ مسافت کے باوجود بھی ہو سکتا ہے چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ میں لکھا ہے کہ دور سے بھی الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کہنا جائز ہے۔ البتہ مطلقاً یا رسول اللہ کہنا درست نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب بالقوہ ہیں جیسے کہ گٹھلی میں درخت بالقوہ موجود ہوتا ہے اور جیسے جیسے وقت آتا جاتا ہے وہ غیب کا علم قوت سے فعل میں آتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور قیامت میں بھی جاری رہے گا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جو لوگ میرے پاس شفاعت کے لئے آئیں گے تو میں شفاعت سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کروں گا اور وہ الفاظ کیا ہوں گے یہ اس وقت مجھے بھی معلوم نہیں، اللہ تعالیٰ اسی وقت مجھے سکھائے گا۔

عالم الغیب کی وضاحت:

مسئلہ عالم الغیب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں فریقین نے لفظی اختلاف ڈال دیا ہے جس سے عوام میں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک فریق کہتا ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ

وسلم کو ذرہ ذرہ کا علم ہے، دوسرا کہتا ہے کہ انھیں ذرہ ذرہ کا علم نہیں ہے بلکہ اللہ پاک نے انھیں جتنا علم جس وقت دیا اس کا انھوں نے اظہار کر دیا۔ ذرہ ذرہ کے علم پر جب اعتراض کیا گیا تو علماء نے اس کی توجیہ یوں کی کہ ذرے اگرچہ لاتعداد ہیں، ہم انھیں گن نہیں سکتے. بہرحال لامتناہی نہیں آخر کوئی تو حد ہوگی جس کا علم اللہ پاک کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ذرے متناہی ہوئے اور ذرے ذرے کا علم کہنے سے رسول پاک کا علم بھی متناہی ہوا لامتناہی تو نہیں ہوا۔ عوام محض لفظی بحث میں پڑ جاتے ہیں اور ذرے ذرے کے علم سے لامتناہی سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اس قسم کا لفظی اختلاف ڈال کر آج کل کے علما اپنے حلوے مانڈے سیدھے کرتے رہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بالقوۃ عالم الغیب ہیں بالفعل نہیں، یعنی یہ کہ ان میں اللہ پاک نے ساری خصوصیات بدرجہ اتم پیدا فرما دی ہیں۔ وقت اور ضرورت کے لحاظ سے وحی کے ذریعہ یا فرشتوں کے ذریعہ یا دل پر القا فرما کر غیب کا اظہار کر دیا جاتا ہے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان مبارک سے کہہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کفار نے کسی بات پر اعتراض کیا اور اس کی وجہ پوچھی یا غیب کی کوئی بات دریافت کی تو کبھی کبھی آپ سکوت فرماتے تھے اور وحی کا انتظار کرتے تھے۔ جب وحی نازل ہوتی تو غیب کا اظہار کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے واقعہ افک میں قریب قریب ایک مہینے پریشان رہے، لوگوں کے طعنے اور تکلیف دہ باتوں کو برداشت کرتے رہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی روتی اور گڑگڑاتی رہیں مگر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک اس معاملے میں کوئی بات نہیں کی جب تک کہ وحی نازل نہ ہوئی اور اللہ پاک نے خود جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی برأت فرما دی۔

اسی طرح اصحاب کہف، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت خضر اور ذوالقرنین وغیرہ کے متعلق جب آپؐ سے سوالات کئے گئے تو وحی آنے پر واقعات کا اظہار کیا گیا۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

اگر کسی درخت کے بیج پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس دانے میں درخت بننے کی صلاحیت ہے۔ اس وقت وہ بالقوہ ہے۔ اگر اسے آپ زمین میں بو دیں اس میں پانی دیں تو کچھ عرصہ میں ایک ننھا سا پودا نکل آئے گا، رفتہ رفتہ وہ بڑا ہوگا پھل پھول دے گا، اس وقت یہ دانہ بالفعل ہوگا۔ اسی طرح اللہ پاک نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں ساری خصوصیات اور

صفات بدرجہ اتم پیدا کردی ہیں۔ بالقوۃ ان میں ہر صفت موجود ہے، بالفعل اس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔

معراج شریف میں اللہ پاک نے انھیں جنت دوزخ کی سیر کرائی، مختلف مقامات پر گناہگاروں پر طرح طرح سے عذاب ہوتے ہوئے دکھائے مثلاً چغلخوروں، جھوٹوں، دھوکے بازوں، دغا بازوں اور منافقوں و کافروں پر عذاب ہوتے ہوئے دکھائے۔ حالانکہ یہ سب حشر کے بعد کی باتیں ہیں لیکن عالم مثال میں موجود ہیں، اللہ پاک نے اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کو ظاہر فرمادیا کہ حشر کے بعد یہ یہ ہونا ہے تاکہ آپؐ امت کو خدا کے عذاب سے ڈرائیں اور جنت کی بشارت دیں۔

رسول پاکؐ نے اللہ پاک کا دیدار عرش پر کیا اور یہ اس لئے صحیح اور ممکن ہے کہ وہ عالم زمان و مکان سے بالا ہے، وہ عالم لامکانیت کا عالم ہے اور مادیت سے پاک ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں یعنی عالم امکان اور مادیت میں تھے اس لئے جلوہ کی تاب نہ لاسکے۔ رسول پاکؐ نے فرمایا کہ میں نے اللہ پاک کا دیدار کیا مگر پھر بھی میرے اور اللہ پاک کے درمیان ایک ہزار پردے حائل تھے۔ جنت کی سب سے بڑی نعمت اللہ پاک کا دیدار ہے۔ اللہ پاک کا دیدار ایک کیفیت ہے جس سے دیکھنے والا لطف اندوز ہو گا، ورنہ مخلوق خالق کو دیکھ سکے یہ اس کی مجال کہاں، اس کی آنکھوں میں یہ قوت کہاں کہ اس کے دیدار کی تاب لاسکے۔ مخلوق آخر مخلوق ہے اور خالق آخر خالق ہے۔ یہ محض اللہ پاک کا کرم ہو گا وہ جس حالت میں اور جس کیفیت میں چاہے گا اپنے بندوں کو دیدار کرادے گا۔

اللہ پاک نے فرمایا کہ وہ مخفی خزانہ تھا، اس نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں اس لئے اس نے کائنات تخلیق فرمائی اور رسول پاکؐ کا نور سب سے پہلے پیدا فرمایا۔ ظاہر ہے کہ جس ذات گرامی کو سب سے پہلے پیدا کیا اس میں اپنی ہر صفت بدرجہ اتم پیدا کی ہو گی۔ کیونکہ انھیں حبیب اور رحمتہ اللعالمین بنانا تھا اسی لئے آپؐ سب نبیوں سے افضل ہیں۔ آپؐ سے ہر صفت اپنے اپنے موقع پر بحکم خدا ظاہر ہوتی رہی۔ اس میں عالم الغیب کی صفت بھی آجاتی ہے، یہ صفت آپؐ میں بالقوۃ موجود ہے اور بالفعل قیامت تک ظاہر ہوتی رہے گی۔ حشر کے دن لوگ پریشان حال ہر نبی کے پاس جائیں گے اور ان سے اپنی سفارش کے لئے درخواست کریں گے مگر کوئی نبی ان کی سفارش کرنے کے لئے تیار نہ ہو گا، صرف ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اذن الٰہی سے گنہگاروں کی

سفارش کریں گے اس وقت ان کی یہ صفت بالفعل ہوگی۔

ارواح کی ملاقات:

میرا خیال یہ ہے کہ ارواح اپنے اپنے علاقے کے لوگوں سے متعارف ہوتی ہیں اور جن سے دنیا میں تعارف نہیں ان سے وہاں کبھی کبھی ملاقات ہو سکے گی۔ فرمایا کہ بزرگوں سے منقول ہے کہ جب کوئی مرتا ہے تو اس کے رشتہ دار یا اس کے سلسلہ کے متعارف لوگ اس کی روح سے یہاں کے دوسرے لوگوں کے حالات پوچھتے ہیں کہ فلاں فلاں کیسے ہیں؟ اور جب کسی کے بارے میں وہ یہ بتاتا ہے کہ وہ تو مجھ سے پہلے وفات پا چکا ہے تو پھر وہ انا للہ پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب وہ ہم میں نہیں آیا تو بری روحوں میں سے ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اپنے بزرگوں کی ارواح کے ساتھ نیاز حاصل ہو سکے گا۔

علماء پر اعتراض:

آج کل بعض حضرات کا یہ ذہن بن گیا ہے کہ قرآن فہمی اور تدبر فی القرآن و احادیث سے احکام استنباط کرنے کی اجارہ داری علماء کرام ہی کو کیوں حاصل ہے۔ حالانکہ ہم نے بھی عربی، فارسی، انگریزی ادب و سائنس، ریاضی، جغرافیہ، قانون وغیرہ علوم حاصل کئے ہیں۔ ہمیں بھی قرآن میں تدبر و تفکر کر کے احکام اخذ کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مذہبی تعلیم کو مستند اساتذہ سے حاصل کرنے والے علماء کو ہے۔ لیکن ان حضرات کی یہ بات عقلاً بھی ٹھیک نہیں کیونکہ ہر فن کے ماہر لوگ الگ الگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا شخص جس نے میڈیکل کالج کی شکل تک نہ دیکھی ہو یہ اعتراض کرنے لگے کہ ملک میں علاج و معالجہ پر سند یافتہ ڈاکٹروں کی اجارہ داری کیوں، مجھے بھی بحیثیت انسان یہ حق ملنا چاہیئے یا کوئی غیر انجینئر شخص یہ کہنے لگے کہ ملک میں نہریں، پل اور بند وغیرہ تعمیر کرنے کے لئے ماہر انجینئروں کو کیوں مقرر کیا جاتا ہے میں بھی ایک شہری کی حیثیت سے اس خدمت کو انجام دینے کا حقدار ہوں یا قانون عدالت سے ناواقف شخص ماہرین قانون کی اجارہ داری پر اعتراض کرے اور اپنا حق جتائے تو ایسے شخص کو جواب میں یہی کہا جائے گا کہ بیشک ایک شہری کی حیثیت سے آپ کو بھی ان تمام کاموں کا حق حاصل ہے لیکن ان کاموں کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے سالہا سال محنت اور دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے اور ماہر استادوں سے ان علوم و فنون

کو سیکھنا پڑتا ہے اور سندیں اور ڈگریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ پہلے آپ یہ زحمت اٹھائیے پھر بیشک آپ ان خدمات کے انجام دینے کا حق جتا سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہی بات قرآن و احادیث کے بارے میں کہی جائے تو اس پر علماء کی اجارہ داری کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ ان حضرات کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے۔

تدبر فی القرآن کے درجات مختلف ہیں اور ہر درجے کا حکم علیحدہ ہے۔ مجتہدانہ تدبر جس کے ذریعہ قرآن حکیم سے مسائل کا استخراج کیا جاتا ہے اس کے لئے اجتہاد کی مبادیات و اصول کا علم حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ وہ مسائل کا صحیح استخراج کر سکے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ظاہر ہے وہ مسائل کا غلط استنباط کرے گا اور علمائے حق اس پر نکیر کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ قرآن مجید کی مثال ایک بحرِ ناپیدا کنار سے دی جا سکتی ہے۔ سمندر میں ہر قسم کا آدمی غوطہ لگا سکتا ہے لیکن ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اس سے فوائد حاصل کرتا ہے۔ جو لوگ سمندر کی اوپر کی سطح کے قریب رہتے ہیں وہ اس سے زیادہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتے کہ اپنے بدن کو تر کر لیں۔ جو شخص سمندر کی گہرائی میں جاتا ہے وہ اس میں سے قیمتی موتی حاصل کرتا ہے۔ اور جو شخص جس قدر زیادہ گہرائی میں جاتا ہے اور غوطہ خوری اور سمندر سے موتی وغیرہ فوائد حاصل کرنے کے ساز و سامان سے آراستہ ہوتا ہے وہ اسی قدر قیمتی موتی اور دوسرے فوائد حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص قرآن فہمی کے ساز و سامان سے جس قدر آراستہ ہوگا وہ اسی قدر اس کے فوائد سے بہرہ ور ہو سکے گا۔

مفتی اور علمائے دین:

پورے قرآن کریم کے معانی و مسائل اور تمام احادیث کو سمجھنا اور ان میں معتبر و غیر معتبر کی پہچان پیدا کرنا، قرآن و سنت سے ثابت ہونے والے احکام و مسائل کا پوری طرح علم حاصل کرنا، صحابہ کرام و تابعین عظام و ائمہ مجتہدین کے اقوال و آثار سے واقف ہونا اور ان سے احکام کا اخذ کرنا اتنا بڑا کام ہے کہ تمام عمر اور سارا وقت اس میں لگا کر بھی پورا حاصل کرنا آسان نہیں ہے اور یہ ہر شخص کے بس کی بات بھی نہیں ہے اس لئے شریعتِ مقدسہ نے اس کو فرض کفایہ قرار دیا کہ اگر کچھ لوگ حسبِ توفیق ان علوم دین کو حاصل کریں اور باقی لوگ اپنی ضرورت کے وقت ان علماء کرام کی طرف رجوع کیا کریں تو باقی مسلمان اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے اور اگر سب ہی لوگ دین کا علم کماحقہ، سیکھنے سے محروم رہیں گے تو سب مسلمان اس فرض

کے تارک اور گنہگار ہوں گے۔

اسلامی نظام میں علماء دین کی فضیلت و امتیاز مسلم ہے۔ یہی وہ مبارک گروہ ہے جو تبلیغ دین و نفاذِ اسلام کی ذمہ داریاں سنبھالنا اور نائب رسول ہونے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہی طبقہ دین کے مختلف شعبوں میں خاص مہارت کے باعث مختلف فرائض پر مامور ہوتا ہے۔ ان میں قاضی، مفتی اور حاکم، رکن رکین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قاضی کا کام عدل و انصاف ہے، مفتی اصول فقہ و قوانین شریعت کا شارح اور فقہی مسائل و احکام کو بیان کرنے والا ہے اور حاکم فیصلوں اور قوانین کو نافذ کرنے پر مامور ہے۔

غور کیجئے تو شارح قانون اور احکام شرع بنانے والے کی ذمہ داری اساسی حیثیت رکھتی ہے جبکہ قاضی و حاکم کے فرائض ضمنی ہیں۔ اس اعتبار سے اسلامی نظام میں مفتی کو ایک خاص امتیازی و انفرادی حیثیت حاصل ہوتی ہے وہ بیک وقت معلم قرآن بھی ہوتا ہے اور محدث بھی، وہ فقیہ بھی ہوتا ہے اور اجتہاد کی بصیرت کا حامل بھی۔ کیونکہ یہ نائب رسول اور پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی وارثت کا حامل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ پیغمبر کی اس صفت کا حامل ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب یعنی قرآن مجید کی تعلیم دیتا اور احکام الہی لوگوں کو پہنچاتا ہے۔ اس لئے مفتی کو قرآن حکیم و احادیثِ مقدسہ اور اسوہء حسنہ کا بہت زیادہ علم ہونا ضروری ہے تاکہ وہ صحیح معنی میں امر بالمعرف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کر سکے۔

حفاظتِ دین:

ہر دور میں علماء و صلحا کی ایک جماعت اس دین کی حفاظت کرتی رہے گی اور اس دین کی حقیقت کو تحریفات و فاسد تاویلات کی دست برد سے محفوظ اور بدعات و ایجاداتِ انسانی کی آمیزش سے پاک رکھے گی اس لئے کہ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی۔ قیامت تک اب کوئی نیا نبی مبعوث نہیں ہوگا اور اس امت کے علماء کو انبیاء بنی اسرائیل کی مانند قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" اور ہر صدی کے سرے پر ایک شخص یا متعدد حضرات ایسے مخصوص انداز کے ساتھ نمایاں ہوں گے کہ دوران صدی میں ان محافظین دین کی کوششوں کے باوجود جو تحریفات و بدعات فی الدین عامۃ المسلمین رواج پا گئی ہوں گی اور جس قسم کی اعتقادی و عملی خامیوں و کوتاہیوں نے مسلمانوں میں اپنا سکہ جمالیا ہوگا وہ

ختم صدی پر مبعوث ہونے والی اس مخصوص ہستی یا ہستیوں کی کوششوں اور تبلیغ و تربیت کے اثرات سے دور ہو کر مسلمانوں کی اعتقادی و عملی زندگی میں دین اسلام از سر نو حیات پذیر ہو جائے گا اور یہی وہ ایک مخصوص شخص یا ایک سے زیادہ مخصوص حضرات ہوں گے جو حدیث تجدید کا خصوصی مصداق ہوں گے۔

احکام شرع کے ماخذ:

احکام شرع کے چار ماخذ ہیں۔ (۱) قرآن مجید، (۲) احادیث۔ ان دونوں کے بارے میں ارشاد نبوی ہے کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور اپنی سنت۔ یہی دونوں، احکام شرع کے اصل ماخذ ہیں۔ باقی دو ماخذ اجتہاد اور اجماع امت ہیں۔ یہ بھی کتاب و سنت ہی سے ماخوذ ہیں۔ مفتی کے لئے ان چاروں ماخذ سے احکام شرع کی تخریج کا ملکہ ہونا ضروری ہے۔ ارباب اصول کی اصطلاح میں اجتہاد اس انتہائی کوشش کو کہتے ہیں جو کسی امر شرعی کے بارے میں جس کے متعلق قرآن و حدیث میں واضح حکم موجود نہ ہو، یہ گمان حاصل کرنے کے لئے صرف کی جائے کہ وہ شریعت کے موافق ہے یا مخالف۔ اس کے لئے کتاب و سنت کا گہرا علم، ذکاوت و ذہانت، معاملہ فہمی اور اخلاص وغیرہ صفات کا ہونا ضروری ہے۔ ہر شخص اجتہاد کا اہل نہیں ہوتا۔

فرقہ بندی کی مذمت:

ہر اختلاف مذموم نہیں بلکہ وہ اختلاف مذموم ہے جس میں اپنی خواہشات و خیالات کی بنا پر قرآن و حدیث سے دور رہ کر سوچا جائے۔ لیکن اگر قرآن مجید پر مجتمع رہتے ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و تفصیل کو قبول کرتے ہوئے اپنی فطری استعداد اور دماغی صلاحیتوں کی بنا پر فروع میں اختلاف کیا جائے تو یہ اختلاف فطری امر ہے اور اسلام اس سے منع نہیں کرتا۔ صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہا کا اختلاف بھی اسی قسم کا اختلاف تھا اور اسی اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اگر انہی فروعی مسائل کی بحثوں کو اصل دین قرار دیا جائے اور ان میں اختلاف کو جنگ و جدل اور سب و شتم کا ذریعہ بنا لیا جائے تو یہ بھی مذموم ہے اور ایسا اختلاف جو فرقہ بندی اور مجادلہ کا باعث ہو اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

جھوٹی گواہی اور جھوٹی قسم:

کسی کا مال ناحق طریقہ سے حاصل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا گناہ کبیرہ اور حقوق العباد کو ضائع کرنا ہے۔ اس پر آخرت میں سخت عذاب ہو گا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسے شخص کی طرف نظر کرم ہرگز نہیں فرمائے گا اور اپنے فضل و کرم کی بارش سے ہرگز اس کو پاک نہیں کرے گا۔ یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے، نہ کسی کا مال و متاع محفوظ رہتا ہے نہ عزت و آبرو بچتی ہے۔ غنڈہ گردی، بد دیانتی اور چھینا جھپٹی عام ہو جاتی ہے۔ امن و امان تہ و بالا ہو جاتا ہے اسی لئے ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معبوض ہوتے ہیں، جھوٹی گواہی دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا کیونکہ اس دنیاوی مقصد کو جس کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم کھاتا ہے وہ اللہ کے برابر قرار دیتا ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا ہے جبھی تو اس کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جھوٹی قسم کھاتا ہے۔ اس سے اس گناہ کی شدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

امانت و دیانت:

جن اچھے اخلاق سے انسان کو متصف ہونا چاہئے ان میں سے امانت و دیانت بھی ہے۔ امانت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور ہر قسم کی امانت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اگرچہ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ امانت سے مراد مال و دولت کی امانت ہے۔ لیکن در حقیقت یہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہر نوع کی ذمہ داری سے متعلق ہے۔ جس طرح ایک تاجر کے حق میں امانت سے مراد لین دین میں راست بازی اور دیانت داری اختیار کرنا ہے۔ اسی طرح اجرت پر کام کرنے والے کے لئے امانت سے مراد مزدور کے حقوق کی صحیح ادائیگی ہے۔ صنعتکار کی امانت اس کی صنعتکاری میں دیانتداری ہے۔ کسان کی امانت پیداوار میں مناسب محنت کرنا اور ملازم کی امانت اپنی ڈیوٹی اور فرائض کو صحیح طور پر ایمانداری سے ادا کرنا ہے۔ حاکم وقت ملک و رعایا کا امین ہے اور اس کی امانت ملک و رعایا کی بہتری کے کام کرنا ہے۔ منصف و جج کی امانت اس کا عدل و انصاف کرنا ہے غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ سے امانت کا تعلق ہے حتیٰ کہ اہل اللہ کی امانت اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں لگانا اور اللہ تعالیٰ کے عطا فرمائے ہوئے کمالات و انعامات کو اپنی طرف منسوب نہ

کرنا بلکہ حق جل سلطانہ، کی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہر طرح سے ناقص اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا امیدوار سمجھنا ہے۔ بحیثیت مسلمان، ہم سب کا فرض ہے کہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض منصبی سے پوری طرح محنت و دیانتداری کے ساتھ عہدہ براہوں اور اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کی تعمیل کر کے امانت کا حق ادا کریں۔

قومی امانت:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہر شخص پر انفرادی طور پر دوسرے لوگوں کے حقوق فرض کئے ہیں مثلاً اولاد پر ماں باپ کے حقوق اور ماں باپ پر اولاد کے حقوق، خاوند بیوی پر ایک دوسرے کے حقوق، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور استاد و شاگرد کے ایک دوسرے پر حقوق فرض کئے ہیں۔ اسی طرح اجتماعی حقوق بھی عائد کئے ہیں جیسا کہ حاکم پر اس کی رعایا کے حقوق اور ہر شہری و دیہاتی پر ملک و قوم کے حقوق۔ ان سب انفرادی و اجتماعی حقوق کے ادا کرنے سے ایک صالح معاشرہ ظہور میں آتا ہے اور ملک میں عدل و انصاف اور امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اجتماعی حقوق ہر فرد بشر پر اسی طرح فرض ہیں جس طرح انفرادی حقوق اور یہ قومی امانت ہیں جن کی ادائیگی کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مکلف بنایا ہے۔

حکومت کے عہدے اور منصب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قومی امانتیں ہیں۔ جن کے امین وہ حکام و افسر ہیں جن کے ہاتھ میں ان عہدوں پر کسی کے تقرر یا ہٹانے کے اختیارات ہیں۔ ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کریں جو اپنی علمی قابلیت یا عملی صلاحیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں بلکہ اس حاکم پر لازم ہے کہ ہر کام اور عہدے کے لئے اپنی حکومت کی حدود میں اس کے مستحق شخص کو تلاش کرے اور اگر پوری اہلیت والا سب شرائط کا جامع شخص کوئی نہ ملے تو موجودہ لوگوں میں قابلیت و امانت داری کے لحاظ سے جو سب سے زیادہ فائق ہو اس کو ترجیح دی جائے۔ بعض احادیث میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اس عہدہ کے لئے اس سے زیادہ قابل اور لائق ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں سے خیانت کی۔

آج دنیا میں جہاں بھی نظام حکومت کی ابتری نظر آتی ہے وہ سب اسلامی تعلیم کو نظر انداز کر دینے اور قومی امانت میں خیانت کرنے کا نتیجہ ہے کہ تعلقات اور سفارشوں اور رشتوں سے

عہدے تقسیم کئے جاتے ہیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نااہل و ناقابل لوگ عہدوں پر قابض ہو کر مخلوق خدا کو پریشان کرتے ہیں اور سارا نظام حکومت برباد ہو جاتا ہے ۔ جس طرح امانت اسی شخص کو ادا کرنی چاہئے جو اس کا مالک ہے کسی فقیر یا مسکین پر رحم کھا کر کسی کی امانت اس کو دینا جائز نہیں یا کسی رشتہ دار یا دوست کا حق ادا کرنے کے لئے کسی شخص کی امانت اس کو دے دینا درست نہیں ہے ۔ اسی طرح حکومت کے عہدے جو قومی امانت ہیں اور جن کے ساتھ عام خلق خدا کا کام متعلق ہوتا ہے ، ان امانتوں کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں جو اپنی قابلیت واستعداد کے اعتبار سے بھی اس عہدے کے لئے مناسب اور موجودہ لوگوں میں سب سے بہتر ہوں اور دیانت و امانت کے اعتبار سے بھی سب سے بہتر ہوں اگر ان کے علاوہ کسی دوسرے کو یہ عہدہ سپرد کر دیا تو یہ امانت میں خیانت ہو گی ۔

رشوت کی مذمت:

رشوت اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کا حق باطل کے لئے یا کسی کے ناجائز مطالبے کو حق ثابت کرنے کے لئے دیا جائے ۔ بعض اوقات رشوت لینے والا حاکم رشوت دینے والے کو مجبور کر دیتا ہے اور اس کے جائز حق کو بھی رشوت لئے بغیر حاصل نہیں ہونے دیتا اور آج کل کے معاشرے میں ایسی رشوت زیادہ عام ہے جو حق دار کو اپنا جائز حق لینے کے لئے مجبوراً دینی پڑتی ہے اس کے لئے رشوت لینے والے کے لئے تو اللہ تعالیٰ کی لعنت ہر حال میں ہے لیکن دینے والے کے لئے گنجائش نکلتی ہے کہ اگر وہ اپنے جائز شرعی حق کے حصول کے لئے رشوت دینے پر مجبور کر دیا جائے تو اس صورت میں رشوت دینے والا اس گناہ سے بری ہو گا اور لعنت کا مستحق نہیں ٹھہرے گا بشرطیکہ وہ اپنے جائز شرعی حق سے ذرا بھی تجاوز نہ کرے ۔

جس معاشرہ میں رشوت عام ہو جائے وہ معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے ۔ تمام معاشرتی برائیاں اس میں جنم لیتی ہیں ۔ ظلم و ستم کا دور دورہ ہوتا ہے ۔ اہل حق کو اپنا حق حاصل کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے ۔ غنڈہ گردی ، قتل و غارت ، چوری وڈاکہ زنی عام ہو جاتی ہے ۔ امن و امان تباہ و برباد ہو جاتا ہے ۔ خوف ذرا باقی نہیں رہتا ، احکام شرع سے کھلم کھلا روگردانی کی جاتی ہے ۔
غرض رشوت ایک ایسی لعنت ہے جو معاشرہ میں ظلم و استبداد کو جنم دیتی ، برائیوں ، بدعنوانیوں کو پرورش کرتی ہے اور عدل و انصاف کا قلع قمع کرتی ہے ۔

رشوت لینے والا ہر وقت خوف میں مبتلا رہتا ہے اور رشوت دینے والا بھی اس خوف میں گرفتار رہتا ہے کہ کوئی دوسرا اس سے زیادہ رشوت دے کر اس کے برخلاف فیصلہ نہ کرا لے۔ اس طرح تمام معاشرہ خوف و دہشت کا شکار رہتا ہے۔ سکون قلب مفقود ہو جاتا ہے۔ دماغی اور ذہنی پریشانی ہر وقت چھائی رہتی ہے۔ اگر کوئی ملازم اپنی تنخواہ کے علاوہ کسی شخص سے ہدیہ تحفہ وغیرہ کے نام سے کچھ لیتا ہے تو یہ بھی رشوت ہے۔ اس سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

مقام شہادت:

اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان قربان کر دینا بہت بڑی سعادت، نہایت بلند مقام اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا بہت اعلیٰ ذریعہ ہے۔ ایسے شخص کو شریعت اسلامی میں شہید کہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ جان دے کر بھی اس کی بندگی کا حق ادا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ جان بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی ہے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا انعام و کرم ہے کہ اس (شہادت) پر بندہ کو نہایت بلند مقام سے نوازتا ہے اور جنت عطا فرماتا ہے۔

اسلامی روایات کی رو سے ہر مرنے والے کو برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ قبر کے عذاب و ثواب کو محسوس کرتا ہے۔ اس میں مومن و کافر اور نیک و بد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن اس برزخی حیات کے کچھ درجات ہیں۔ ایک درجہ تو عوام کو حاصل ہے۔ اس درجہ میں مومن و کافر اور نیک و بد کے مقام میں فرق ہے۔ لیکن شہیدوں کو اس حیات میں دوسرے مردوں سے ایک قسم کا امتیاز حاصل ہے اور وہ یہ کہ ان کی حیات اوروں سے قوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام مردوں کے برخلاف شہداء کے جسم کو زمین نہیں گلاتی بلکہ شہید کا جسم زندہ جسم کی مانند صحیح سالم رہتا ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام و شہداء اور بعض صالحین کے اجسام کو زمین نہیں کھاتی۔ شہداء کی خصوصی زندگی قرآن مجید میں بیان فرمائی گئی ہے۔ انبیاء کرام و صدیقین کا مرتبہ تو شہداء سے بھی بلند تر ہے۔ صدیقین کی برزخی حیات شہداء سے قوی ہے اور انبیاء کرام کی برزخی حیات تو ان سب سے قوی تر ہے۔

شہید کی قسمیں:

شہید تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو شہید کامل ہے۔ اس کو دنیا و آخرت کا شہید اور فقہی شہید بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ فقہ کے لحاظ سے اس پر کفن و دفن وغیرہ کے احکام عام مردوں سے الگ قسم کے ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ثواب وغیرہ کے لحاظ سے وہ دوسرے مردوں پر امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ شہیدِ کامل وہ ہے جو مسلمان ہو اور بے گناہ ظلم کے طور پر قتل کیا گیا ہو اور اس کا قصاص واجب ہو، دیت واجب نہ ہوئی ہو۔ یا اس کو کسی کافر حربی یا ڈاکو نے قتل کر دیا ہو۔ ایسے شہید کو غسل نہیں دیا جاتا ویسے ہی خون سمیت دفن کر دیا جاتا ہے۔ دوسری قسم ناقص شہید ہے۔ اس کے حق میں کفن و دفن کے احکام عام مردوں کی طرح ہیں البتہ وہ آخرت میں شہید کا ثواب پاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص کسی وبا طاعون وغیرہ میں مرے وہ شہید ہے۔ جو پیٹ کے مرض یعنی استسقاء یا اسہال وغیرہ سے مرے وہ شہید ہے۔ جو ڈوب کر یا جل کر مرے وہ شہید ہے جو ذات الجنب یعنی نمونیہ میں مرجائے وہ شہید ہے۔ جو دیوار کے نیچے دب کر مرجائے وہ شہید ہے۔ تیسری قسم شہیدِ دنیا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو دنیاوی غرض کے لئے قتال کرے اور اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی جان دینا نہ ہو۔ اس کو دنیا میں شہید کہا جائے گا اور شہیدوں کی طرح دفن کیا جائے گا لیکن وہ آخرت میں شہادت کے ثواب سے محروم رہے گا۔

شہادت (گواہی) کا مفہوم:

آج کل لفظ شہادت کا مفہوم جو عرف عام میں مشہور ہو گیا ہے وہ صرف مقدمات میں کسی حاکم کے سامنے گواہی دینا ہے۔ مگر قرآن حدیث کی اصطلاح میں لفظ شہادت اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے مثلاً کسی بیمار کو ڈاکٹری سرٹیفکٹ دینا کہ یہ ڈیوٹی ادا کرنے کے قابل نہیں یہ بھی ایک شہادت ہے۔ اسی طرح امتحان میں طلباء کے پرچوں پر نمبر لگانا بھی ایک شہادت ہے۔ اگر جان بوجھ کر یا بے پروائی سے نمبروں میں کمی یا بیشی کر دی تو یہ جھوٹی شہادت حرام و سخت گناہ ہے۔ کامیاب و فارغ التحصیل طلباء کو سند یا سرٹیفکٹ دینا اس بات کی شہادت ہے کہ وہ متعلقہ کام کی صلاحیت رکھتا ہے، جو شخص واقع میں ایسا نہیں ہے اس کو سند یا سرٹیفکٹ دینا جھوٹی شہادت کے حکم میں ہے، جو حرام و سخت گناہ ہے۔ اسی طرح اسمبلیوں اور کونسلوں وغیرہ کے

انتخابات میں کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی ایک شہادت اور قومی امانت ہے جس میں ووٹ دینے والے کی طرف سے اس بات کی گواہی ہے کہ میرے نزدیک یہ شخص اپنی قابلیت و صلاحیت کے اعتبار سے بھی اور دیانت و امانت کے اعتبار سے بھی قومی نمائندہ بننے کے قابل ہے۔ مگر ہمارے عوام و خواص نے اس کو محض ہار جیت کا کھیل سمجھ رکھا ہے، اس لئے ووٹ کا حق کبھی پیسوں کے عوض میں فروخت ہوتا ہے، کبھی کسی دباؤ کے تحت استعمال ہوتا ہے، کبھی ناپائیدار دوستوں اور ذلیل اور جھوٹے وعدوں کے بھروسہ پر اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔

قرض حسنہ:

قرض تین طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق سود کے لینے دینے سے ہوتا ہے۔ یہ اسلام میں جائز نہیں ہے۔ دوسرا وہ جو سود کے لین دین سے بالکل پاک اور قرض لینے والے سے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اور اس کی واپسی کے لئے کوئی مدت بھی معین کر لی جاتی ہے۔ اس کو ادھار بھی کہتے ہیں۔ تیسری قسم کا قرض وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے کسی ضرورت مند کو اس نیت سے دیا جاتا ہے کہ دینے والا شخص لینے والے سے اس کو واپس نہیں لے گا۔ یہ ایک طرح سے اس کو صدقہ کر دینا ہے۔ ایسے قرض کو قرض حسنہ کہتے ہیں۔

قرض حسنہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اس کے بندوں کو خالص نیت کے ساتھ اس طرح دیا جائے کہ ان کو اس کا بالکل مالک بنا دیا جائے اور ان سے کسی بھی وقت واپس دینے کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ و خیرات دینا قرض حسنہ ہے کیونکہ صدقہ کی بھی یہی تعریف ہے کہ آدمی اپنے مال میں سے کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور قرب حاصل کرنے کے لئے حاجتمندوں کو دے خواہ وہ صدقہ فرض واجب ہو جیسے زکوۃ و فطرہ وغیرہ یا نفلی ہو جیسے خیرات وغیرہ۔ یہی نفلی صدقہ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیا جاتا ہے۔ قرض حسنہ ہے۔

اگر کسی شخص کو اتنی ہمت نہ ہو کہ قرض حسنہ دے سکے یعنی واپس نہ لینے کے ارادہ سے مال یا کوئی چیز نہ دے سکے تو اصطلاحی قرضہ یعنی ادھار ہی دے دیا کرے۔ پس اگر ایک معینہ وقت تک واپسی کے وعدے پر قرض دیا جائے تو وہ بھی عموم مجاز کے طور پر قرض حسنہ کے حکم میں داخل کیا جاسکتا ہے کیونکہ اصلی مقصود تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ خواہ دوسرے شخص

کو مالک بنا دینے کے طور پر قرض دیا جائے جو کہ صدقہ کا مترادف ہے یا ادھار کے طور پر، ہو کہ جس کی واپسی کا مطالبہ کیا جاتا ہے ۔ بلکہ بعض بزرگوں کا معمول یہ رہا ہے کہ صدقہ و خیرات تو دیتے ہی تھے کچھ رقم قرض یعنی ادھار دینے کے لئے علیحدہ کر لیتے تھے کیونکہ قرض دینے کی فضیلت صدقہ سے زیادہ ہے ۔

ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ آقائے نامدار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے (معراج میں) جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا کہ قرض میں ایک کے عوض اٹھارہ ملیں گے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ اے جبرائیل! یہ کیا بات ہے کہ قرض کا ثواب زیادہ ہے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ صدقہ تو وہ شخص بھی لیتا ہے جس کو ضرورت نہ ہو اور قرض وہی لیتا ہے جس کی جان پر آبنی ہو، اس لئے ایسے شخص کی امداد کی فضلیت و ثواب زیادہ ہے

معاشی ترقی

آج کل دنیا جس دور سے گزر رہی ہے وہ ترقی کا دور کہلاتا ہے ۔ صنعت و حرفت، تجارت و زراعت وغیرہ ہر معاشی شعبہ میں ترقی کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ بھی نہیں کہ ہر ملک میں ہر شعبہ، آمدنی میں روز و شب پیداواری ترقی ہو رہی ہے ۔ اس کے باوجود ہر ملک اور ہر قوم معاشی بدحالی میں مبتلا ہے اور دن رات کی کوششوں کے باوجود اس بدحالی سے نکلنا مشکل بلکہ ناممکن ہوتا جا رہا ہے ۔ آج کل معاشی ترقی کے لئے دنیا میں تین طرح کے نظام رائج ہیں ۔

سرمایہ دارانہ نظام:

اس کی بنیاد شخصی یا طبقاتی خود غرضی، ذاتی نفع اندوزی اور ارتکاز دولت پر ہے ۔ اس طبقہ کا نظریہ یہ ہے کہ جو لوگ مفلس و نادار ہیں وہ اپنی کم ہمتی و بے عقلی کی وجہ سے ایسے ہیں اس کی ذمہ داری معاشرہ یا حکومت یا سرمایہ داری پر عائد نہیں ہوتی ۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اکثر دولت کی ناجائز لوٹ کھسوٹ ہوتی ہے اور دولت و معاش کے وسائل سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ میں محدود ہو جاتے ہیں ۔ وہ لوگ دن رات عوام کا استحصال کرنے میں مشغول رہتے ہیں ۔

اشتراکی نظام:

یہ نظام سرمایہ داری ذہن کے خلاف اس کے شدید رد عمل کے طور پر ظہور میں آیا۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ افلاس ایک ایسی لعنت ہے جو ارباب وسائل و اسباب نے محرومین پر مسلط کر رکھی ہے۔ اس لئے آزادانہ معاشی مسابقت اور شخصی ملکیت کو ختم کر دیا جائے۔ تمام افراد مل کر مملکت کے لئے کمائیں اور مملکت ان کی ضرویات کی کفیل ہو۔ اس نظام نے ایک ایسا معاشرہ جنم دیا جس میں بظاہر افلاس نظر نہیں آتا لیکن حقیقت میں پورا معاشرہ مفلس و غلام ہوتا ہے۔ صرف چند ارباب اقتدار جو اس انقلاب کے بانی ہوتے ہیں ملک پر مسلط ہوتے ہیں اور عوام ان کی کرم نوازی کے محتاج ہوتے ہیں۔ معاشی ترقی سے کسی کو کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہوتی۔ صرف تشدد کے ذریعہ عوام سے کام لیا جاتا ہے اور ملک کی خوشحالی کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔

اسلامی معاشی نظام:

یہ وہ نظام ہے جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ چونکہ یہ نظام اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ ایک انتہائی متوازن، جامع اور مکمل نظام ہے۔ اس میں ہر زمانے کے لئے تمام دنیا کی معاشی بہبود و ترقی کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس نظام میں جس طرح مزدور کے مفادات کی حفاظت کی گئی ہے اسی طرح سرمایہ داری کے حقوق کی حفاظت کی بھی ذمہ داری لی گئی ہے۔ جس طرح کاشتکار کے حقوق کو زمیندار کے لئے عبادت قرار دیا ہے۔ اسی طرح زمیندار کے حقوق کو پورا کرنا کاشتکار کے لئے نیکی قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی معاشی نظام حاکم و محکوم، زمیندار و کاشتکار، مزدور و سرمایہ دار، ہر طبقہ اور ہر گروہ کے مفادات کو آپس میں ٹکرانے کی بجائے انسانیت کی بنیاد پر تمام طبقات کی حفاظت کرتا ہے اور انہیں ایک جسم واحد کے اعضاء کی طرح مل جل کر کام کرنے اور ایک ٹیم کی طرح میدان عمل میں اسپورٹس مین اسپرٹ کے ساتھ متحد ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔

معاشی بدحالی:

آج کل مہنگائی نے اپنا تسلط جمایا ہوا ہے۔ غلط ذرائع سے آمدنی بڑھانے کا رجحان عام ہے۔ عیش پرستی، ظاہری آرائش اور نمود و نمائش کو مقصد زندگی بنا لیا گیا ہے۔ قانون الہیٰ سے غفلت

عام ہے ۔ لوگ ایک دوسرے کے استحصال میں سرگرم ہیں ۔ زندگی بد اخلاقیوں کی آماجگاہ بن چکی ہے ۔ طبیعتیں اعلیٰ اخلاق سے متنفر اور بد اخلاقی سے مانوس ہو گئی ہے ۔ دنیا کے ہر خطہ میں معدود چند افراد کے سوا سب ہی لوگ اس غلط معاشی بحران میں مبتلا ہیں ۔ اس کے باوجود بعض لوگ اس کا حل سرمایہ دارانہ نظام میں تلاش کرتے ہیں جو دولت کی ناجائز لوٹ کھسوٹ کا محرک اور عوام کے استحصال کا باعث ہے اور بعض لوگ اس کا حل اس نظام میں تلاش کرتے ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے رد عمل کے طور پر وجود میں آیا ۔

اسلامی معاشی نظام کے بنیادی اصول:

اسلام نے جو معاشی نظام دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس کے کچھ بنیادی اصول ہیں ۔ مثلاً یہ کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے ۔ مگر یہ سب کچھ انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے جو مال و متاع اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا ہے اس کے متعلق حکم ہے کہ اس کو اپنی بہتری کے لئے بھی خرچ کرو اور اس میں سے اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرو ۔ زمین پر بسنے والے ہر جاندار کی روزی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جاندار خواہ وہ پتھر کے اندر رہتا ہو یا سمندر کی تہہ میں ہو یا فضا میں اڑتا پھرتا ہو کبھی بھوکا نہیں رہتا حالانکہ وہ انسانوں کی طرح اسباب معاش کا ذخیرہ نہیں کرتے ۔ جو کچھ بحر و بر و خلا اور آسمان میں موجود ہے سب اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے ۔ وہ کسی کو زیادہ دیتا ہے کسی کو کم دیتا ہے ایک کو دوسرے پر مالی و معاشی برتری و فضیلت ہونا ایک فطری امر ہے ۔ اس سے کارکردگی کا جذبہ ابھرتا ہے ۔ لیکن ان کے اموال میں کم درجہ والوں کا بھی حصہ مقرر فرمادیا ہے ۔ اگر رزق کے وسائل سب کو برابر تقسیم کر دیئے جائے تو کوئی کسی کے کام نہ آتا اور یہ دولت و ثروت وبال جان بن کر رہ جاتی ۔ اسلام اسباب معاش کی بنا پر کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں دیتا بلکہ بزرگی کا معیار دیانت اور تقویٰ کو قرار دیتا ہے ۔ ایک دوسرے کا اکرام لازم کرتا ہے ۔ اسلامی معاشی نظام میں تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے کیونکہ تجارت سے مال بڑھتا ہے اور ہر طبقہ میں تقسیم ہو جاتا ہے ۔ اس کے برعکس سود سے مال سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے قبضہ میں چلا جاتا ہے ۔

دولت کا مصرف:

انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے اور فطری طور پر معاشی و معاشرتی نظام میں منسلک ہے۔ دولت کمانا اور اس کو خرچ کرنا اس کا فطری عمل ہے۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اس نے انسان کو دولت کمانے اور اس کو خرچ کرنے کے صحیح اصول اور کامیاب طریقے تعلیم فرمائے ہیں۔ یوں تو دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کا نظام معیشت و معاشرت سب سے اکمل اور احسن ہے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ ان کا یہ دعوی بے دلیل اور سراسر حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ یہ سب نظام انسان کے اپنے بنائے ہوئے ہیں اور چند مختلف ذہنوں کی ایجاد ہیں۔ اس لئے انہوں نے انسان کو خوشحالی اور امن و امان کی بجائے بدحالی و بدامنی میں مبتلا کیا ہے۔ لیکن اسلام نے جو معاشی و معاشرتی اور اقتصادی نظام انسان کو دیا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل فرمایا ہے۔ اس لئے یہ نظام انسان کے ہر طبقہ کی خوشحالی اور امن وامان کا ضامن اور ہر شخص کی ضروریات و مفادات کا کفیل ہے۔ جس طرح دولت کمانے کے لئے بیع و شراء، زراعت و صنعت وغیرہ کے لئے رہنما اصولوں کی تعلیم دی ہے اور ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، ملاوٹ، کم تولنے، کم ناپنے کی ممانعت اور مزدور کا حق بروقت ادا کرنے اور معیاری سامان تیار کرنے وغیرہ کی سخت تاکید فرمائی ہے اور عدل و انصاف، دیانت و ایفائے عہد، سچائی اور خوش اخلاقی، صلح و بردباری وغیرہ اوصاف حسنہ کی تربیت دی ہے اسی طرح دولت کے مصارف کو بھی نہایت واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔

اسلام انفرادی ملکیت کا احترام کرتا ہے۔ حلال مال کے رکھنے اور اس کے خرچ کرنے کے صحیح طریقے سکھاتا ہے اور جاہلیت کی اس رسم کو مٹاتا ہے جس میں لوگوں کے اموال میں غریبوں، مسکینوں اور دوسرے حق داروں کے لئے کوئی حصہ نہیں رہتا تھا۔ حق تعالیٰ تمام مخلوق کا پروردگار ہے۔ انسان کے مخلوق خدا ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کو اس کی ضروریات کا پورا پورا علم ہے اور وہ اس کے حقوق متعین فرمانے میں خاندانی و طبقاتی امتیاز کو روا نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں دولت کی تقسیم کا بہت بڑا حصہ جو انسان کی فطری و اصلی ضروریات پر مشتمل ہے۔ اس کی تقسیم کے احکامات نازل فرمائے ہیں اور اس طرح تقسیم فرمائی ہے کہ اس سے ہر طبقہ اور ہر خطہ اور ہر ضعیف و قوی یکساں فائدہ اٹھا سکے۔ اور اس دولت کی

ملکیت اس تقسیم کی بدولت مختلف طریقوں اور ذرائع سے دوسری طرف منتقل ہوتی رہے۔ اگر لوگ اس تقسیم الہٰی کے مطابق اپنی دولت کو اس کے مصارف شرعیہ میں خرچ کرتے رہیں اور اس کی گردش پورے انسانی معاشرے میں خاطر خواہ ہوتی رہے تو کوئی انسان ننگا بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ فرمایا کہ مال کے مصارف جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں یہ اس لئے ہے تاکہ یہ مال تمہارے مالداروں اور تونگروں میں گردش کرنے والی دولت نہ بن جائے۔

اسلامی قانون نے ایک طرف تو شخصی ملکیت کا احترام کیا ہے کہ ایک شخص کے مال کو اس کی جان کی برابر اور اس کی جان کو بیت اللہ کی حرمت کی برابر قرار دیا اور اس پر کسی کے ناجائز تصرف کو شدت کے ساتھ روکا اور جو ہاتھ ناجائز طور پر اس مال کی طرف بڑھا وہ ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ دوسری طرف جو دولت کسی کے پاس جائز طریقوں سے جمع ہوئی ہو اس میں غریبوں اور فقیروں کے حقوق، زکوۃ، عشر، صدقہ فطر اور کفارات وغیرہ، فرائض و واجبات کی صورت میں مقرر فرمادئے اور اس سے زائد رضاکارانہ طور پر حسب توفیق و ہمت دینے کا حکم دیا اور ان سب اخراجات اور حقوق کی ادائیگی ہر سال کرتے رہنے کے بعد جو کچھ کسی شخص کے مرنے کے وقت تک باقی رہ گیا اس کو ایک خاص حکیمانہ اصول کے مطابق تقسیم کرادیا اور اسی مرنے والے کے قرابت داروں کو اس اصول کے مطابق اس کا حق دار بنادیا کہ سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار کو سب سے پہلے پھر اس کے بعد والے کو اور پھر اس کے بعد والے کو ملے۔ اس میں فقراء کا حصہ مقرر نہیں فرمایا لیکن صاحب مال کو اس کے متعلق وصیت کرنے کا حق دے دیا ہے۔ اس میں غالباً یہ حکمت ہے کہ اس کے قریبی رشتہ داروں کو ملنے کی صورت میں ہر شخص کے دل میں اپنی اولاد و دیگر قریبی رشتہ داروں کے لئے بچت کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا۔ اگر ترکہ کا مال غریبوں اور فقراء میں تقسیم کرنے کا حکم ہوتا تو انسان طبعی طور پر اپنے مال کو اپنے مرنے سے پہلے ہی خرچ کرکے فارغ ہونے کی کوشش کرتا اور جا و بے جا خرچ کرنے سے دریغ نہ کرتا۔

اسلام کا یہ تقسیم دولت کا نظام ایسا حکیمانہ و عادلانہ ہے کہ جس سے دولت سمٹ کر چند افراد میں رک کر نہیں رہ جاتی اور نہ ہی کسی فرد کو اس کی محنت کا پھل ملنے سے محروم کرتا ہے۔

تجارت کے اصول:

اللہ تعالیٰ نے روزی کمانے کے مختلف اسباب پیدا اور مہیا فرمائے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی پیشہ کو اختیار کرکے روزی کمانا اور اپنے ہاتھ کی کمائی مثلاً صنعت و حرفت یا تجارت وغیرہ سے

روزی حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت پسندیدہ بات اور انبیائے کرام و صلحائے عظام کا معمول ہے ۔ کسی پر خوامخواہ بوجھ نہیں بننا چاہیئے اور کسی پیشہ کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے ۔ سب پیشے اچھے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے تجارت میں بہت برکت عطا فرمائی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو مسلمانوں کے لئے حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ تجارت کا پیشہ اختیار کرو کیونکہ دس حصوں میں سے نو حصے رزق تجارت میں ہے ۔ یعنی تجارت بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہے اس لئے اسے اختیار کرو ۔

شریعت اسلامی نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تجارت کے لئے بھی بہت سے رہنما اصول تعلیم فرمائے ہیں تاکہ لوگ اس کے منافع سے صحیح طور پر بہرہ ور ہو سکیں اور تجارتی کاروبار محفوظ طریقہ پر ہمیشہ جاری رہ سکے ۔ کسی چیز کو کسی مال یا چیز کے بدلے میں خرید و فروخت کرنا تجارت کہلاتا ہے ۔ جب کسی شخص نے کہا کہ میں نے یہ چیز اتنے داموں میں تمہارے ہاتھ بیچ دی اور دوسرے نے کہا کہ میں نے خرید لی تو وہ چیز فروخت ہو گئی ۔ جس نے اس کو خریدا ہے وہ اس کا مالک ہو گیا ۔ اب بیچنے والے کو یہ اختیار نہیں رہا کہ اس کو نہ دے اور نہ لینے والے کو اختیار ہے کہ نہ لے اور یہ حکم اس وقت ہے جبکہ دونوں طرف سے بات چیت ایک جگہ بیٹھے بیٹھے ہوئی ہو البتہ اگر وہ چیز عیب دار ہو تو خریدار کو اختیار ہے کہ وہ اس چیز کو رکھے اور سودا باقی رکھے یا واپس کرکے سودا ختم کر دے ۔ اب بیچنے والے کی رضامندی کے بغیر عیب کے عوض میں دام کم کرکے رقم دینا درست نہیں ہے ۔ اگر بیچنے والے نے پہلے سے عیب بتا دیا یا یہ کہہ دیا کہ خوب دیکھ بھال لو ، بعد میں میں ذمہ دار نہیں ہوں اور خریدار نے رضامندی سے خرید لیا تو اب اس کا پھیرنا (واپس کرنا) جائز نہیں ۔ البتہ بیچنے والا خوشی سے واپس لے لے تو درست ہے ۔ اگر خریدتے وقت یہ کہا کہ ایک یا دو یا تین دن تک ہم کو لینے یا نہ لینے کا اختیار ہے تو یہ شرط کرنا جائز ہے اور اس کو تین دن کے اندر اندر پھیر دینے کا اختیار ہو گا اس کے بعد نہیں ۔ تین دن سے زیادہ کی شرط کرنا درست نہیں ۔

شریعت کا حکم ہے کہ خرید و فروخت میں صاف صاف بات کرنی چاہیئے ، کوئی گول مول بات نہ ہو کہ جس سے آگے چل کر جھگڑا پیدا ہو سکتا ہے ۔ چیز کی نوعیت ، قیمت ، جگہ وغیرہ صاف صاف بیان ہونی چاہیئے ۔ اگر سکہ مختلف قسم کا رائج ہو تو اس کی بھی وضاحت ہونی چاہیئے ۔

تجارت کا اصول یہ ہے کہ تاجر ہمیشہ سچ بولنے والا ہو ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے کہ جو تاجر قول و فعل میں بہت سچا اور برتاؤ میں بڑا امانت دار ہو گا وہ قیامت کے روز انبیاء و صدیقین و شہداء کے ساتھ ہو گا۔ قیامت کے روز ان بزرگوں کی معیت اور ان کے جھنڈے کے نیچے جگہ ملنا بہت بڑی سعادت اور دوزخ سے نجات کا ذریعہ ہے۔

جن رہنما اصولوں کی طرف شریعتِ اسلامیہ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ناپ تول میں صحیح معیار قائم رکھا جائے۔ اسی طرح مال میں کھوٹ ملانے اور دغا و فریب کرنے سے بھی منع فرمایا ہے مال بیچتے وقت زیادہ قسمیں کھانے سے بھی منع کیا گیا ہے کیونکہ زیادہ قسمیں کھانے سے مال تو خوب بک جاتا ہے لیکن انجام کار وہ برکت کو کھو دیتا ہے۔ حرام چیزوں کی خرید و فروخت بھی شرع نے حرام قرار دی ہے۔ حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ذخیرہ اندوزی:

شرع میں احتکار اس کو کہتے ہیں کہ غلہ کو اس نیت سے روک کر ذخیرہ اندوزی کرنا کہ جب اس کے دام بہت زیادہ اونچے ہو جائیں اس وقت اسے بیچا جائے اور ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ غلہ کی مصنوعی قلت پیدا کر کے لوگوں کو مہنگا خریدنے پر مجبور کیا جائے۔ اس قسم کے تاجر دراصل ملک کے باشندوں کی ضرورت و مجبوری سے فائدہ اٹھا کر خود غرضانہ اقدام کرتے ہیں، جسے معاشرے میں ہرگز برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی ذخیرہ اندوزی کو شرع نے حرام قرار دیا ہے۔ لیکن جو چیزیں غذا و خوراک نہیں ہیں ان کو روکنے اور ذخیرہ کرنے کی ممانعت نہیں ہے اور ان کو روکنا حرام نہیں۔ اگر کسی کی زمین کی پیداوار سے غلہ آیا ہو یا سستے وقت میں اناج خرید کر رکھا اور گرانی کے وقت میں بیچا تو یہ احتکار نہیں اس لئے یہ حرام و منع نہیں بلکہ یہ شرعاً جائز تجارت ہے۔

رزق حلال:

یہ دنیا عالم اسباب ہے اس لئے روزی کمانے کے لئے بھی اسبابِ ضروری کو اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ پس جو شخص کوئی کسب کرنا اختیار کرے تو اس کو اس کاروبار میں حلال طریقے کو اختیار کرنا اور حرام سے بچنا فرض ہے اور ہر پیشہ و ہنر میں احکام شرعی کی رعایت ضروری ہے کہ کسب کو ظاہری اسباب میں سے جانے اور رازق مطلق اللہ تعالیٰ کو سمجھے، کسب کو رازق نہ سمجھے

کیونکہ یہ شرکِ خفی ہے۔ کسب کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کرے۔ احادیث میں حرام مال کمانے والوں کے لئے سخت وعید آئی ہے۔ اگر حرام کھانے والا شخص مومن ہے اور اس نے مرنے سے پہلے اپنے اس گناہ سے توبہ نہ کی اور اہل حقوق کے حقوق ان کو ادا نہ کئے یا ان سے معاف نہ کرائے تو وہ اس گناہ کی وجہ سے دوزخ میں جائے گا اور جب تک اس کی سزا نہیں بھگت لے گا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ پس جو کسب مشتبہ ہو اس سے بچنا ضروری اور اولیٰ ہے۔ اگر حلال مال میں تھوڑا سا حرام مال مل جائے تو وہ سارا حلال مال مشتبہ ہو جائے گا اس لئے اس کی بھی احتیاط کرنی چاہیئے۔ افعال و اقوال میں سے جو چیز دل کو شک میں ڈالے اس کو چھوڑ دینا چاہیئے اور جس سے دل میں شک پیدا ہو اس کو اختیار کرنا چاہیئے کہ شک ہونا اس کے باطل ہونے کی دلیل ہے اور شک نہ ہونا اس کے حق ہونے کی علامت ہے۔

تجمل و تنعم:

تجمل و تنعم میں بڑا فرق ہے۔ تجمل خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے لیکن اگر تجمل میں غلو کیا جائے تو تنعم شروع ہو جاتا ہے اور اگر تجمل میں کمی جائے تو راہبانہ زندگی کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ شریعتِ مقدسہ نے تجمل اور اس میں افراط و تفریط کے لئے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی بلکہ ہر شخص کے ضمیر پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق اس کا تعین خود کرلے اور اپنی چادر کے مطابق اپنے پاؤں پھیلائے۔ کھانے پینے، پہننے اور صدقہ و خیرات وغیرہ میں اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہیئے اور نہ یہ اس طرز و وضع قطع کے ساتھ ہو جس میں تکبر بار یا وسمعہ کی آمیزش ہو۔

سادگی انسان کا زیور ہے اس میں راحت ہے۔ سادہ زندگی بسر کرنے والا شخص بہت سے گناہوں سے بچا رہتا ہے۔ اس کے برعکس تنعم اور عیش پسندانہ زندگی گزرانے والا شخص تکلیف میں رہتا ہے اور اس سے بہت سے گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے۔ سادگی میں تواضع و خاکساری ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ صفت ہے اور عیش پسندی میں غرور و تکبر پیدا ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ سادگی تکلف سے بری ہے اور تنعم میں تکلف پایا جاتا ہے اور تکلف میں سراسر تکلیف ہے۔ اسلام خوش پوشی خوش خوراکی اور زینت سے نہیں روکتا لیکن اس ذوق میں حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔

باب پنجم:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور تصوف

ولی کی صفات:

جب کسی بندہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا رابطہ و تعلق قوی طور پر قائم ہو جاتا ہے تو اس بندہ کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو جاتا ہے کہ دنیا کی کسی چیز کی محبت اس تعلق پر غالب نہیں آتی۔ ماں، باپ، اہل و عیال، بھائی، بہن، خویش و اقارب، دوست و احباب، مال و دولت اور جاہ و مرتبہ غرض یہ کہ جس سے بھی وہ محبت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کرتا ہے اور جس سے نفرت کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کرتا ہے۔ اس کے حب و بغض اور محبت و عداوت میں اس کے نفس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی میں مشغول رہتا ہے۔ وہ ہر اس کام کو کرتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور ہر اس کام سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہو۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح میں اسی کو مقام فنا سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ حالت ذکرِ الٰہی کی کثرت اور طاعتِ الٰہی پر ہمیشگی سے حاصل ہوتی ہے۔ جس شخص میں یہ دو وصف ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے اور خاص قربِ خداوندی سے مشرف ہو جاتا ہے۔

درجۂ ولایت:

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں اور آپ کی سنت کا کامل اتباع کرتے ہیں اور ان کی بیعت و محبت کا سلسلہ اپنے بزرگوں کے واسطے سے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہوتا ہے، ایسے ہی بزرگوں کی محبت و مجالست کی کثرت اور ان کے ارشادات کی پیروی و اطاعت اور مسنون

طریقے پر اللہ تعالیٰ کے ذکر کی کثرت سے قربِ خداوندی یعنی ولایت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

تصوف:

اگلے بزرگوں نے اس خیال سے کہ مدعیوں کو خبر نہ ہو، تصوف کی اصطلاحات وضع کی تھیں اور ان اصطلاحات کی وجہ سے فن تصوف ایک پیچیدہ فن بن گیا۔ عرصہ سے میرا یہ خیال ہے کہ اب انہی اصطلاحوں کی وجہ سے مدعی لوگ اپنا جال پھیلاتے ہیں اس لئے ان اصطلاحات کو ترک کر کے سیدھے سادے طریقے سے بتانا چاہئے کہ تصوف کیا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ علی میاں کی لکھی ہوئی حضرت مولانا فضل الرحمن صاحبؒ گنج مراد آبادی کی سوانح کھولی تو اس پر نظر پڑی کہ کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ فنافی الرسول کیا ہے تو انھوں نے فرمایا کہ جب طبعی طور پر سنت کی اتباع ہونے لگے تو یہ فنافی الرسول ہے۔ اسی طرح کی سیدھی اور صاف باتیں لوگوں کو بتانا چاہئے ورنہ فنافی الرسول کی اصطلاح کی آڑ لے کر لوگ نہ جانے کیا کیا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اتباع سنت کہنے کو تو صرف دو لفظ ہیں لیکن عمر صرف کر دو تو بھی علمی اور عملی اعتبار سے سنت کے کمال تک پہنچنا دشوار ہے۔ حضرت مجدد صاحبؒ نے اتباع سنت کے سات درجات بیان کئے ہیں اور عوام اور اصحابِ ظواہر جس کو اتباع سنت کہتے ہیں اسے اتباع سنت کا صرف پہلا درجہ لکھا ہے

سالک کو پہلے فنافی الشیخ حاصل ہوتی ہے پھر فنافی الرسول پھر فنافی اللہ۔ فنافی الشیخ شغل رابطہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم نہ تو شغل رابطہ کا انکار کرتے ہیں اور نہ اس صورت کو درست سمجھتے ہیں کہ شیخ کی تصویر سامنے رکھے حتیٰ کہ نماز میں بھی شیخ کی تصویر سامنے ہو۔ ہمارا طریقہ افراط و تفریط کے درمیان ہے۔ یعنی سالک جب یہ اطمینان کر لے کہ میرا شیخ متبع سنت ہے تو پھر ہر وقت اس کا تصور کرے کہ وہ اس طرح نماز پڑھتا ہے، اس طرح اٹھتا بیٹھتا اور کھاتا پیتا اور پہنتا ہے اور پھر چونکہ وہ کام سنت کے مطابق ہوتے ہیں اس لئے خود بھی اسی طرح کرے بلکہ اس تصور کی پختگی سے سالک خود بخود اپنے شیخ کی طرح اعمال کرنے لگتا ہے۔ اور مطلقاً تصور میں کوئی قباحت نہیں اس کا جواز ثابت ہے۔ حدیث میں ہے گویا کہ میں ایک نبی کو قبر میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کی قوم نے انھیں خون آلود کر دیا تھا اور وہ بارگاہِ خداوندی میں قوم کے لئے معافی کی درخواست کر رہے تھے کہ لوگ مجھے جانتے نہ تھے۔ تصور کا جواز تو ثابت ہی ہے لیکن اس اصول کے تحت کہ جو

چیز عبادت میں معین ہو وہ بھی عبادت بن جاتی ہے۔ اگر تصورِ شیخ سے اتباع سنت و اتباع شریعت پیدا ہو تو یہ مستحب کے درجہ میں ہوگا۔ تصورِ شیخ کے کمال کے نتیجہ میں جسے فنافی الشیخ کہتے ہیں فنافی الرسول کی نوبت آتی ہے، اس مرحلہ پر شیخ درمیان میں نہیں رہتا بلکہ اگر سالک کو تحقیق ہوتی ہے کہ اس کے شیخ کا فلاں عمل سنت کے خلاف تھا تو وہ شیخ کے عمل کو چھوڑ کر سنت کی اتباع کرتا ہے جیسا کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ تشہد میں انگلی کیوں اٹھاتے ہیں حالانکہ آپ کو حضرت مجددؒ سے اتنی محبت ہے اور حضرت مجددؒ انگلی نہ اٹھاتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ میرے نزدیک یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انگلی اٹھایا کرتے تھے۔ جب فنافی الرسول حاصل ہو جائے تو پھر فنافی اللہ حاصل ہو جاتی ہے اس لئے کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء ۴، آیت ۸۰)۔ (جس نے رسول کی اطاعت کی تو گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی) اور وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی (النجم آیت ۳، ۴) (وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ ان کا ارشاد صرف وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے)۔ گویا تصور شیخ اور اس کے نتیجہ میں اتباع شیخ دراصل اتباع رسول اور اتباع خدا کا ذریعہ ہے۔

تصوف میں افراط و تفریط:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیشہ سے دنیا کا یہ دستور چلا آرہا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں کچھ لوگ حق کے ساتھ ناحق، صحیح کے ساتھ غلط اور جائز کے ساتھ ناجائز کو خلط ملط کرتے رہتے ہیں اور عوام الناس کو اس اندھی اور گمراہ کن تقلید میں پھنسا کر اپنا الو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ تصوف بھی ایسے لوگوں کے غلط ہتھکنڈوں سے نہ بچ سکا، اور اس میں بھی مختلف ادوار میں خلط مبحث کا سلسلہ جاری رہا لیکن ہر زمانہ میں اہل حق صوفیائے کرام قدس اللہ اسرارہم حق و ناحق، صحیح و غلط اور جائز و ناجائز کو ایک دوسرے سے جدا کرتے اور عوام و خواص کی صحیح رہنمائی کا اہم فریضہ انجام دیتے رہے ہیں جیسا کہ امام غزالی، شیخ شہاب الدین سہروردی، داتا گنج بخش علی الجویری، خواجہ بہاء الدین نقشبندی بخاری، شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین اجمیری، خواجہ نظام الدین دہلوی، حضرت مجدد الف ثانی، خواجہ محمد معصوم سرہندی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ غلام علی دہلوی وغیرہ حضرات قدسنا اللہ تعالیٰ باسرارہم کی تصنیفات سے یہ بات اظہر من الشمس ہے اور ہمارے قریب کے زمانے میں بھی

مولانا رشید احمد گنگوہی و مولانا اشرف علی تھانوی قدس اسرار ہم نے تصوف کے مسائل کو منقح و منقی کرنے میں کمال درجے کی محنت کی ہے اور آپ خوب واقف ہیں کہ فقہا و محدثین کے شانہ بشانہ صوفیائے کرام نے بھی تصوف میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعامل کو بنیاد قرار دے کر اور ان کے نقش قدم پر چل کر منفرد آراء کو رد کر دیا اور تصوف میں بھی مسلک جمہور قائم کیا اور اس کو اعتقاد و عمل کی بنیاد ٹھہرایا۔ آج بھی اہل حق صوفیہ کے ہاں تنقیح کا عمل مسلسل جاری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں رطب و یابس صحیح و غلط اور حق و ناحق کو خلط ملط کرنے والوں کی کثرت ہے اس لئے تنقیح و تنقیہ کے عمل کی ضرورت فی زمانہ شدید تر ہو گئی ہے۔ تاہم اہل حق اب بھی موجود ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے اور یہ انتہائی انحطاط کا دور ہے لیکن حقیقت و اصلیت کے وجود سے اب بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، اصل موجود ہے۔ جبھی تو اہل نقل بھی نقلی چیز کو اصلی چیز کے مشابہ بنا کر اور اس کو اصلی کہہ کر دن رات اس کی ترویج میں لگے ہوئے ہیں اور عوام الناس اصل و نقل میں تمیز نہ کرسکنے کے باعث نقل پر فریفتہ رہتے ہیں۔ عام لوگ بلکہ بہت سے ایسے لوگ بھی جو خواص متصور ہوتے ہیں تصور کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں اور غلط مقصد متعین کر کے غلط چیزوں کو معیارِ تصوف و کمال قرار دیتے اور فضلوا و اضلوا کا مصداق ہوتے ہیں۔

چوں ندانند حقیقت رہِ افسانہ زدند

محققین کے نزدیک تصوف احسان کا دوسرا نام ہے اور تحصیل احسان کا حکم مشہور حدیث جبرئیل علیہ السلام سے ثابت ہے۔ اس بارے میں علمائے کرام و صوفیائے عظام کا اتفاق ہے اور یہ دونوں گروہ اس بات کو مانتے ہیں کہ شریعت کے تین جزو ہیں: علم، عمل اور اخلاص، جب تک یہ تینوں جزو متحقق نہ ہوں شریعت متحقق نہیں ہوتی۔ طریقت و حقیقت جن کے ساتھ صوفیائے کرام ممتاز ہیں اخلاص کے کامل کرنے میں شریعت کے خادم ہیں، ان دونوں کے حاصل کرنے سے مقصود شریعت کی تکمیل ہے نہ کہ شریعت کے سوا کوئی اور امر، احوال و مواجید اور علوم و معارف جو صوفیائے کرام کو اثنائے راہ میں حاصل ہوتے ہیں۔ وہ اصلی مقاصد میں سے نہیں ہیں، مقصودِ اصلی اخلاص کی تکمیل ہے جو مقام رضا کے حاصل ہونے کے لئے ضروری ہے۔

اخلاص شریعت کا جزو اعلیٰ ہے۔ صوفیائے کرام اخلاص کے حصول ہی کے لئے کوشش کرتے اور کراتے ہیں اور کمال اخلاص کا حصول کمال انسانی کا انتہائی درجہ ہے، اخلاص کے بہت

سے درجے ہیں، سب سے کامل اخلاص وہ ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کو حاصل ہے، اس کمال کو کوئی غیر نبی نہیں پہنچ سکتا۔ مثال کے طور پر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی پیری کی اولاد اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کو اللہ جل شانہ کے حکم سے اس کی راہ میں قربان کرنے کے لئے لٹایا اور چھری ان کی گردن پر چلائی تو جس اخلاص کا مظاہرہ ان دونوں باپ بیٹے (علیہا السلام) سے ظہور میں آیا اس کی مثال کسی غیر نبی میں نہیں مل سکتی۔ اسی طرح اولیائے کرام کا اخلاص دوسرے لوگوں سے کامل ترین ہوتا ہے اور ان میں بھی صحابہ کرامؓ کا اخلاص خصوصاً خلفائے راشدین و عشرہ مبشرہ و السابقین الاولین کا اخلاص جس درجے کا تھا اس کی مثال کسی غیر صحابی ولی میں نہیں ملے گی۔ اسی اخلاص کے کمال کے اعتبار سے اولیائے کرام حتیٰ کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی فرق مراتب ہوتا ہے اور اسی کمالِ اخلاص کے حصول کے لئے صوفیائے کرام محنت کرتے اور کراتے ہیں۔ یہی تصوف کا مقصدِ اصلی ہے اور یہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کوئی شخص اپنے نفس کو شریعتِ مقدسہ کے احکامات کے مقابلے میں مٹا دیتا ہے یعنی اپنے نفس کو شریعت مقدسہ کے تابع بنا دیتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے لا یؤمن احدکم حتی یکون ہواہ تبعا لما جئت بہ۔ ولنعم ما قیل۔

ہیچ کس را تانہ او گردد فنا   نیست رہ دربار گاہِ کبریا

نیز دیگرے چہ خوش گفت۔

تو مباش اصلا کمال این ست و بس   رو درو گم شو وصال این ست و بس

کہنے کو تو فنائے نفس اور اخلاص کا حصول چند لفظی بات ہے لیکن اس میں کمال پیدا کرنا مشکل امر ہے اور صوفیائے محققین و علمائے راسخین کے طریقے پر چلے بغیر اس میں کمال پیدا کرنا نہایت مشکل امر ہے۔ اسی لئے مولانا رومؒ نے فرمایا ہے۔

نفس نتواں کشت الا ذاتِ پیر   دامن آں نفس کش محکم بگیر

اصلاح و فنائے نفس سے پہلے نفل نماز و تلاوت قرآن مجید وغیرہ جو اعمال و اوراد کئے جائیں وہ ایک مؤمن کے حق میں ابرار کے اعمال تو ضرور ہیں اور ان پر ثواب ضرور مرتب ہو گا، لیکن وہ مقربین کے اعمال میں سے نہیں ہیں اور قرب الٰہی کا ثمرہ ان پر مرتب نہیں ہو گا بلکہ ایسی حالت میں ذکرِ الٰہی اور وہ اعمال و اوراد جو کسی شیخ کامل سے اخذ کئے ہوں اور فنائے نفس کے حصول کا ذریعہ ہوں وہ مقربین کے اعمال میں شمار ہوں گے اور فنائے نفس کی تکمیل اور اس کے

مطمئنہ ہو جانے کے بعد نفل نماز و تلاوتِ قرآن مجید و جملہ اور ادو اعمال حسنہ مقربین کے اعمال میں شمار ہوں گے اور قربِ الہیٰ میں ترقی کا موجب ہوں گے۔

صوفیاء کے تذکروں کو علوم صوفیہ کی بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جس طرح تاریخی روایات کا درجہ احادیث کے مقابلہ میں بہت ہی اسفل ہے، جو اہتمام محدثین کرام رضی اللہ عنہم نے احادیث کے روایت کرنے اور ان کی درجہ بندی میں فرمایا ہے۔ مؤرخین سے اس کا عشر عشیر بھی ظہور میں نہیں آیا، تذکروں کا معالہ تو تواریخ سے بھی اسفل ہے اور ان کی روایات کو تو کچھ بھی تاریخی حیثیت حاصل نہیں ہے اس لئے صوفیہ کے تذکروں کو علم تصوف کے لئے معیار قرار نہیں دیا جاسکتا، ان کی حیثیت ترغیب دلانے والی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے اور وہ اس وقت اس مقصد کے لئے مفید ہوسکتے ہیں جبکہ صاحبِ مطالعہ کو صحیح اعتقادات اور دیگر شرعی ضروریات کا صحیح علم پہلے سے حاصل ہو یا ان کے ایسے مقامات کو جن میں ذہن الجھتا ہو اور طبیعت صاف نہ ہوتی ہو اکابر سے حل کر لیا جائے اور یہ بات تذکروں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ تفسیر و حدیث و فقہ وغیرہ جملہ فنون میں ایسے مقامات بکثرت پیش آتے ہیں جن کا حل اساتذہ سے کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ البتہ ملفوظات اکابر کے بارے میں یہ گمان اس عاجز کے نزدیک صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ عام آدمی الجھن میں پڑ جاتا ہے کیونکہ کسی بزرگ کے ملفوظات اس بزرگ کا کوئی معتقد و ذی علم آدمی اس مجلس میں من و عن لکھتا رہتا ہے اور بعد میں ان کو کتابی شکل میں جمع کر کے شائع کر دیا جاتا ہے اور وہ ملفوظات حاضرین مجلس کے ذوق کے مطابق عام فہم زبان میں بیان ہوتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر حاضرین کے سوالات کے جوابات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگر ان کی جمع و ترتیب کا اہتمام صحیح طریقے پر کیا گیا ہو اور بعد میں بھی تحریف و اضافے سے محفوظ رہے ہوں تو ان کے متعلق مذکورہ بالا رائے قائم کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر حضرت شاہ رؤف احمد صاحب بھوپال والے قدس سرہ العزیز نے اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ غلام علی صاحب قدس سرہ العزیز کے ملفوظات کچھ مجالس کے تاریخ وار تحریر کئے ہیں اور فارسی زبان میں جمع فرما کر درالمعارف کے نام سے شائع کرائے ہیں۔ ان ملفوظات کے پڑھنے سے شاہ صاحب موصوف کی مجلس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور بہت سے اہم مسائل و امور کا حل ان میں مل جاتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی جگہ جامع کے ذوق کو بھی کچھ دخل پیدا ہو جائے لیکن اگر وہ کتاب مستند ہو تو مجموعی حیثیت سے اس کے مضامین مفید و مستند ہی

ہوتے ہیں ۔ لیکن اگر کسی بزرگ کے ملفوظات کا جمع ہونا مستند طریقے پر ثابت نہ ہو تو اور بات ہے ۔

لطائف پر توجہ:

اگر کبھی لطائف کے مراقبہ کرنے کا وقت نہ ملے تو صرف نیت کر کے ان پر سے توجہ کرتا ہوا گذر جائے تو یہ بھی فائدہ سے خالی نہیں ۔

اسباق کے خواص:

ہر سبق کے کچھ خواص ہیں اور ہر سبق سے کچھ رذائل کا ازالہ وابستہ ہے ۔ پیر اس پر نظر رکھتا ہے کہ مرید سے رذائل دور ہوئے یا نہیں اور اسی سے وہ سبق میں پختگی کا اندازہ کرتا ہے ۔ ہر پیر کو کشف نہیں ہوتا کہ مرید کی کیفیت معلوم کرلے ۔ عام طور پر پیر مرید کے حالات پر نظر رکھتے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں کہ اس میں کون سی خرابیاں تھیں، وہ زائل ہوئیں یا نہیں ۔

اسباق کے اثرات:

لوگ جب اپنے اندر وہ اثرات نہیں پاتے جو اثرات کہ مختلف اسباق کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں یا دوسرے بزرگوں کے حالات میں ملتے ہیں تو اس پر انھیں تعجب اور مایوسی ہوتی ہے ۔ حالانکہ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم اتنی محنت نہیں کرتے جتنی اگلے لوگ کرتے تھے، اتنی محنت کریں تو ہم بھی ویسے ہی اثرات دیکھیں ۔ ہم سے تو اتنی محنت بھی نہیں ہوتی جتنی محنت ہم نے اپنے بزرگوں کو کرتے دیکھا ہے اور ہم نے اگرچہ ان کے برابر محنت نہیں کی لیکن جتنی کچھ کی ہے آج لوگ اتنی بھی نہیں کرتے، پھر بھی ہم ان کے اسباق بڑھاتے رہتے ہیں، محض اس لئے کہ کچھ نہ ہونے سے، ہونا بہتر ہے اور مشاغل لتنے ہیں کہ جیسی چاہیئے ویسی محنت مشکل ہے ۔

لطائف کی تشریح:

لطائف کا ذکر نہ تو قرآن سے ثابت ہے اور نہ حدیثوں سے، یہ محض بزرگان دین کی کشفی دریافت ہے ۔ بزرگوں نے اپنے اپنے کشف سے یہ محسوس کیا کہ انسان دس لطیفوں سے مرکب

ہے۔ حدیث سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ انسان کے جسم میں قلب ایک نہایت لطیف مقام ہے، جب یہ ترقی کرتا ہے تو درجات طے کرتا ہے۔ قلب سے روح، پھر سر، پھر خفی اور پھر اخفی تک پہنچ جاتا ہے، تب کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت پیدا ہو گئی ہے۔ انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ ظاہر تو یہ ہے کہ آدمی کے آنکھ، کان، ناک، منہ اور جسم ہے۔ آنکھ سے آدمی دیکھتا ہے، کان سے سنتا ہے، ناک سے سونگھتا ہے وغیرہ، مگر کان میں کون سی ایسی چیز ہے جو سنتی ہے، ہم صرف سننے کی صفت کو محسوس کر سکتے ہیں دیکھ نہیں سکتے۔ اسی طرح زبان مزہ چکھ سکتی ہے مگر اس کے چکھنے سے اس لطیف احساس کو دیکھ نہیں سکتے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آنکھ دیکھ رہی ہے مگر آنکھ میں کون سی ایسی شے ہے جو دیکھنے کا کام کرتی ہے اس لطیف صفت کو دیکھ نہیں سکتے۔

اللہ پاک نے کائنات کو دو طریقوں پر پیدا فرمایا، ایک تو کن کہہ کر اور دوسرے بتدریج کن کہہ کر جس عالم کو پیدا کیا وہ عالم امر کہلاتا ہے اور دوسرا عالم خلق۔ عالم امر میں روح، فرشتے، عرش، کرسی اور انسان کے جسم کے دس لطیفے شامل ہیں اور عالم خلق میں زمین، آسمان، آگ، پانی اور ہوا وغیرہ شامل ہیں۔ عالم امر عرش سے اوپر کا حصہ ہے اور عالم خلق عرش سے نیچے تحت الثریٰ تک۔

آگ، پانی، ہوا اور مٹی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یعنی آگ اگر کم ہو اور اس پر پانی زیادہ مقدار میں ڈال دیا جائے تو آگ بجھ جائے گی۔ اسی طرح اگر آگ زیادہ ہو اور پانی کم ہو تو آگ پانی کو بھاپ بنا کر اڑا دے گی۔ پانی میں مٹی ڈال دی جائے تو پانی گدلا ہو جائے گا اگر مٹی زیادہ مقدار میں ڈال دی جائے تو پانی کو جذب کرے گی۔ مگر اللہ پاک نے انسان میں یہ چاروں عناصر ایک خاص تناسب سے رکھے ہیں جس سے انسان کا جسم قائم ہے۔ اگر انسان کے جسم میں حرارت بڑھ جائے تو بیمار ہو جاتا ہے اور اگر کم ہو جائے تو بھی بیمار ہو جاتا ہے۔ اسی جسم میں اللہ پاک نے روح بھی رکھ دی ہے جو لطیف ہونے کے باوجود انسانی جسم کو لئے لئے پھرتی ہے اور جب وہ نکل جائے تو آدمی مر جاتا ہے۔

اللہ پاک نے "کن" کہہ کر ان ساری روحوں کو پیدا کیا جو قیامت تک پیدا ہوتی رہیں گی اور اسی وقت الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) کا وعدہ لیا۔ سب نے قالو بلی (بیشک تو ہمارا رب ہے) کہا۔ اس تعلق کو قائم رکھنے کے لئے اللہ پاک نے انسان کے جسم میں پانچ فرحت انگیز چیزیں رکھ دیں اور ان کی اصل عالم امر میں رکھی، وہ پانچ لطائف ہیں جو قلب،

روح، سر، خفی اور اخفی کہلاتے ہیں۔ یعنی جب قلب میں فنائیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ عالم امر میں اپنی اصل سے مل جاتا ہے، جب روح ترقی کرتی ہے تو وہ بھی اپنی اصل سے مل جاتی ہے۔ اسی طرح سر، خفی، اخفی ہیں جب ترقی کرتے ہیں تو اپنی اصل سے جن کا مرکز عالم امر ہے جا ملتے ہیں۔ انسانی جسم کے یہ پانچ لطائف تو عالم امر سے تعلق رکھتے ہیں اور پانچ دوسرے لطائف عالم خلق سے تعلق رکھتے ہیں وہ نفس، ہوا، پانی، آگ اور خاک ہیں۔ لیکن ان پانچ لطیفوں کی اصل وہی عالم امر کے پانچ لطیفے ہیں یعنی نفس کی اصل قلب، ہوا کی اصل روح، پانی کی سر، آگ کی خفی اور خاک کی اصل اخفی ہے۔

حق تعالیٰ نے انسان کے جسم میں دس لطیفے یعنی دس فرحت انگیز چیزیں امانت رکھ دی ہیں یہ دس لطیفے پروردگار کے نور فیض و برکت سے لبریز ہیں۔ لیکن انسان دنیا کی دو گھڑی کی جھوٹی اور فانی لذت حاصل کرنے کے لئے اپنے رب کے فیض و برکت سے غافل ہو گیا۔ جب اسے اس غفلت سے جگایا جاتا ہے تو وہ آہ و زاری کرتا ہے، اس وقت اللہ پاک بندہ پر، ہمیشہ کی فرحت یعنی اپنی یاد اس کے دل میں قائم کر دیتا ہے۔ تصوف اسی کا نام ہے اور یہی احسان کہلاتا ہے۔

انسان اگر اچھی صحبت اختیار کرتا ہے تو اس میں اچھی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں، بری صحبت ہوتی ہے تو بری باتیں سیکھ جاتا ہے۔ چور و ڈاکوؤں کی صحبت میں رہے گا تو ظاہر ہے کہ وہ بھی چور ڈاکو بن جائے گا اور اگر کسی ولی کی صحبت میں رہے گا تو نیک بن جائے گا۔ انسان اگر بری صحبتوں میں پڑ جائے تو برباد ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنے گرد و پیش کے ماحول سے متاثر ہو کر بنتا اور بگڑتا ہے۔ انسان میں غرور و تکبر، دولت، جاہ و حشم اور شہرت ہر قسم کی خواہش کرنے کی صلاحیت ہے۔ اگر ان صلاحیتوں میں دنیاوی اثرات ہوں گے تو انسان مغرور ہو جائے گا شہرت کو پسند کرے گا اور چاہے گا کہ دنیا اس کی عزت کرے وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر یہی صلاحیت دین کی طرف لگ جائے تو اللہ والا بن جائے گا اور وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے گا اور اس کا اظہار بھی کرے گا اور واما بنعمۃ ربک فحدث کے زمرے میں آجائے گا، جو جائز ہے۔

شکر بھی دو طرح سے ہوتا ہے ایک زبان سے اور دوسرے عمل سے۔ آنکھ کا شکر یہ ہے کہ غلط چیز نہ دیکھے، کان کا شکر یہ ہے کہ بری بات نہ سنے، پاؤں کا شکر یہ ہے کہ بری جگہ نہ جائے وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے اگر کسی ولی یا بزرگ نے یہ کہہ دیا کہ میں نے یہ دیکھا اور اللہ کا مجھ پر یہ کرم ہوا جس کا میں اہل نہ تھا تو کیا برا کیا۔ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور

صحابہ کرامؓ سے لطیفوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔اصل میں وہاں اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔جو بات ہوتی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست پوچھ لیتے، جو کہا کہ حضورؐ نے یوں فرمایا ہے، مان لیتے اور فوراً عمل کرنے لگتے۔مگر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور رسول پاکؐ کے زمانے سے دوری ہوتی گئی آدمی بگڑتا گیا۔بزرگوں نے انسانوں کو سدھارنے کے لئے ان لطائف کی دریافت کی اور ان بزرگوں نے اپنے اپنے کشف کے مطابق ان لطائف کا اظہار کیا اور ان کے مقامات تعین کئے ہیں۔اگر انسان ان لطائف سے تعلق پیدا کرلے گا تو اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرلے گا اور اللہ تعالیٰ کا مقرب بندہ بن جائے گا اور یہی تصوف کی غرض و غایت ہے۔

آدمی جب کسی کامل بزرگ کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے اور اس سے بیعت ہو کر اپنے گناہوں سے تائب ہو جاتا ہے تو شیخ مرید کو خوابِ غفلت سے جگاتا ہے اور اسے آگاہ کرتا ہے کہ اللہ پاک نے اپنے کرم سے تمہارے جسم میں دس جواہر پارے چھپا رکھے ہیں۔یہ انمول جواہر پارے اللہ کے نور فیض اور برکت سے لبریز ہیں۔شیخ آدمی کے انہی جواہر پاروں کو بیدار کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی بدبختی کا احساس بھی دلاتا ہے۔اگر آدمی سعادت مند ہے تو حقیقت پر غور کرتا ہے اور شرمندہ اور پشیمان ہو کر اپنے آقا اور مالک کے دربار میں حاضر ہو جاتا ہے اور اس کے فیوضات و برکات حاصل کرنے کے لئے آہ وزاری کرتا ہے۔اگر اس کے دل میں خلوص ہے تو اللہ پاک اس پر کرم فرماتا ہے اور اپنی یاد اس کے دل میں قائم کر دیتا ہے، اپنی محبت اور معرفت کی راہیں کھول دیتا ہے۔رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت خود بخود اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور سنت کی پیروی کرنے لگتا ہے۔دین کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور احکام الٰہی کی پابندی کرتا ہے، کامل مرشدوں سے استفادہ کرتا ہے اور نتیجہ کے طور پر ایک نہ ایک دن اپنے ان دس لطیفوں کی برکات سے نوازا جاتا ہے۔انسان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرلیتا ہے اور اللہ کا مقرب بندہ بن جاتا ہے۔انوارات کے رنگ یہ کاملین کے کشف کی باتیں ہیں، جس بزرگ کو جو رنگ نظر آئے اس نے ان کا انکشاف کر دیا۔چنانچہ کسی نے کہا کہ لطیفہ قلب کے ذکر میں مجھے زرد رنگ کے انوارات نظر آئے، کسی دوسرے بزرگ نے بھی ایسا ہی کہا لہٰذا لطیفہ قلب کے انوار زرد سمجھے گئے۔اسی طرح لطیفہ روح، سر، خفی اور اخفیٰ کے انوارات بھی مقرر ہو گئے۔مگر یہ محض کشفی باتیں ہیں، ضروری نہیں کہ ہر ذاکر کو یہی رنگ نظر آئیں اور نہ یہ مقصود ہیں۔کسی کو نظر آئیں تو ٹھیک ہیں، نظر نہ آئیں تو بھی ٹھیک ہے، مقصود اللہ پاک کی یاد ہے نہ کہ کشف کا ہونا

البتہ اگر انوارات نظر آئیں تو شکر ادا کرے اور نظر نہ آئیں تو یہ خیال نہ کرے کہ اس کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔

عالم امر کے پانچ لطیفوں کے کمالات کو ولایت کے پانچ درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر ایک درجہ اولوالعزم نبیوں میں سے کسی ایک نبی کے زیر قدم ہے۔ ان تمام اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے زیر قدم دوسرے انبیاء ہوتے ہیں اور ہر نبی کے زیر قدم ایک ولی ضرور ہوتا ہے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ عالم امر کے لطائف خمسہ کی ولایت کو انبیاء علیہم السلام کے زیر قدم کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو قرب و ولایت اصل کے مقام میں حاصل ہوا ہے سالک کو اس قرب کا ظل حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً لطیفہ روح میں سالک کو جو قرب حاصل ہوتا ہے وہ ولایتِ خلیلی کا ظل ہے۔

اسباق میں کوتاہی:

یہ عجیب بات ہے کہ چشتیہ صابریہ والے چلاتے ہیں اور وہ بھی اس آدمی کو جو کئی سال سے متواتر لگا ہوا ہو، بیعت بھی اردو میں کرتے ہیں اور سالہا سال کے بعد اگر کسی کو سبق بتاتے ہیں تو تیسرے کلمہ کا ورد بتاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حضرات اس معاملہ میں سخی ہیں، سب کو اسباق پر چلاتے ہیں اور اگر کسی کو ایک دو سال سبق نہ دیا جائے تو وہ اکثر باتیں بناتا ہے محنت کی طرف دھیان نہیں دیتے، حالانکہ حضرت مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس آدمی کو جس کو خواب میں بشارت ملی اس کو قوت سے فعل میں آنا چاہئے اور جان مار دینی چاہئے تاکہ گوش سے آغوش میں آجائے، کون ہے جو اس کا حق ادا کرے، لوگ سبق لیتے ہیں مگر محنت کرتے ہی نہیں، یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک آدمی محنت کرے اور اس پر احوال و واردات نہ ہوں، اور اگر احوال ہوں اور وہ نہ بتائے۔ یہاں یہ بات ہے کہ احوال کی بات ہی نہیں کرتے، کون ہے جو سبق کا حق ادا کرے۔ لوگ مراقبہ کرتے ہیں تو تھوڑی دیر، کوئی کوئی ہوتا ہے جو شوق سے مراقبہ کرتا ہے۔ کئی ایسے ہیں جو پہلے پہلے کرتے ہیں پھر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جو ظاہری علوم پڑھتے ہیں وہ سلوک کی طرف نہیں آتے اور جو اردو خواں یا جاہل ہوتے ہیں وہ صوفی بنتے ہیں، ان کا بھی یہ حال ہے کہ متواتر کئی کئی سال ہو جاتے ہیں اور ان کی علمی حالت بہت خراب ہوتی ہے۔ توجہ ہی نہیں دیتے حالانکہ جاہل صوفی کو بھی شیخ کی صحبت میں آکر پانچ دس سال بعد عالم بن جانا چاہئے

اس لئے کہ جب تک علم نہ ہو گا عمل کیسے کرے گا۔ ہر وقت مفتی آدمی کو کہاں میسر ہو سکتا ہے جو اس سے فتویٰ پوچھ لے۔

قلب جاری ہونا:

قلب کا جاری ہونا اسے سمجھا جاتا ہے کہ قلب میں حرکت پیدا ہو جائے اور اس حرکت پر اللہ اللہ کا تصور جم جائے۔ اگرچہ یہ بھی محمود ہے، حالانکہ حقیقتاً قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ قلب جوارح پر جاری ہو جائے یعنی اعمال شریعت اور سنت کے مطابق ہونے لگیں۔ جب دل جاری ہو جاتا ہے تو کسی کو گھڑی کی ٹک ٹک کی سی آواز آتی ہے، کسی کو چڑیوں کے چہچہانے کی آواز معلوم ہوتی ہے، کسی کے دل میں ہنڈیا سی پکتی معلوم ہوتی ہے، کسی کا دل اوپر سے حرکت کرتا محسوس ہوتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ مقصود نہیں ہے۔ مقصود ذکر کرنا ہے، کسی کا دل جاری ہو یا نہ ہو، کسی کو کوئی کشف ہو یا نہ ہو اس کی پروانہ کرے، ہمیشگی اور استقامت کے ساتھ ذکر کرتا رہے۔ اللہ پاک کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔ وہ رحیم و کریم ہے آپ کو کسی نہ کسی طرح ضرور نواز دے گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث یعنی "انسان کے جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے اگر یہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح ہو جاتا ہے اور اگر یہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے" اس حدیث شریف اور تصوف میں جسے قلب کہتے ہیں کیا مناسبت ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا، ظاہر ہے کہ اگر دل بیمار ہو جائے تو سارا جسم متاثر ہو جاتا ہے یعنی اگر دل میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو سارا جسم محسوس کرتا ہے برعکس اس کے اگر اس کا دل ٹھیک ہے اور جسم کے کسی حصہ میں کوئی تکلیف ہو تو وہی حصہ متاثر ہوتا ہے دل میں اس ظاہری نقص سے کوئی فرق نہیں پڑتا دل اسی طرح اپنا کام کرتا رہتا ہے جیسا کہ ڈاکٹروں کا بھی خیال ہے۔ علاج معالجہ سے ظاہری نقص یا تکلیف دور ہو جاتی ہے مگر دل میں خرابی ہو تو سارا جسم متاثر ہو گا۔ دل جسم کو برابر خون نہ پہنچا سکے گا یا پہنچائے گا تو خراب اور فاسد خون دے گا، جس سے جسم میں مختلف بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ عوام کی زبان میں اسے گوشت کا لوتھڑا کہتے ہیں۔ یہ تو اس کے ظاہری معنی ہوئے اور باطن میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دل میں جو ہمارے جسم میں حرکت کرتا ہے ایک نہایت ہی لطیف چیز ہے یا لطیف مقام ہے جو خیالات کی گذر گاہ ہے۔ اس

میں اچھے خیال بھی آتے ہیں اور برے بھی اور یہ ایک فطری چیز ہے جسے انسان روک نہیں سکتا۔ اچھے خیال آئیں گے تو انسان سدھر جائے گا اور برے خیالات آئیں گے تو بگڑ جائے گا اور بری عادتیں پیدا ہو جائیں گے اور اپنی عاقبت خراب کرے گا۔ لہذا انسان کو قدرت نہیں ہے مگر آدمی اتنا تو کر سکتا ہے کہ برے خیالات کو نکالنے کی کوشش کرے اور اچھے کاموں کے لئے کمربستہ ہو جائے۔ یہی تصوف کا منشا ہے اور یہی حدیث شریف کا مطلب ہے۔

ذکر کی افادیت:

حضرت مجدد صاحبؒ نے بعض ایسی اصطلاحات رائج فرمائی ہیں جو ان سے پہلے تصوف میں نہیں تھیں۔ مثلاً ولایتِ صغریٰ، ولایتِ کبریٰ، ولایتِ علیا، حقیقتِ کعبہ، کمالاتِ نبوت وغیرہ۔ چنانچہ حضرت مجددؒ اور خواجہ معصومؒ کے مکتوبات میں اسی لئے فرق ہے کہ حضرت مجددؒ کے مکتوبات اصطلاحات کی تشریح کی بنا پر غامض ہیں اور خواجہ معصومؒ کے مکتوبات سلیس اور نسبتاً عام فہم ہیں۔

حضرت مجدد صاحبؒ نے ایک جگہ ابرار اور مقربین کا تذکرہ نہایت عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔ والسابقون الاولون اولئک المقربون، وتوفنا مع الابرار۔ آیات سے مؤمنین کے دو گروہوں کا علم ہوتا ہے یعنی ہر مسلمان مؤمن ابرار میں سے ہوتا ہے، لیکن مقربین خواص میں سے ہوتے ہیں اور سلوک کا مقصد ابرار کو مقربین کے زمرے میں داخل کرنا ہوتا ہے۔ ابرار کے اعمال میں نفس کی پراگندگی شامل ہوتی ہے لیکن مقربین کے اعمال ہر قسم کی پراگندگی سے پاک ہوتے ہیں۔ چنانچہ ابرار کو صرف ثواب ملتا ہے اور مقربین کو ثواب کے ساتھ ساتھ قرب کی نعمت بھی ملتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے خاکروب، سرکاری ملازمین وغیرہ سب جو کام کرتے ہیں ان کو اس کی تنخواہ ملتی ہے، یہ ابرار کی مثال ہے۔ لیکن جو آدمی بادشاہ کے وزراء میں شامل ہو اور بادشاہ کی ذاتی خدمت میں لگا رہتا ہو اس کو تنخواہ کے ساتھ بادشاہ کا قرب بھی حاصل ہوتا ہے۔

ماسویٰ دو قسم پر ہے: وہ سب کچھ جو ذات کے اندر پیدا ہوتا ہے اور خالق سے غافل کرتا ہے وہ نفس ہے اور وہ سب کچھ جو ذات سے باہر ہے اور خالق سے غافل کرتا ہے وہ آفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل کرنے اور اعمال میں خلوص پیدا کرنے کے لئے انفس و آفاق دونوں کی گرفتاری سے نجات حاصل کرنا پڑتی ہے۔

مختلف سلاسل میں مختلف طریقے ہیں۔ سلسلہ عالیہ، چشتیہ والے حضرات پہلے آفاق کے تعلق کو قطع کرتے ہیں پھر انفس کے تعلق کو، لہذا وہ پہلے لا الہ الا اللہ، لا معبود الا اللہ، لا موجود الا اللہ وغیرہ کا ذکر کرا کر آفاقی گرفتاری سے نجات دلاتے ہیں بعد میں اسم ذات کا ذکر بتاتے ہیں۔ سلسلہ عالیہ، نقشبندیہ والے حضرات پہلے اسم ذات کا ذکر کراتے ہیں اور انفس کی گرفتاری سے نجات دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سیر آفاقی سیر انفسی کے ضمن میں طے ہو جاتی ہے اور یہ بہت عمدہ بات ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مکیؒ سے کسی نے پوچھا کہ کون سے طریقے میں بیعت ہوں نقشبندیہ میں یا چشتیہ میں؟ آپ نے فرمایا اس کی مثال یوں ہے کہ ایک زمین ہے جس میں جھاڑیاں وغیرہ ہیں اس میں کاشت کرنی ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے سال چھ مہینے اس کی اچھی طرح صفائی کر کے پھر کاشت کی جائے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جو تھوڑی بہت ہموار زمین ہے اس میں کاشت شروع کرے، صفائی ساتھ ساتھ ہوتی رہے گی۔ اس نے کہا کہ موت کا کیا پتہ مجھے دوسرا طریقہ پسند ہے۔ آپ نے فرمایا تمہیں سلسلہ عالیہ، نقشبندیہ میں بیعت ہونا چاہئے۔

سیر انفسی جذب کے ساتھ طے ہوتی ہے اسی کو جذبہ کہتے ہیں۔ سیر انفسی فنائے نفس سے حاصل ہوتی ہے اور سیر آفاقی فنائے قلب سے حاصل ہوتی ہے۔ اپنے نفس کے باہر کے تعلقات کو آفاقی تعلقات کہتے ہیں اور سیر آفاقی اثبات سے طے ہوتی ہے جیسے دنیا، بیوی، بچے، مال، اولاد وغیرہ کی اس قدر محبت جو اللہ تعالیٰ کی محبت پر غالب آجائے۔ سیر آفاقی سلوک سے طے ہوتی ہے۔ یعنی ایک خاص طریقے سے آہستہ آہستہ تعلقات کو ختم کرنے کی کوشش کرنا۔ حدیث شریف میں ہے "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی خواہشات کو میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ کرے۔ یہ حالت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب سیر انفسی مکمل ہو جائے۔ اور یہ سیر جذبہ سے طے ہوتی ہے۔ جذبہ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچے چلا جانا ہے، جذبہ سلوک پر مقدم ہے۔ سلسلہ عالیہ، نقشبندیہ میں جذبہ سے دونوں سیریں طے کراتے ہیں یعنی سیر آفاقی سیر انفسی کے ضمن میں طے ہو جاتی ہے۔ جس آدمی نے فنائے قلب اور فنائے نفس حاصل نہیں کی، اس کے اعمال ابرار والے اعمال ہیں یعنی ان میں کامل طور پر خلوص نہیں ہوتا۔ اور اگر وہ یہ دونوں حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں تو اس وقت ذکر کا عمل اس کا مقربین کا عمل ہو گا اور دوسرے اعمال ابرار والے اعمال ہوں گے حسنات الابرار سیئات المقربین۔

فکر ذہن و قلب:

ذہن اور قلب کا آپس میں گہرا تعلق ہے ۔ اس میں فرق کرنا ایک پیچیدہ کام ہے ۔ ڈاکٹر لوگ کہتے ہیں کہ دل کوئی خاص چیز نہیں ہے صرف گوشت کا ایک لوتھڑا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ دماغ ہی اصل ہے یہی سب کچھ کرتا ہے ۔ لیکن ہمارے حساب سے قلب اور عقل دو مختلف چیزیں ہیں البتہ ان میں تعلق گہرا ہے جیسے بجلی کے سوئچ اور بلب میں تعلق ہے ، جیسے ہی سوئچ دبائیں فوراً بلب جل جاتا ہے کوئی دیر نہیں لگتی ۔ چنانچہ عام آدمی کے لئے امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے ۔ اسی طرح قلب میں اگر کوئی خیال پیدا ہوتا ہے تو وہ فوراً دماغ میں پہنچ جاتا ہے ۔ قرآن پاک کی آیت ہے : لہم قلوب لا یعقلون بھا ٥ لہم قلوب لا یفقھون بھا ٥

پس معلوم ہوا کہ تفقہ اور تفکر قلب کا عمل ہے اور یہ قلب و عقل دو مختلف چیزیں ہیں ، ان دونوں میں قلب کو فضیلت ہے اور عقل قلب کے تابع ہے ۔ جیسے ہم کسی کو کہتے ہیں کہ بھئی یہ کام کرنا ہے تو اسے یوں کہتے ہیں کہ بھائی یہ کام دل سے کرنا ہے یہ نہیں کہتے کہ دماغ سے کرنا ہے ۔ پس انسان کے اندر کنٹرول کا تمام کام دل کرتا ہے ۔ چنانچہ جب ایک آدمی کو تصفیہ قلب حاصل ہو جاتا ہے تو اس کی فکر بھی گندگی سے پاک ہو جاتی ہے اور جب تک قلب آلودہ رہے غیر اللہ میں گرفتار رہے اس وقت تک فکر بھی پاک نہیں ہوتی ۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فکر کی گندگی ذکر سے دور ہوتی ہے ۔

مکتوباتِ مجددی:

آپ کے مکتوبات گرامی بے بہا نایاب علمی جواہرات کا ایک ضخیم مجموعہ ہے اور گنج گراں مایہ ہیں ۔

حضور اکرم رحمتِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع نے آپ کو کمال کی ہر صفت میں بے نظیر و بے عدیل بنا دیا تھا یہی وجہ ہے کہ دیگر فضائل و کمالات کی طرح تکلم و خطابت میں بھی اس وقت کوئی آپ کا ثانی نہیں تھا ۔ ادبیات میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا ۔ آپ کی تصنیفات و تحریرات ، رموز و معانی کے ذخائر اور مضامین کی علوشان کے ساتھ ادبی معیار کا اعلیٰ شاہ کار ہیں ۔ آپ کے مکتوبات نہ صرف تصوف و دیگر علوم و معارف اور اسرار و معانی کا ہی عالمگیر امتیازی ذخیرہ

ہیں بلکہ اپنی تاثیر، قوت ادب و انشاء، روانی و برجستگی کے لحاظ سے بھی فارسی ادب میں نہایت بلند پایہ ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے ہاں تمثیلات و تشبیہات و استعارات کا امتزاج بھی نہایت فصیح و بلیغ انداز میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

آپ کے تمام مکتوبات میں استغنا و بے نیازی کی وہی شان ہے جو ایک شیخ و مرشد کے مکتوبات میں ہونی چاہئے۔ آپ کے مکتوب الیہم میں وزرائے سلطنت اور بڑے جرنیل و گورنر تک جو پنج ہزاری، ہفت ہزاری، دہ ہزاری منصب پر فائز تھے شامل ہیں۔ اس کے باوجود آپ کے طرزِ تخاطب میں وہ تمام محاسن موجود ہیں جو ان موصوف کو اپنے مرتبے سے نیچے بھی نہیں آنے دیتے اور مخاطبین کے مقام و مرتبہ کا بھی پورا پورا خیال ملحوظ رہتا ہے۔

ولایتِ خاصہ:

ولایت خاصہ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور شرعی طریقے کی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ اپنے نفس کو ایسا پاک و صاف بنالے کہ اس میں نفسانی خواہشات باقی ہی نہ رہیں کہ وہ اس کو برائی کی طرف کھینچیں۔ یہ مقام اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کو صوفیوں کی اصطلاح میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ کہا جاتا ہے۔ پس جن لوگوں نے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودیوں میں فنا کر دیا ہو اور رضائے الٰہی کے تمام کاموں کے ساتھ بقا حاصل کر لی ہو، اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مخاطب کر کے انہی لوگوں کے حق میں فرمایا ہے کہ میرے خاص بندوں پر تیرا قابو نہیں چل سکے گا۔

حصول ولایت:

ایمان لانے کے بعد اعمال صالحہ کو بجالانے، نواہی سے بچنے اور اعمال میں اخلاص پیدا کرنے سے قربِ خداوندی میں ترقی ہوتی ہے اور بندہ درجہ ولایت پر فائز ہو جاتا ہے۔ جس قدر اتباع سنت کی پابندی اور بدعت سے اجتناب پر عمل ہو گا اسی قدر قربِ خداوندی میں ترقی حاصل ہو گی۔

وسوسہ و خیال:

ہر وسوسہ خیال ہے لیکن ہر خیال وسوسہ نہیں ہوتا۔ وسوسہ وہ خیال ہوتا ہے جو مقصد میں حائل ہو لیکن خیال مقصد میں حائل نہیں ہوتا۔ خیالات سے تو آدمی کا بچنا ناممکن ہے، اچھے یا برے خیالات تو ہر وقت انسان کو آتے رہتے ہیں، خیالات کا آنا مضر بھی نہیں، نہ نماز میں نہ مراقبہ میں بلکہ خیالات کا لانا مضر ہے۔ آدمی خود خیالات نہ لائے نہ سوچے، ہاں اگر خود بخود کوئی خیال آ جائے تو اس پر جے نہیں بلکہ اس خیال کو راستہ دے دے اور خیالات کا آنا اللہ تعالیٰ کی ایک خاص مہربانی ہے۔ اگر خیالات نہ آئیں تو بھی انسان کا کام نہیں چل سکتا۔ مثلاً ایک آدمی گھر میں اپنی اہلیہ سے کہہ کر گرم مصالحہ لانے کے لئے بازار گیا اب وہ بازار میں چلا جارہا ہے، مختلف قسم کے خیالات اس کے ذہن میں آرہے ہیں لیکن گرم مصالحہ لانے کا خیال تھوڑی دیر بعد خود بخود اس کے ذہن میں آتا رہتا ہے۔ اگر وہ شخص بازار میں جاکر کسی خاص خیال میں محو ہو جائے اور گرم مصالحہ لانے کا خیال اسے بھول جائے تو نہ معلوم وہ کتنی دیر بعد گھر پہنچے اور گرم مصالحہ لے کر آئے بھی یا نہیں۔ یہ تو خیالات نہ آنے کا نقصان ہوا اور اگر خیالات آکر جم جائیں تو بھی انسان کا کام چلنا مشکل ہے۔ مثلاً ایک شخص نے نماز کی نیت کی، اب اسے کاروبار کے کسی خیال نے آکر تنگ کرنا شروع کر دیا۔ خیالات کا اتنا غلبہ ہوا کہ اسے نماز کی رکعتیں تک یاد نہ رہیں۔ بتائیے کہ ایسی نماز کا کیا فائدہ ہوا کہ جس نماز میں اتنا بھی حضور حاصل نہیں کہ نماز کی رکعتیں بھی یاد نہ رہیں۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے۔ لا صلوۃ الا بحضور القلب کہ جس نماز میں حضورِ قلب حاصل نہ ہو وہ نماز نہیں۔

حضورِ قلب کے مختلف درجات ہیں، ایک تو یہ کہ نماز شروع کی اور پوری نماز کے دوران اسے کوئی خیال نہ آیا۔ یہ تو کمال درجہ کا حضورِ قلب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے بہت آسانی فرما دی ہے کہ اگر صرف تحریمہ کہنے کی دیر تک بھی اسے نماز کا استحضار رہا تو اسے نفس حضورِ قلب نصیب ہو گیا اور ایسا شخص مندرجہ بالا وعید سے بچ گیا۔ اسی طرح اگر دوران قیام اسے اتنا خیال رہا کہ وہ قیام میں ہے اور پہلے الحمد اور پھر سورۃ پڑھنی ہے تو اسے اتنی سی بات سے نفس حضورِ قلب حاصل ہو گیا اگرچہ کمال درجہ حاصل نہ ہوا اسی طرح رکوع، سجود اور تشہد میں اگر ان ارکان کا خیال رہا تو ان ارکان میں بھی اسے حضورِ قلب حاصل رہا۔

اب رہا کمال درجہ کا حصول تو اس کے لئے شریعت نے مختلف ذرائع بتائے ہیں کہ ان کے ذریعے سے حضورِ قلب میں کمال حاصل کیا جاسکتا ہے مثلاً نماز میں حضورِ قلب کے لئے مندرجہ ذیل ذرائع کی ترغیب دی گئی ہے: ۔(۱) ادائیگی فرائض کے لئے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ وہ مسجدیں تعمیر کریں جن میں دنیا کی باتیں نہ ہوں اور وہاں نماز پڑھنے والے کو یکسوئی حاصل ہو ۔(۲) نماز پڑھنے کے لئے مسجد جانے سے پہلے انسان اپنی طبعی ضروریات پوری کرلے ۔ مثلاً اگر پیشاب پیخانہ کا تقاضا ہو تو پہلے وہ پورا کرے پھر نماز میں مشغول ہو، اگرچہ اس سے جماعت ہی کیوں نہ جاتی رہے یا اسی طرح اگر بھوک کا غلبہ ہو اور کھانا تیار ہو تو پہلے کھانا کھالینا چاہیئے پھر نماز پڑھے ۔ اگر کھانا کھائے بغیر نماز پڑھنی شروع کر دی تو دوران نماز بھوک ستائے گی، نماز بھی جلدی پڑھے گا اور کھانے کا خیال بھی آتا رہے گا، یعنی نماز کھانے کا حکم پیدا کرلے گی ۔ اس کے برعکس اگر کھانا پہلے کھایا اور دوران طعام یہ خیال ستاتا رہا کہ ابھی نماز پڑھنی ہے اور اسی خیال میں رہا تو اس کے کھانے پر بھی ثواب ملے گا، یعنی طعام نماز کا حکم پیدا کرلے گا۔ پس آدمی کو چاہیئے کہ طعام کو نماز بنائے، نماز کو طعام نہ بنائے ۔ حاصل یہ کہ جو جو خیالات نماز کے اندر تنگ کرسکتے ہیں نماز سے قبل ان خیالات کے اسباب کو رفع کرے ۔(۳) نماز کے لئے جلدی مسجد میں جائے اور پہلی صف میں امام کے قریب کھڑا ہو تاکہ امام کی آواز آسانی سے سن سکے ۔ پھر اگر معانی جانتا ہو تو امام کی قرأت پر غور کرنا آسان ہوگا ۔ دوسرے یہ کہ بعد میں آکر نماز میں شامل ہونے والوں کی خلل اندازی سے امام کے قریب ہونے کی وجہ سے بچ جائے گا، کیونکہ خلل اندازی عام طور پر پیچھے کی آخری صفوں میں ہوتی ہے ۔(۴) پھر نماز کے بعد سنت و نوافل کے پڑھنے کے لئے قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس جگہ (مسجد یا گھر وغیرہ) اسے زیادہ یکسوئی حاصل ہو تو وہاں نوافل ادا کرنا افضل ہے، ان ذرائع سے حضورِ قلب میں کمال پیدا ہوسکتا ہے، بعینہٖ ذکر کی برکت سے بھی یکسوئی حاصل ہوتی ہے ۔ اس کا اثر نماز کے دوران بھی رہتا ہے اس لئے ذکر پر بھی مداومت کرنی چاہیئے، باقی خیالات کا آنا ایک فطری چیز ہے عام طور پر آدمی اس سے بچ نہیں سکتا، یہاں تک کہ فنائیت کاملہ نصیب نہ ہو ۔ ہاں جب فنائیت نصیب ہوجاتی ہے تو پھر بعض اوقات دوسرے خیالات تو کیا، آدمی کو اپنی بھی خبر نہیں ہوتی، جیسے حضرت علیؓ کا نماز کی حالت میں نیزے کا بھالا نکلوانا یا ایک بزرگ کا مراقبہ کی حالت میں اپنے ایک پاؤں کا آپریشن کرانا۔ ڈاکٹروں نے کلوروفارم تجویز کی لیکن وہ بزرگ، جس مراقبہ کی انھیں مشق تھی اس میں مشغول ہوگئے ۔ مراقبہ میں تھوڑی دیر گذرنے کے بعد واقف

لوگوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ اب آپ ان کا آپریشن کرلیں، انھیں پتہ نہیں چلے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور ان بزرگ کو پتہ بھی نہ چلا۔ بہرحال نماز میں محویت کا پیدا ہونا ایک وہبی چیز ہے کسبی نہیں اور ایک قاعدہ ہے کہ آدمی جس چیز کو کسب کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وہبی طور پر عطا فرمادیتا ہے۔ یعنی کسب اللہ تعالیٰ کی عطا کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ بہرحال ہماری کوشش ہونی چاہیئے کہ ہم از خود خیالات نہ لائیں اور اگر خود بخود آجائیں تو ان خیالات کو دل میں ٹھہرنے نہ دیں اگر خیالات جم جائیں تو نفس کا تدارک کریں، جیسے ایک صحابی باغ میں نماز پڑھ رہے تھے اور نماز میں باغ کی طرف خیال گیا اور جم گیا تو انھوں نے اپنے مقام کے مناسب نفس کا تدارک کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر باغ صدقہ کردیا۔

ہم لوگوں کو چاہیئے کہ اگر خیال جمنے لگے تو اسے دوسری طرف لگادیں۔ مثلاً دوران نماز اگر خیال بھٹک گیا تو اس کو ہٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ خیال کو اللہ تعالیٰ کی طرف لے جائے اور یہ سوچے کہ میرے آگے جنت ہے، کعبہ ہے، خدا کی ذات ہے، دائیں طرف جنت بائیں طرف دوزخ ہے، پس اس طرح سے خیالات کو منتشر ہونے سے بچائے۔ بزرگوں نے کہا کہ دل کی مثال ایک جرنیلی سڑک یعنی شاہراہ کی مانند ہے کہ اس پر سائیکل سوار، رکشا، ٹیکسی، کار وغیرہ ہر قسم کی سواری اور بھنگی سے لے کر بڑے بڑے وزراتک اس شاہراہ پر سے گذرتے ہیں، اس سے کسی کو روکا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح دل کو بھی اللہ تعالیٰ نے خیالات کی گزر گاہ بنایا ہے، اس میں ہر قسم کے خیال آئیں گے، اچھے بھی برے بھی۔ جیسے آپ کسی کو جونیلی سڑک پر چلنے سے روک نہیں سکتے اسی طرح آپ خیالات کو قلب میں آنے سے روک نہیں سکتے۔ مثلاً اگر سرکار شاہی سڑک کو بند کردے تو دنیا کے کاروبار بند ہوجائیں، اسی طرح اگر قلب میں خیال ہی پیدا نہ ہوں تو انسان زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ جرنیلی سڑک کے چوراہے پر ایک ٹریفک کا سپاہی کھڑا ہوتا ہے جس کا کام ٹریفک کو کنٹرول کرنا ہوتا ہے وہ ایک طرف کی ٹریفک کو روک کر دوسری طرف کی ٹریفک کو گذار دیتا ہے اور اس طرح ٹریفک کو جام نہیں ہونے دیتا۔ اگر وہ ڈیوٹی کو صحیح انجام نہ دے اور ٹریفک جام ہوجائے تو اس کا افسر اس کا عہدہ والا فنیہ (نشان۔ تمغہ) چھین لیتا ہے اور اس کو کہتا ہے کہ جاؤ دوبارہ ٹریننگ لو، مشق کرو، پھر ذمہ داری کو صحیح طور پر ادا کرنا۔ اسی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ انسان کا دل خیالات کی گذر گاہ ہے۔ ہمارا کام دل کی شاہراہ پر ٹریفک کے سپاہی کی طرح ہے کہ خیالات کو گذارتے رہیں، جمنے نہ دیں۔ اگر خیالات دل میں آکر رک جائیں اور ہم ان کو نہ ہٹائیں

تو اس سے خیالات کی ٹریفک جام ہو کر فتور پیدا ہو جائے گا۔ اگر ایسا شخص مجاز ہو تو پیر صاحب بھی اس سے مجاز ہونے کا تمغہ واپس لے لیتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ ابھی اور ذکر کی مشق کرو پھر اس ذمہ داری کو سنبھالنا۔ معلوم ہوا کہ خیالات آتے رہیں، گزرتے رہیں، جمیں نہیں۔

دراصل خیالات ہی کے ذریعے دنیا کی رونق ہے اور اللہ تعالیٰ کو دنیا کی رونق باقی رکھنی ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات بھی قابل اعتراض نہیں کہ مسلمان کروڑپتی بنے بلکہ جائز اور حلال طریقے سے ہو تو ضرور کمائیں اور کمائی کے بعد اس کا حق ادا کریں بلکہ خدائے تعالیٰ تو اس بات پر زیادہ خوش ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس نعمتیں زیادہ ہوں، لیکن عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ کفار کے پاس دولت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار کے لئے تو صرف یہی دنیا ہے، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ جب وہ کوئی اچھا کام کرتے ہیں تو ان کو اس کا سارا بدلہ دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے جو انھیں دنیاوی نعمتوں کی شکل میں مل جاتا ہے۔ مسلمانوں سے جو دنیاوی جاہ و حشمت جاتی رہی ہے تو وہ ان کے اعمال کی وجہ سے ہے نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس دنیا نہ ہو، بلکہ زیادہ مالدار تو دین کے زیادہ کام کر سکتا ہے۔ مالدار تو صدقہ، زکوٰۃ، حج، خیرات، مہمان نوازی، ہدیہ، وقف اور جہاد وغیرہ کے لئے چندہ کے کاموں میں حصہ لے سکتا ہے لیکن غریب بیچارہ کیا کر سکتا ہے، وہ تو صرف دو رکعت نماز ہی ادا کر سکتا ہے کہ اس پر کوئی پیسہ نہیں لگتا اور یہ دو رکعت بھی پریشانی کی حالت میں پڑھتا ہے یعنی تہجد کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو دل میں خیال آتا ہے کہ صبح میرے بچوں کو روٹی کہاں سے میسر ہو گی۔

دنیا جائز طریقے سے کمانی چاہیئے اور مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات ہو، اللہ تعالیٰ کی محبت غالب رہے جیسے غزل کا ایک شعر جس کا مفہوم یہ ہے: "میرے محبوب کے متعلق طعنہ دینے والی عورتوں کے طعنے تو میرے دل کے گرد رہتے ہیں، لیکن میرے محبوب کی محبت میرے قلب کی گہرائی میں ہے۔" اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں ہو اور دنیا دل کے باہر ہو کیونکہ انسان کو دنیا سے مفر نہیں، جیسے انسان کھانا کھائے اور چاہے کہ ریح خارج نہ ہو، تو عجیب بات ہے۔ اسی طرح دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کا خیال نہ آئے یہ ناممکن۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو دنیا کے خیالات کو روک دیتا، لیکن ایسا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس صفت پر فرشتوں کو پیدا کیا ہے کہ انھیں ادھر ادھر کے خیالات نہیں آسکتے۔ جو فرشتہ رکوع میں ہے وہ رکوع میں ہی رہے گا جو سجدہ میں ہے وہ سجدہ میں ہی رہے گا۔ انسان کو تو کسی اور مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کر و بیاں

بعض دفعہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خیال بھی ہے اور ساتھ ساتھ دوسرے خیالات بھی ہوتے ہیں۔ یہ کیفیت زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ احسن یہ ہے کہ یہ بھی نہ ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم ریڈیو پر ایک اسٹیشن لگانا چاہتے ہیں لیکن اس اسٹیشن پر دوسرے اسٹیشن کی ٹوں ٹوں کی آواز آتی رہتی ہے اور وہ دور نہیں ہوتی تو ہم اس اسٹیشن سے جو کچھ تقریر یا خبریں سننا چاہتے ہیں سن لیتے ہیں بند نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمارا کام تو چل رہا ہے۔ اگر یہ آواز بند نہیں ہوتی نہ ہو، ہم کیا ریڈیو بند کر دیں۔ پہلے ریڈیو پر اسٹیشن بہت کم ہوتے تھے اس لئے ایک اسٹیشن پر دوسرے کی آواز نہیں آتی تھی۔ اب ریڈیو پر اسٹیشن بہت زیادہ ہو گئے ہیں، ایک اسٹیشن کی آواز دوسرے میں آجاتی ہے۔ اسی طرح پہلے لوگوں کی زندگیاں بہت سادہ تھیں دنیا میں کم الجھتے تھے، لہذا یکسوئی آسانی سے ہو جاتی تھی۔ آج کل دنیا کی مشغولیت بہت زیادہ ہے، ہم دنیا کے دھندوں میں زیادہ الجھ گئے ہیں اس لئے دنیا کے خیالات ہمیں زیادہ تنگ کرتے ہیں۔ پس ہم صحابہؓ کے ایمان کا تھوڑا حصہ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ اب تو شیطان سے جنگ کا زمانہ ہے۔ اصول یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں تھوڑا کرنے والے کو بھی زیادہ اجر ملتا ہے۔ متقدمین کو جو کیفیات بہت محنت کے بعد حاصل ہوتی تھیں آج کل لوگوں کو تھوڑی سی محنت سے بھی حاصل ہو جاتی ہیں پہلے زمانے میں صوفیوں سالکین کو تیس تیس سال بعد خلافت ملتی تھی، آج کل دو سال میں مل جاتی ہے۔ آج کل جنگ کا زمانہ ہے وہ زمانہ امن کا تھا۔ جو سپاہی جنگ کے زمانہ میں تھوڑی سی محنت کرتا ہے اس کی زیادہ قدر کی جاتی ہے، بڑے بڑے عہدے مل جاتے ہیں لیکن امن کے زمانے میں پندرہ بیس سال بھی خدمت کرے تو کوئی خاص انعام نہیں ملتا۔ جب پہلی جنگ عظیم میں ترک اور جرمن، انگریز کے خلاف لڑ رہے تھے تو دوران جنگ تھوڑی دیر کے لئے انھیں غلبہ حاصل ہوا انگریزی فوج مغلوب ہوئی، کچھ سپاہی مارے گئے کچھ زخمی ہوئے۔ ایک پنجابی سپاہی بھی تھا وہ ویسے ہی دشمن کے خوف سے گر گیا، بیہوش ہو گیا، حالانکہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ کچھ دیر بعد انگریزی فوج نے پلٹ کر زور دار حملہ کیا، جرمن فوج پسپا ہوئی۔ اس پنجابی سپاہی نے اپنی فوج کو دشمن کے پیچھے بھاگتے دیکھا تو اٹھ کر اپنی فوج کے آگے آگے جرمنوں کے خلاف لڑنا شروع کر دیا۔ انگریزی فوج کے بڑے افسر نے اسے سب سے آگے دیکھا تو اس کا نام نوٹ کر لیا۔ بعد میں اس سپاہی کو وقت کا سب سے بڑا انعام وکٹوریہ کراس حکومت کی طرف سے ملا۔

خیالات کا آنا ناگزیر ہے ہاں البتہ وہ خیالات جو مقصد میں حائل ہوں وہ وساوس ہیں۔ پس وہ خیالات جو نماز میں آتے ہیں یا ذکر کرتے وقت آتے ہیں اور توجہ کو منتشر کرتے ہیں وہ وساوس ہوتے ہیں۔ نماز میں خیالات کے آنے سے ثواب میں تو کمی نہیں آتی البتہ کمال میں فرق آجاتا ہے۔ مراقبہ کرنے بیٹھیں اور خیالات آنے شروع ہو جائیں، چاہے دینی ہوں یا دنیاوی اور یکسوئی پیدا نہ ہونے دیں تو وہ وساوس میں شامل ہیں۔ البتہ استغراق کی کیفیت میں وسوسہ محمود ہوتا ہے کیونکہ اس سے کیفیات و واردات اور معرفتِ حق حاصل ہوتی ہے۔ یہ خیال ہی ہے جو آدمی کو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب پر پہنچاتا ہے۔ سالک اپنے تمام مقامات کو خیال ہی کی مدد سے قطع کرتا ہے اور عبور کرتا ہے۔ پس خیالات ہی آدمی کی ترقی کا موجب و زینہ بنتے ہیں۔ واللہ اعلم و علمہ اتم۔

شیطانی یا نفسانی وسوسہ:

وسوسہ شیطان کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور نفس کی طرف سے بھی، لیکن اگر غور کیا جائے تو ان دونوں کے وساوس میں لطیف فرق معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو وسوسہ نفس کی طرف سے ہوتا ہے وہ خفی ہوتا ہے اور جو شیطان کی طرف سے ہوتا ہے وہ ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ نفس کے وساوس میں نفس کا حظ بھی شامل ہوتا ہے۔ نفس کا مطلوب چار چیزیں ہیں: راحت زینت، لذت اور شہرت۔ ان میں سے بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے۔ جیسے نفس زینت کی خاطر راحت و لذت کو قربان کر دیتا ہے، اسی طرح انسان شہرت کی خاطر بقیہ تینوں یعنی راحت، زینت اور لذت کو قربان کر دیتا ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ شہرت نفس کا مطلوبِ حقیقی ہے۔ شہرت کو حاصل کرنے کے لئے نفس کو جو روپ دھارنا پڑتا ہے یہ اس پر مائل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر دنیا دار بننے میں شہرت ہو تو دنیا دار بننے کی تمنا کرتا ہے اور اگر دینی لبادہ اوڑھنے میں شہرت حاصل ہوتی ہو تو بزرگوں کی وضع قطع اختیار کرلے گا۔ یہ نفس کا بہت خطرناک داؤ ہے کہ دین کو دنیا بنا دیتا ہے۔ نفس کے داؤ اور وسوسے مندرجہ ذیل ہیں: نماز کے وقت میں نیند کا آنا، زیادہ کھانے کو طبیعت چاہنا، زیادہ سونا یا غصہ اور تکبر کرنا، کسی کو اپنے دل کا غصہ نکالنے کے لئے مارنا۔ اور شیطان کے وسوسے مندرجہ ذیل ہیں مثلاً چوری کرنا، زنا کرنا وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان وساوس میں قرار واقعی فرق و امتیاز کرنا بہت بزرگ آدمی کا کام ہے۔ مبتدی بیچارے کو کیا پتہ، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ نفس کے وساوس قوی ہوتے ہیں اور شیطان کے وساوس کمزور ہوتے ہیں کقولہ

تعالیٰ ان کید الشیطن کان ضعیفا لیکن جب شیطان کے وسوسہ کو نفس کی موافقت حاصل ہوتی ہے تو اس میں قوت پیدا ہو جاتی ہے، پس انسان گناہ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

وسوسہ پر گرفت:

صرف اس وسوسہ پر گرفت ہوتی ہے جو منتہی کو غافل کر دے۔ البتہ جو وسوسہ آئے اور گزر جائے اس پر گرفت نہیں ہوتی، بلکہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جب منتہی سے وسوسہ کی بنا پر لغزش ہوتی ہے اور اسے علم ہو جاتا ہے تو وہ عاجزی واستغفار کرتا ہے جس کی بنا پر اس کی لغزش معاف کر دی جاتی ہے بلکہ اس کی عاجزی پر اس کی ترقی کر دی جاتی ہے اور یہ وسوسہ ترقی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

منقول ہے کہ ایک بزرگ سمندر کے کنارے رہتے تھے، ایک دفعہ بارش ہوئی انھوں نے سوچا کہ یہ جو بارش ہو رہی ہے تو اس سمندر پر بارش کا کیا فائدہ، بارش کا فائدہ تو خشک زمین پر ہوتا ہے۔ وہ بزرگ اس خیال پر جم گئے، چاہئے تو یہ تھا کہ خیال کو ہٹاتے اور لاحول پڑتے، لیکن وہ بزرگ اس وسوسہ پر جمے رہے۔ یہ بزرگ ایک دن کسی دوسرے بزرگ کے پاس گئے تو انھوں نے ان بزرگ کو بتایا کہ آپ سے مقامات چھین لئے گئے ہیں، آپ جلد توبہ کریں۔ ان بزرگ نے کہا کہ میرا گناہ توبہ سے معاف نہیں ہو سکتا آپ ایسا کریں کہ میری ٹانگ میں رسی یا کپڑا باندھ کر گھسیٹیں اور ساتھ ہی یہ کہیں کہ یہ وہ آدمی ہے جو اللہ تعالیٰ کے کاموں میں دخل دیتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا تو یہ لغزش وخطا ان کی ترقی کا ذریعہ بن گئی ویسے عام طور پر منتہی وسوسہ کی ظلمت سے محفوظ رہتا ہے، واللہ اعلم۔

نیز ایک دفعہ ایک بزرگ کی تہجد کی نماز فوت ہو گئی تو وہ خوب روئے۔ ان کا رونا ایسا مقبول ہوا کہ تہجد سے بھی زیادہ ان کو ثواب ملا۔ اس کے بعد پھر ایک دن سوتے رہ گئے تو شیطان نے جلدی سے آکر جگا دیا وہ حیران ہوئے کہ شیطان نے عبادت کے لئے کیسے جگا دیا۔ پوچھا تو کہنے لگا کہ میں نے جگا کر تمہارا فائدہ نہیں نقصان کیا ہے۔ اگر تم سوتے رہتے تو تہجد قضا ہو جاتی، پھر گریہ کرتے جس کا ثواب تہجد سے زیادہ ملتا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں جگا دوں تاکہ تہجد پڑھ کر کم ثواب ملے۔ تو بزرگوں کا معاملہ عجیب ہے کہ اول تو لغزش ہوتی ہی نہیں اور ہوتی ہے تو اتنا افسوس کرتے ہیں کہ وہ لغزش ترقی کا موجب بن جاتی ہے۔

الہام:

جب سالک کو الہام ہوتا ہے تو اسے پرکھنا چاہئے کہ یہ الہام شرع شریف کے احکام کے مطابق ہے یا مخالف۔ اگر شریعت کے مطابق ہو تو رحمان کی طرف سے ہے اور اگر خلاف شرع کام کے متعلق ہے تو شیطان کی طرف سے ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کھرے اور کھوٹے کی پہچان کے لئے اور حق و باطل میں تمیز کے لئے شریعت مثل ایک کسوٹی کے ہے۔ شیطان تو ایسا لعین ہے کہ صحابہؓ کے ساتھ نماز کے دوران اس نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت میں اس طرح آمیزش کی کہ صحابہؓ کو پتہ نہ چل سکا۔ پھر سالک کو کیا یقین ہے کہ اس کا الہام شیطان کی دسترس سے محفوظ ہے۔ چونکہ شرع شریف کے احکام اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ یعنی فرشتے کے ذریعے نازل فرمائے جس کے بارے میں خود فرمایا کہ وہ قوی اور امین ہے انه لقول رسول کریم۔ ذی قوۃ عند ذی العرش مکین مطاع ثم امین ٥ تو اس لئے شریعت کے احکام حق و باطل کے لئے میزان اور ترازو کی حیثیت رکھتے ہیں جو "الہام" شرع شریف کے مطابق ہو وہ رحمان کی طرف سے ہے اور جو شرع شریف کے خلاف ہو وہ شیطان لعین کی طرف سے ہے۔ چنانچہ سالک اگر اس پر عمل کرے گا تو دنیا و آخرت کا خسارہ اٹھائے گا۔

ظن اور الہام:

ظن میں انسان کے اپنے ارادے کو دخل ہوتا ہے کہ وہ اپنی نیت و ارادہ کے ساتھ ایک رائے قائم کرلے، یہ انسان کی اپنی سوچ کا عمل ہے۔ جبکہ الہام انسان کے قلب میں خود بخود ایک خیال کا پیدا ہو جانا ہے اگرچہ ظاہر و باطن میں اس کا کوئی ماحول، ذکر یا اثرات نہ ہوں بلکہ انسان کسی اور رنگ میں بیٹھا ہو اور اچانک خود بخود ایک خیال آجائے تو یہ الہام ہوگا۔ مثلاً ایک آدمی دینی مجلس میں باتیں کر رہا ہو اچانک خیال آئے کہ آج میرے ہاں مہمان آئیں گے تو یہ ایک الہام ہوگا کہ خود بخود ایک ایسا خیال آیا جس کا تعلق اس وقت کی گفتگو سے کچھ بھی نہ تھا۔ الہام بعض دفعہ صحیح ہوتا ہے اور بعض دفعہ غلط، اس لئے اس کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ اگر کسی کو صحیح الہام ہو جاتا ہو تو وہ اس پر مغرور نہ ہو اور جسے نہ ہوتا ہو وہ افسوس نہ کرے۔ مثلاً ایک آدمی کو الہام ہوا کہ ہزار روپے مل جائیں گے تو اسے وقت سے پہلے معلوم ہونے پر خوشی بھی ہوگی لیکن

ساتھ ہی انتظار کی تکلیف بھی برداشت کرنا پڑے گی کیونکہ ہزار روپیہ تو ہر حال میں ملنا تھا الہام ہوتا یا نہ ہوتا۔ اور اگر کسی غمی کے متعلق الہام ہوا کہ فلاں جانور مرجائے گا تو یہ وقت سے پہلے معلوم ہونے کا خواہ مخواہ غم ہے، کیونکہ جانور کو تو ہر حال میں اسی وقت مرنا تھا، پھر الہام سے کیا فائدہ ہوا۔ پس الہام کی طلب نہیں کرنی چاہئے، خاص طور پر ان امور میں جو دنیا سے متعلق ہوں۔ ہاں اگر الہام معارف سے متعلق ہو جیسے اسے الہام کے ذریعہ کوئی خاص معرفت عطا ہوئی تو البتہ یہ محمود ہے، لیکن اس کو پہچاننے والے کم ہیں، اس کی قدر کم لوگ کرتے ہیں۔ عوام تو تکوینی امور کے الہام ہی کو سب سے بڑی بزرگی سمجھتے ہیں، فلیتدبر۔

زُہد:

دنیا کے مال و اسباب کی رغبت چھوڑ کر آخرت کی طرف مائل ہونے کو زہد کہتے ہیں۔ ہر وہ چیز جس میں فی الحال نفس کی لذت ہو اور آخرت میں اس کا کوئی اچھا نتیجہ حاصل نہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور یاد سے غافل کرنے والی ہو، دنیا کہلاتی ہے۔

زُہد کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی خرابیوں، نقصانات اور اس کے فنا ہونے کو سوچا کرے اور آخرت کے فائدوں اور وہاں کی ہمیشہ کی زندگی میں کام آنے والے اعمال کو یاد کیا کرے اور ان میں زیادہ رغبت پیدا کرے۔ لیکن یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اگر دنیا کے مال و اسباب کو مقصود نہ بنایا جائے بلکہ آخرت کا وسیلہ سمجھ کر جائز طریقے سے حاصل کرے اور نیک کاموں میں خرچ کرے تو یہ دنیا نہیں بلکہ دین ہے۔

زہد یعنی دنیا سے بے رغبتی کے کئی درجے ہیں۔ مثلاً ایک درجہ یہ ہے کہ نفس اگرچہ دنیا کی طرف مائل ہو مگر طبیعت پر جبر کر کے اس کو اس سے روکے۔ ایسی حالات کو تَزَہُّد کہتے ہیں۔ دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ نفس کو دنیا سے ایسی نفرت ہو جائے کہ اس کی طرف مائل نہ ہو اور یہ سمجھ لے کہ دنیا اور آخرت کی نعمتوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ دنیا و آخرت دو سوکنیں ہیں۔ دونوں میں سے اگر ایک راضی ہوگی تو دوسری ناراض ہو جائے گی۔

زُہد کی حقیقت:

زُہد کے معنی ہیں بے رغبتی یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ کی یاد اور محبت سے روکنے والی ہے اس کو ترک کرنا اور اس کی طرف رغبت نہ رکھنا۔ انسان کا نفس اس کو اپنی خواہشات میں پھنسا کر اللہ

تعالیٰ کی فرماں برداری سے روکتا ہے، اس لئے نفس کی خواہشات کو ترک کرنا زُہد ہے۔ بالفاظ دیگر جو چیز بھی انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل کرے اس کا ترک کرنا زُہد ہے۔

زُہد کا تعلق انسان کی زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ مثلاً عزت و مرتبہ میں زہد، نفس کی خواہشات میں زہد، رزق کی طلب میں زہد وغیرہ۔ دنیا میں عزت کے ساتھ رہنے کے لئے روزگار حاصل کرنا اور زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنا زُہد کے خلاف نہیں۔

توکل:

ترکِ اسباب و ترکِ تدبیر کا نام توکل نہیں بلکہ اسبابِ قریبہ کو چھوڑ کر توکل کرنا انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت اور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ البتہ اسبابِ بعیدہ اور دور از کار تدبیروں میں پڑنا یا صرف اسباب اور تدابیر ہی کو مؤثر سمجھ کر مسبب الاسباب و مدبر الامور یعنی اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جانا بے شک توکل کے خلاف ہے۔ انسان جب سب تدبیریں کرنے کے بعد کام کرنے کا عزم کرلے تو اپنی عقل و رائے اور تدابیر سے کام تو لے لیکن ان اسباب و وسائل پر بھروسہ نہ کرے، بلکہ بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر کرے کیونکہ یہ سب تدبیریں مدبر الامور اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور تمام وسائل و اسباب مسبب الاسباب کے اختیار و تصرف میں ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ سے زیادہ توکل اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ دنیا میں کسی کو نہیں ہو سکتا۔ لیکن آپ کا توکل یہ نہیں تھا کہ ظاہری اسباب کو چھوڑ کر بیٹھے رہے ہوں اور وہ یہ کہتے ہوں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے، وہ ہمارے بیٹھے رہنے ہی پر ہمیں غلبہ عطا فرمادے گا۔ ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ آپ ہر کام کے لئے ظاہری اسباب کو اختیار فرماتے تھے اور صحابہ کرامؓ کو بھی اسی کی تعلیم دیتے تھے۔ یہی وہ صحیح توکل ہے جس کی تعلیم قرآن و حدیث میں دی گئی ہے۔

وقوفِ قلبی:

وقفِ قلبی (دل کی واقفیت) اللہ تعالیٰ کی ذات کا دھیان اور تصور ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہر وقت واقف رہنا ہے، یعنی طبیعت میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار رہے اور

ذکرِ قلبی خیال کے کانوں سے اللہ اللہ سنتا ہے۔ یہ بیٹھ کر اور اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے یعنی تمام خیالات سے قطع تعلق کر کے قلب کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو کر ذکر سنے۔ ذکرِ قلبی میں قلب کی حرکت محمود ہے مقصود نہیں۔ بعض کو حرکت محسوس ہوتی ہے بعض کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ شروع میں یاد کرد ہے یعنی کوشش و تکلف اور تسبیح و خیال سے اللہ اللہ کی آواز دل سے سنے اور اس طرح کوشش و مشق کرتے رہنے سے اور دیگر دوسری احتیاطوں سے آدمی کو اس کا محاورہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یعنی آدمی کو یہ کیفیت نصیب ہو جاتی ہے اور خیال و تکلف اور کوشش کے بغیر آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کے دھیان میں لگا رہتا ہے۔ اسی کو تصوف میں یادداشت یا حضوری یا حضورِ قلب کہتے ہیں یہ کیفیت مسلسل مشق کرنے اور تقویٰ و طہارت پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر گاڑی چلانے والا ڈرائیور شروع میں جب سیکھنے والا ہوتا ہے تو وہ اپنا پورا دھیان رکھتا ہے اور اس کی نظریں سامنے لگی رہتی ہیں کہ میرے سامنے گاڑی آرہی ہے اب مجھے بریک لگانا ہے، گیئر بدلنا ہے، کلچ دبانا ہے اور وہ پوری طرح ذہنی اور جسمانی طور پر مصروف نظر آتا ہے، حتیٰ کہ کسی سے بات تک نہیں کر سکتا کہ کہیں اس سے غلطی اور چوک نہ ہو جائے۔ لیکن جب اس ڈرائیور کی کافی مشق و مہارت ہو جاتی ہے تو پھر اس کو گاڑی چلانے میں تکلف و بناوٹ سے کام نہیں لینا پڑتا بلکہ اس کا پیر خود بخود کلچ، بریک اور گیئر پر پہنچ جاتا ہے اور وہ بدستور باتیں کرتا رہتا ہے لیکن اس کا خیال ڈرائیونگ کی طرف خود بخود لگا رہتا ہے اور اس کو طبیعت پر کوئی دباؤ نہیں ڈالنا پڑتا۔

یا یوں سمجھ لیجئے کہ دیہاتوں میں عورتیں کنوئیں وغیرہ سے پانی کے تین چار گھڑے سر پر اور ایک گھڑا کولھے پر رکھ کر چلتی ہیں۔ آپس میں باتیں اور ہنسی مذاق بھی کرتی جاتی ہیں لیکن ان کا خیال و توجہ ہمہ وقت گھڑوں کی طرف لگا رہتا ہے۔ اگر کہیں ذرا جھٹکا لگے تو ان کا ہاتھ خود بخود بغیر ارادہ و تکلف کے گھڑوں کی طرف لپکتا ہے، اس کو یادداشت کہتے ہیں۔ یا ایسے سمجھ لیں کہ جب مرغی انڈے سیتی ہے تو ان کو چھپائے رکھتی ہے اگر کوئی اس کو ہٹانے کی کوشش کرتا ہے تو مرغی اپنے پروں کو ہلائے جلائے بغیر اس آفت کی مزاحمت بھی کرتی ہے اور انڈوں کو بھی چھپائے رکھتی ہے، حتیٰ کہ کوئی اس کو پکڑ کر زبردستی وہاں سے ہٹا دے تو بھی اس کے پر پھیلے رہتے ہیں۔ اس طرح اس کا پروں کو پھلائے رکھنا بغیر ارادہ کے ہوتا ہے۔

قلبی ذکر کے حصول کے لئے مشائخ مراقبہ تلقین فرماتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان دو زانو یا چوکڑی مار کر آنکھیں بند کر کے زبان تالو سے لگا کر بیٹھ جائے۔ بہتر ہے کہ موٹے دانے

کی تسبیح ہاتھ میں ہو، اس کو تیزی سے چلاتا جائے اور اس کے ہر دانے پر اللہ اللہ کا خیال دل پر گذارتا جائے اور جیسے آدمی خاموشی سے کسی کتاب یا اخبار وغیرہ کا مطالعہ خیال کے ذریعے کرتا ہے کہ چند منٹوں میں پورا اخبار پڑھ لیتا ہے، اسی طرح خیال میں یہ تصور کرے کہ میرا دل اللہ اللہ کہہ رہا ہے اور میں سن رہا ہوں۔ پھر مراقبہ کے دوران وقفے وقفے سے یہ خیال بھی دہراتا رہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیض میرے دل پر بارش کی طرح برس رہا ہے اور دل اس کو جذب کر رہا ہے جس کی وجہ سے گناہوں کی سیاہی ختم ہو رہی ہے اور قلب میں نورانیت آرہی ہے۔ اسی طرح تھوڑی دیر بعد خیال سے یہ بھی کہہ لے کہ "الٰہی مقصودِ ما توئی و رضائے تو"۔ البتہ ذکر قلبی کی کیفیات ہر شخص پر مختلف ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں کو شروع میں لطیفہ کا تحرک نصیب ہوتا ہے لیکن اس تحرک کو اللہ اللہ سمجھنا چاہیئے۔ اگر صرف تحرک رہا تو اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ مراقبہ کے اثر کے طور پر بعض لوگوں کو گریہ کی کیفیت نصیب ہوتی ہے بعض کو ہنسی کی، بعض کو استغراق نصیب ہوتا ہے۔ بعض کو کوئی کیفیت نہیں ہوتی، کسی کیفیت کا نہ ہونا بھی ایک کیفیت ہے۔ بعض لوگوں کے خیالات دوران مراقبہ ادھر ادھر بھاگتے ہیں، ایسے شخص کو مجاہدہ کی کیفیت نصیب ہوتی ہے۔ نفس و شیطان تو دھوکہ دیتے ہیں کہ اتنا بیٹھنے سے تمہیں کیا حاصل ہوا لہٰذا اس بے مقصد کام کو چھوڑو۔ لیکن وہ مراقب شخص سوچتا ہے کہ نہیں میرا کام تو بیٹھنا ہے، لہٰذا اسے نفس و شیطان کے خلاف مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔

اگر کسی شخص کو کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے تو اسے اس مقام پر رکنا نہیں چاہیئے اور اس کیفیت کو اپنا مقصود نہیں بنانا چاہیئے۔ بعض لوگوں کو مراقبہ کے دوران نیند آتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ میں تو اتنی دیر سوتا رہا لیکن دوسرے لوگ اتنی دیر مراقبہ میں مشغول رہے تو اس کو اس بات پر افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کسی شخص کے لئے کیا کیفیت مناسب ہے لہٰذا جاگنے والوں پر رشک تو کریں لیکن مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ مراقبہ کے اثرات کی اصل علامت یہ ہے کہ وہ شخص اتباع سنت میں ترقی کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان لگا رہے جو کام کرے اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام کا دھیان رہے۔ مثلاً ایک شخص مراقبہ کرنے سے پہلے وضو کرنے میں بے احتیاطی اور پانی میں اسراف کرتا تھا لیکن اب مراقبہ کی پابندی کے بعد وہ شخص وضو کرتے وقت وضو کے فرائض و سنن وغیرہ کا پوری طرح خیال رکھتا ہے اور پانی میں اسراف بھی نہیں کرتا۔ پس اصل حقیقت یہ ہے کہ مراقبہ وغیرہ کا اثر اتباع شریعت و سنت میں ترقی ہے۔

فنائے قلب:

فنائے قلب اور فنائے نفس کے بعد تلاوتِ قرآن ترقیِ درجات کا سبب ہوتی ہے لیکن اس سے پہلے ذکر و مراقبہ کا بدل نہیں ہوتی۔ ثواب اور فائدہ تو یقینی ہے لیکن اس سے اس درجہ کی فنائے قلب و نفس حاصل نہیں ہوتی جس درجہ کی اور جس تیزی سے ذکر و مراقبہ سے ہوتی ہے۔ دوسرے سلسلوں میں نفی و اثبات سے ابتداء کی جاتی ہے کہ ابتداء فنائے قلب حاصل ہو اور آفاق سے تعلق حبی اور تعلق علمی منقطع ہو، اس کے بعد النفس کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور فنائے نفس حاصل ہوتی ہے لیکن نقشبندیہ سلسلہ میں ذکر سے ابتدا کی جاتی ہے۔ ذکر جذبہ پیدا کرتا ہے اور جذبہ سے اچھل کود مراد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب میلان و کشش و اجتباء مراد ہے، بمصداق اللہ یجتبی الیہ من یشاء و یھدی الیہ من ینیب (شوری ۴۲۔آیت ۱۳) (اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اپنی طرف سے جس کو چاہے اور راہ دیتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع کرے) اور اسی ذکر و جذبہ کے ضمن میں اجمالی طور پر فنائے قلب حاصل ہوتی رہتی ہے اس کے بعد نفی و اثبات کے ذریعہ تفصیلی فنا ہوتی ہے۔

فنائے نفس:

یہ جو کہتے ہیں کہ فنائے نفس کے بعد سالک کا یہ وجود فنا ہو جاتا ہے اور پھر وہ وجود موہوب کے ساتھ موجود ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وجود پر سے نفس امارہ کی حکومت ختم ہو جاتی ہے اور اب وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہو جاتا ہے۔ ایک مزدور اگر یہ دیکھ رہا ہو کہ مالک اسے دیکھ رہا ہے تو کام میں قطعاً غفلت نہیں برتتا اور اگر وہ یہ تو نہیں دیکھ رہا کہ مالک اسے دیکھ رہا ہے لیکن سمجھ رہا ہے کہ مالک یہیں کہیں ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے تب بھی کام غفلت کے ساتھ نہیں کرتا۔ غفلت دور کرنے اور کام کو حسن و خوبی سے انجام دینے میں پہلا درجہ دوسرے سے افضل ہے، کیونکہ پہلا مقام مشاہدہ ہے اور دوسرا مقام مراقبہ۔ اور حدیث شریف میں یہی بات فرمائی گئی ہے کہ الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔

نماز میں نفی اثبات:

ایک صاحب نے عرض کیا کہ نماز میں امام کے پیچھے نفی اثبات کر سکتے ہیں یا نہیں؟ فرمایا: نہیں کر سکتے خواہ امام ہو یا مقتدی، ہاں حضورِ دل وقوفِ قلبی مستحسن ہے۔ لا صلوٰۃ الا بحضور القلب نماز میں نفی اثبات تو نہیں کر سکتے ہاں وقوفِ قلبی اچھا ہے۔

ذکرِ قلبی خیال میں اللہ اللہ سننا ہے اور یہ بیٹھ کر اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے اور وقوفِ قلبی اللہ تعالیٰ کا دھیان اور تصور ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہر وقت واقف رہنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ایک قسم کا طبیعت میں استحضار رہنا ہے۔ پس یہ نماز میں صحیح اور پسندیدہ ہے۔ نماز کی نیت کرتے وقت نماز کا استحضار بہت ضروری ہے۔

زیارتِ قبور:

جب کسی بزرگ کی قبر کے پاس جائے تو عام زیارتِ قبور کے طریقے پر جوتا اتار دے اور پائینتی کی طرف سے جا کر میت کے منہ کے سامنے کھڑا ہو جائے، اس طرح کہ زائر کی پیٹھ قبلہ کی سمت ہو گی اور اس کا منہ میت کی طرف ہو جائے گا۔ پائینتی کی طرف سے آنے کی گنجائش ہوتے ہوئے سرہانے کی جانب سے نہ آئے اور مجبوری کی صورت میں اس کا مضائقہ نہیں کہ کسی جانب سے بھی آئے۔ اسی طرح اگر قبلہ کی جانب کھڑا ہونے کی گنجائش نہ ہو تو جہاں اور جس طرف گنجائش ہو کھڑا ہو جائے اور سلام مسنون جو زیارتِ قبور کے لئے ماثور ہے پڑھے۔ اس کے بعد حسبِ توفیق قرآن شریف میں سے کچھ پڑھ کر اس کا ایصال ثواب اس بزرگ اور وہاں کے جملہ اہل قبور کی خدمت میں ہدیہ کرے۔ مثلاً سورۃ فاتحہ شریف، الم تا مفلحون، آیۃ الکرسی، آمن الرسول تا آخر سورۃ الہٰکم التکاثر، ایک ایک بار، سورۃ اخلاص کم از کم تین بار، سورۃ فلق، سورۃ الناس یا اور جو کچھ ہو سکے پڑھ کر اس کا ایصال ثواب پہلے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح کو پیش کرے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے تمام انبیائے کرام و اولیاء عظام اور صاحبِ قبر و جملہ اہل قبور و عامۃ المسلمین و المسلمات کی ارواح مبارکہ کو ایصال ثواب کرے۔ یہاں تک عام زیارت کا طریقہ ہے۔ اب اسی جگہ اس بزرگ صاحبِ قبر کے سامنے مراقبہ میں بیٹھ جائے اور اخذِ فیض اس طرح کرے کہ اپنے آپ کو تمام خیالات سے خالی کرے اور حضورِ قلب کے ساتھ صاحبِ

قبر کی جانب متوجہ ہو جائے اور یہ خیال کرے کہ گویا اس بزرگ کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ کی جناب سے اس بزرگ کے سینے میں یعنی اس کے لطائف عالم امر و خلق میں فیض آرہا ہے اور اس کے سینے و لطائف سے میرے سینے و لطائف بلکہ جسم کے روئیں روئیں میں فیض وارد ہو رہا ہے اور میرے تمام لطائف اور رواں رواں اس فیض کو جذب کر رہا ہے، جس طرح بارش جب ریت والی جگہ پر برستی ہے تو وہ ریت اس کو جذب کر لیتا ہے، گویا میرے لطائف بھی اس فیض کو اسی طرح جذب کر رہے ہیں ۔ اس خیال میں جب تک طبیعت چاہے یا وقت کی گنجائش ہو بیٹھا ہوا فیض حاصل کرتا رہے اور اسی میں محو ہو جائے، کسی اور طرف خیال نہ کرے، اگر خود بخود کوئی وارد دل پر گذرے تو اس کو منجانب اللہ سمجھے اپنی طرف سے خیال کے ساتھ نہ تراشے، خود بخود جو کچھ آئے وہ اس بزرگ کی طرف سے ہوگا اور وہ اس بزرگ کی نسبت ہوگی ۔ اگر وقت کی گنجائش ہو تو اپنے تمام باطنی اسباق کا وہاں بیٹھ کر اعادہ کرے اور تھوڑی دیر تمام لطائف پر مراقبہ کرکے، اخذ فیض بطریق مذکور کرے، انشاء اللہ صاحبِ مزار بزرگ کے فیض سے فیضیاب ہوگا ۔

استغراق کی نیند:

مراقبہ جس قدر آسانی سے ہو سکے کر لیا کریں، زیادہ محنت برداشت کرنا جس سے بیماری لاحق ہونے کا خطرہ اور آئندہ رکاوٹ کا باعث ہو نامناسب ہے لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا، البتہ اگر بیٹھ کر نہ ہو سکے تو لیٹ کر بھی یا سہارا تکیہ وغیرہ کا لگا کر بھی مراقبہ و دیگر اشغال کر سکتے ہیں کیونکہ اللہ پاک کا فرمان ہے کہ مجھے قیام اور قعود کی حالت میں اور اپنی کروٹوں کے بل بھی یعنی ہر حالت میں یاد کیا کرو ۔ نیند آجانے سے جو معمولات میں کمی ہو جاتی ہے اس کا خیال نہ کریں بلکہ باقی ماندہ معمولات دوسرے وقتوں میں پورا کرنے کی کوشش کریں ۔ یہ نیند بری نہیں ہے بلکہ استغراق کی ہے جو محمود ہے ۔ مراقبہ و ذکر وغیرہ کے لئے وضو شرط نہیں ہے البتہ مستحب اور بہتر ہے اس لئے بغیر تکلیف کے جس قدر یہ سعادت نصیب ہو حاصل کریں اور مرض کی زیادتی کے خطرہ کے تحت جب وضو جاتا رہے تو بلا وضو ہی مراقبہ وغیرہ کر لیا کریں، کوئی مضائقہ نہ سمجھیں ۔ ذکرِ نفی اثبات جب تک بآسانی برداشت ہو سکے کرتے رہیں کیونکہ اب گرمی کا موسم آتا جارہا ہے جس وقت گرمی زیادہ بڑھ جائے اور طبیعت برداشت نہ کر سکے تو ترک کر دیں اور اس کے بعد نفی

اثبات بہ تہلیل لسانی شروع کر دیں اور جس قدر زیادہ کر سکتے ہوں کریں۔

خوارق و کرامات:

بات یہ ہے کہ انا عندظن عبدی بی کے مطابق جو جس چیز کا گمان کرتا ہے اللہ تعالیٰ دے دیتا ہے۔ بعض کو خوارق عادات کرامت کے طور پر ملتے ہیں جیسے طے الارض۔ میرے ماموں کو ایک مجذوب نے تھوڑی دور چلا کر ملتان پہنچا دیا، ایک بزرگ نے جمنا عبور کرا دیا۔ یہ باتیں من اللہ ہوتی ہیں۔ لیکن عملیات سے بھی بعض خوارق عادات حاصل ہو جاتے ہیں جیسے مسمریزم، ہپناٹزم وغیرہ اسکول و کالج کے لڑکے بھی کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن یہ سب مردود ہیں، ان سے ایمان کو خطرہ لاحق ہے۔ انسان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں جب پیدا ہوا بولتا نہیں تھا، کھانا پینا نہیں جانتا تھا، چل پھر نہیں سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا، اب سب کاموں کو جو اچھے ہیں اس کی طرف سے جاننا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: الیہ یرجع الامر کلہ اور ان تؤدو الامنت الی اھلہا وغیرہ۔ مداریوں کے عمل سے ظلمت بڑھتی اور اولیاء کے خوارق سے ایمان بڑھتا ہے

اصلاحِ نفس:

انسان عدم تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو وجود بخشا۔ اس کے بعد جب چاہیں گے اس کو عدم کر دیں گے اور پھر اپنی مرضی سے وجود میں لائیں گے۔ لہذا آدمی کے پاس کوئی چیز بھی اپنی نہیں ہے دنیا کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے اور یہاں تک کہ آدمی کا بدن اور تمام اعضا بھی امانت ہیں اور بندے کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانتوں میں خیانت نہ کرے یعنی دنیا کی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق استعمال کرے۔ اور اس کے علاوہ اپنے اعضا آنکھ، ناک، ہاتھ پاؤں اور کانوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق استعمال کرے۔ جو اچھائی صادر ہو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانے اور جو برائی ہو جائے اس کو اپنے نفس کی طرف سے جانے۔ نفس کی خواہش بھی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کی خواہش کے مطابق رکھے یعنی تابع شریعت رکھے۔ یہاں تک کہ خیال اور تصور بھی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اگر ایک آدمی مراقبہ کر رہا ہے اور اس نے اپنے خیالات کو کشف اور کرامات اور انوار کے لئے مرکوز کیا ہوا ہے یہ بھی خیانت ہے۔ اس خیال کو بھی اللہ تعالیٰ کے لئے رکھے۔ "طالبِ جذبہ و شوق، طالبِ مولا نیست"۔

شُکر:

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا عبادت ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت پسندیدہ عادت ہے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مصیبت و آزمائش کسی انسان پر آتی ہے اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو یہ بھی عبادت اور نہایت پسندیدہ عادت ہے۔

محض زبان سے شکر کے الفاظ الحمد اللہ وغیرہ کہہ لینے کا نام شکر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے کاموں میں خرچ کرے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور حرام و ناجائز کاموں میں خرچ نہ کرے اور اپنے اعمال و افعال کو بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بنائے اور اپنے اعضاو جوارح کو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ کاموں میں استعمال کرے اور اس کے ناپسندیدہ کاموں میں استعمال کرنے سے گریز کرے۔ بندوں پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ ایک سانس ہی کو لیجئے، روزانہ ہم کس قدر سانس لیتے ہیں کہ جن میں سے ہر سانس کے اندر آنے اور باہر نکلنے پر ہماری زندگی کا مدار ہے۔ ہم اس کا صحیح معنی میں حق شکر ادا نہیں کر سکتے اس لئے بندہ کو چاہئے کہ حسبِ توفیق شکر ادا کرتا رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی عاجزی اور کوتاہی کا اقرار کرتا رہے۔

محبت کی کسوٹی:

محبت ایک پوشیدہ چیز ہے۔ کسی کو کسی سے محبت ہے یا نہیں اور کم ہے یا زیادہ اس کا اس کے سوا اور کوئی پیمانہ نہیں کہ اس کے ظاہری حالات و معاملات سے اندازہ کیا جائے۔ محبت کے کچھ آثار اور علامات ہوتی ہیں جن سے اس کو پہچانا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ اور اس کا محبوب بننے کی تمنا کرتے ہیں تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب حضرت محمد مصطفےٰ اور احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کریں۔ جو شخص اپنے دعوے میں جتنا سچا ہو گا وہ آپ کی اتباع کا اسی قدر زیادہ اہتمام کرے گا اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کی روشنی کو اپنے لئے مشعل راہ بنائے گا اور جتنا اپنے دعویٰ میں کمزور ہو گا اسی قدر وہ آپ کی اتباع میں سستی اور کمزوری دکھائے گا اور اللہ کی محبت اور اس کے قرب سے محروم ہو گا۔

معراجِ عشقِ الٰہیٰ:

جذبہ عشق ایک وجدانی کیفیت ہے جس کا خاصہ انہماک اور جذبِ کلی ہے ۔ زندگی کی پوشیدہ قوتیں اسی سے پیدا ہوتی اور ترقی پاتی ہیں ۔ کائنات کی ساری رونق اور حیاتِ انسانی کی ساری گہما گہمی اسی کی وجہ سے ہے ۔یقین محکم اس کی بنیاد ، عمل پیہم اس کا اظہار اور عشق حقیقی اس کی معراج ہے ۔ عشق حقیقی کے اظہار کی دو صورتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ شاہدِ حقیقی سے ہمکنار ہونے کے بعد جب روح پر اسرارِ خداوندی ظاہر ہونے لگیں تو وہ خود کو ان میں گم کر کے حیرت سے پکار اٹھے:

یم عشق کشتیء من یم عشق ساحل من
نہ غم سفینہ دارم نہ سر کرا نہ دارم

عشق الہٰی کی یہ منزل جذب کی منزل ہے ۔یہ اولیاء اللہ کی منزل ہے جو خود کو محبوب میں گم کر دینے ہی کو کمال سمجھ لیتے ہیں ۔ ذاتی عروج ہی ان کے لئے سب کچھ ہوتا ہے مگر عشق الہٰی کا اصل اظہار مخلوق الہٰی کی محبت سے ہوتا ہے ۔اسی لئے انبیائے کرام علیہم السلام کی منزل بدرجہا بلند ہے قرب کے بلند ترین درجات پر پہنچ کر بھی وہ یہ نہیں بھولتے کہ انہیں انسانیت کو بھی نیکی اور کامیابی کی وہ راہ دکھانی ہے جس پر چل کر وہ عشق الہٰی کی معراج پر پہنچے ہیں ۔اسی طرح عشق الہٰی کے غلبہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے ان کی محبت کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ عشق تھا ۔ ان کے دائرہء عشق کی وسعت نے تمام کائنات کی ہر شئے کو سمیٹ لیا اور اس طرح فیضیاب کیا کہ ذرے بھی آفتاب بن کر چمکنے لگے اور بھٹکے ہوئے بھی صحیح راہوں پر گامزن ہو گئے ۔اسی لئے رب العالمین سے رحمتہ اللعالمین کا اعزاز پایا ۔آپ کی پوری زندگی انسانیت ، فلاح و بہبود کے لئے وقف رہی ۔ ان کی انسانی دوستی ، دردمندی ، ضبط و تحمل ، ایثار و سخاوت ، شجاعت و عدالت وغیرہ سب کچھ اسی عشق الہٰی کا نتیجہ ہے ۔آپ نے ان اعلیٰ انسانی قدروں پر اس طرح عمل کیا کہ خود ان قدروں کی عظمت و بزرگی کو چار چاند لگ گئے ۔

اولیائے عزلت و اولیائے ارشاد:

اولیاء اللہ دو قسم کے ہوتے ہیں: اولیائے عزلت اور اولیائے ارشاد۔ اولیائے ارشاد کا کام تبلیغ و رشد وہدایت ہے وہ عوام کے درمیان عوام ہی کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں، جیسے کہ انبیاء علیہم السلام لوگوں کے درمیان انہیں کی طرح رہتے ہیں اور اسی لئے ان پر اس طرح کا اعتراض ہوتا ہے کہ مالھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق (الفرقان آیت ۷) (اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ ہماری طرح کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے) یہ اولیائے ارشاد ان عام مصائب سے بھی دوچار ہوتے ہیں جو عوام کو درپیش ہوں۔ فرق یہ ہے کہ عوام کے مقابلے میں ان کے دل بے خوف ہوتے ہیں۔ اور اولیائے عزلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکوینی امور پر مامور ہوتے ہیں اور وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتے، جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں جیسے کہ خضرؑ۔ حتیٰ کہ ان کا بیٹا بھی اگر ان کے سامنے بلکہ ان کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے تو ہو جائے اور وہ دم نہیں مار سکتے۔ جیسے کہ پولیس کے سپاہی کہ حکم کی وجہ سے مجبور ہوتے ہیں اور اپنے ہی آدمیوں اور اپنے ہی بچوں پر لاٹھی اور گولی چلاتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک شخص کو اگر اس خدمت پر مامور کر دیا جائے تو وہ ہمیشہ اس خدمت پر مامور رہے۔ جب خدمت اس کی برداشت سے باہر ہو جائے یا اس سے کوئی نافرمانی یا گستاخی ہو جائے تو اسے بدل دیا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ کوئی صاحب سمندر کے کسی حصے پر مامور تھے، بارش ہونے لگی انھوں نے سوچا یا کہا کہ خداوندیہاں تو پہلے سے پانی ہی پانی ہے اس پر پانی برسنے میں کیا مصلحت ہے۔ اسی گستاخی پر انھیں خدمت سے ہٹا دیا گیا۔ عبدالوہاب شعرانی اور صاحب فتوحات مکیہ وغیرہ جیسے لوگ اس نظام کے قائل ہیں اور بہت سے ایسے واقعات بھی معتبر طریقے سے سنے ہیں کہ اس نظام سے انکار کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارے ایک چچا جو شیعہ تھے، چونکہ ہمارے خاندان میں خود کاشت زمینداری تھی چچا اس سے بددل ہو گئے اور پنجاب میں جاکر کسی ٹھیکیدار کے پاس مزدوروں کی نگرانی کے لئے میٹ کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ انھوں نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ مجھے کچھ مزدوروں کی ضرورت پیش آئی، میں تلاش کے لئے نکلا، جنگل میں لٹھ لئے ایک مجذوب ملے جنہیں اس اطراف کے لوگ جانتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہاں جاتا ہے؟ میں نے کہا مزدوروں کی تلاش میں ہوں۔ کہا کہ مزدور تجھے فلاں اسٹیشن پر ملیں گے وہاں چلا جا۔ پھر وہ میرے ساتھ بستی

میں آئے ۔ ایک بھٹیارن روٹیاں پکا رہی تھی، اس سے کہا کہ چار روٹیاں دیدے ۔ اس نے دے دیں ۔ انھوں نے وہ روٹیاں مجھے دیں اور کہا کہ رکھ لے اب تجھے تیسرے وقت کھانا ملے گا اس لئے ان روٹیوں کو احتیاط سے صرف کرنا ۔ پھر وہ میرے ساتھ اسٹیشن آئے ۔ اسٹیشن ماسٹر انھیں دیکھ کر بھاگا ۔ انھوں نے آواز دی کہ بھاگ مت، میری بات سن، اس آدمی کو فلاں اسٹیشن جانے کے لئے گاڑی میں بٹھادے ۔ چنانچہ ایک گاڑی آئی اسٹیشن ماسٹر نے اس پر مجھے بٹھادیا، میں اس اسٹیشن پر اترا تو جتنے مزدور مجھے درکار تھے اتنے ہی اسٹیشن سے باہر بیٹھے تھے ۔ فرمایا کہ چچا نے یہ بھی بیان کیا کہ ایک مرتبہ مجھے ملتان جانا تھا، میں اسٹیشن کے لئے روانہ ہوا تو جنگل میں پھر وہ مجذوب مل گئے ان کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ ملتان جانا ہے ۔ کہا چل میں تجھے پہنچادوں ۔ میرا ہاتھ پکڑا، تھوڑی دور تک ایک دو موڑ طے کرائے اور کہا کہ دیکھ وہ شہر نظر آرہا ہے وہی ملتان ہے، میں ملتان پہنچ گیا ۔

ضمنیت:

ہمارے سلسلہء عالیہ کے ایک بزرگ خواجہ شاہ ابو سعید صاحب قدس سرہ العزیز جو نسبتاً و مشرباً مجددی ہیں اور حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلوی قدس سرہ العزیز کے اجل خلفاء میں سے ہیں، اپنی کتاب ہدایۃ الطالبین ص ۱۳۰ پر ضمنیت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں جس کا ترجمہ ص ۱۳۱ پر اس طرح درج ہے " جاننا چاہیے کہ برسوں سے میری آرزو تھی کہ حضرت پیر دستگیرؒ اس بندے کو اپنی ضمنیت سے سرفراز فرمائیں کیونکہ آپ کی ضمنیت بعینہٖ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ضمنیت ہے ۔ اس لئے کہ حضرت پیر دستگیرؒ کو حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہید قبلہ رضی اللہ عنہ نے اپنی ضمنیت کی بشارت دی تھی اور حضرت میرزا صاحب قبلہ کو حضرت شیخ الشیوخ خواجہ محمد عابد سنامی رضی اللہ عنہ سے ضمنیت حاصل ہوئی تھی اور انھوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ضمنیتِ کبریٰ کا امتیاز حاصل کیا تھا ۔ حضرت پیر دستگیرؒ کی خدمت میں بارہا میں نے عرض کیا تب جاکر ۱۲۳۰ھ کے ماہِ صفر میں بندہ نے حضرتؒ کے روبرو اوابین کے نوافل میں پورا قرآن مجید ختم کیا ۔ ختم قرآن مجید کے بعد حضرتؒ نے بندہ سے ارشاد فرمایا کہ ہم سے جو چیز مانگنی ہو مانگو ۔ بندہ نے عرض کیا کہ حضرت کی ضمنیت کا امیدوار ہوں ۔ اس پر آپ نے بڑی نوازش سے بندہ کو اپنے قریب بلا کر اپنے سینہء مبارک سے لگایا اور دیر تک توجہ فرماتے رہے ۔ اس وقت مجھ پر ایسے

احوال وارد ہوئے کہ ان کا اظہار ناممکن ہے اور حضرت پیر دستگیرؒ کے انوارِ مبارک میں ایسا استغراق ہوا کہ میں نے دیکھا کہ میرا باطن آئینہ کی مانند حضور کے باطن مبارک کے محاذی و مقابل ہوا اور جو کچھ بھی حضرتؒ کے باطن میں موجود ہے، بعینہٖ میرے باطن میں اس طرح نمودار ہوا کہ ہر دو باطن میں کوئی فرق باقی نہ رہا، الاماشاء اللہ سبحانہ (مگر جو اللہ سبحانہ نے چاہا)، الخ۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوا کہ ضمنیت کا معاملہ سلسلہء عالیہ کے مروجہ اسباق سے ماوراء ہے اور بعض خاص الخاص مریدوں کو ان کے مرشد اس کی بشارت دیتے اور اس مقام کی توجہ دے کر اس مقام سے سرفراز فرماتے ہیں۔ اس کے حصول کی علامت یہ ہے کہ وہ خاص الخاص مرید اپنے پیر کے تمام کمالات اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، جو کچھ پیر کے باطن میں ہوتا ہے وہ اس مرید کے باطن میں بعینہٖ نمودار ہوتا ہے اور ہر دو باطن میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ الاماشاء اللہ۔ جب یہ کیفیت اس مرید میں پیدا ہو جاتی ہے اور قرار پکڑ لیتی ہے اور شیخ اپنے اس مرید کو ضمنیت کے حصول کی بشارت دے دیتا ہے تو اس کے حق میں ضمنیت متحقق ہو جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں مزید عرض یہ ہے کہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے تفسیر عزیزی پارہ عم میں ایک مقام پر توجہ کی تاثیر کی اقسام بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک قسم تاثیر اتحادی تحریر فرمائی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تاثیر کی یہ قسم سب قسموں سے زیادہ طاقت رکھتی ہے کہ اس سے جو کمالات شیخ کی روح میں ہیں وہ طالب کی روح میں سما جاتے ہیں اور بار بار فائدہ لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر شیخ کی توجہ قوی الاثر ہو اور مرید بھی قوتِ قوی رکھتا ہو تو شروع میں بھی یہ نسبت حاصل ہو جاتی ہے جیسا کہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی یہ تاثیر توجہ ایک نانبائی کے حق میں ظہور پذیر ہوئی اور ابتدائے وحی کے وقت جو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر بھینچا (دبوچا) تھا تو اس سے تاثیر اتحادی کا اظہار ہوتا تھا۔" اس اقتباس سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب سالک اپنے اندر اس قدر صلاحیت پیدا کر لیتا ہے کہ تاثیر اتحادی سے فیضیاب ہو سکے تو شیخ اس کو تاثیر اتحادی سے فیضیاب اور اپنی ضمنیت کی بشارت سے سرفراز فرماتا ہے اور یہ بات سالک کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کا رابطہ اپنے شیخ کے ساتھ اس درجہ اقویٰ و اکمل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے شیخ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اور اس شعر کے مصداق ہو جاتا ہے۔

من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تو وہ بزرگ اس شخص کو تاثیرِ اتحادی کی توجہ دیتا اور اپنی ضمنیت کی بشارت سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس وقت وہ مرید اپنے مرشد کے تمام فیوضات و کمالاتِ ظاہری و باطنی، جلی و خفی کو پوری طرح اپنے اندر جذب کرلیتا ہے۔ اگر کسی شخص کو کامل فنائے نفس، شرحِ صدر، اطمینان و اخلاص کامل حاصل ہونے کے بعد مذکورہ بالا کمال نسبتِ رابطہ و تاثیرِ اتحادی بھی حاصل ہو جائے تو اس شخص کو اپنے شیخ کی ضمنیت سے سرفراز سمجھا جاسکتا ہے خواہ شیخ نے بشارت دی ہو یا اس کا موقع نہ مل سکا ہو، لیکن سالک کو ڈرتے رہنا چاہئے اور بشارتِ مرشد کے بغیر اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے سے گریز کرنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ نفس کی ملاوٹ اس کے شامل حال ہو گئی ہو اور وہ اس سے بے خبر ہو، کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے:

ہر چند کہ نفس مطمئنہ گردد
ہرگز زصفات خود نہ گردد

حضرتِ مجدد الف ثانی قدر سرہ کی عبارتوں یا کسی تحریر سے کبھی بھی یہ شبہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ حضرتِ مجددؒ اپنا مقام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اونچا سمجھتے تھے یا اپنے اکابر سے اونچا سمجھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ ترین امتی بھی اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ یا اکابر امت پر تفوق کا شائبہ پایا جائے، تو پھر حضرت مجدد الفِ ثانی قدس سرہ جیسا محدث و فقیہ اور علم کلام کا امام و مجتہد ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہے۔ یہ سب ہم جیسے ناقص العقل والفہم کے علم و فہم کا قصور ہے کہ ان عبارتوں سے ایسے شبہات ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس قسم کے شکوک و شبہات حضرت مجدد صاحب قدس سرہ کے زمانہ میں بھی بعض کم فہموں کے ذہنوں میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت موصوف نے بعض شکوک کے جوابات بہ نفس نفیس دیئے تھے۔ چنانچہ مکتوب نمبر ۲۰۲ دفتر اول میں تحریر فرماتے ہیں: "دوسرے یہ کہ جو شخص اپنے آپ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل جانے اس کا امر دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل ہے (چند سطروں کے بعد) وہ شخص جو حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل کہے اہل سنت و جماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے جو اپنے آپ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھے، حالانکہ اس گروہ میں یہ بات مقرر ہے کہ اگر کوئی سالک اپنے آپ کو خارش زدہ کتے سے بہتر جانے تو وہ ان بزرگوں کے کمالات سے محروم ہے۔" جن عبارتوں سے یہ

شک شبہ قائم ہوتا ہے وہ مکاشفات عینیہ کی ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرت مجدد صاحب قدس سرہ کے مکاشفات ہیں جن کو آپ نے تحدیثِ نعمت اور طالبین کے استفادہ کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ اس راستہ میں ہر شخص کو کچھ نہ کچھ انکشافات پیش آتے ہیں اور ہر مرید اپنے پیر کو بیان کرتا ہے تاکہ اس کی اصلاح ہو جائے اور بزرگان دین دوسروں کے استفادہ کے لئے تحریر فرماتے ہیں۔ ہر بزرگ اپنے اپنے مقام اور اپنی اپنی رسائی کے مطابق ان کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت مجدد صاحب موصوف نے اپنے مقام اور اپنی رسائی کے مطابق ان کو تحریر فرمایا ہے بلکہ وہ خود ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "ہم نے صرف وہ باتیں یا مقامات نقل کئے ہیں جن کی عام لوگوں تک رسائی ہو سکے ورنہ ایسے پوشیدہ راز بھی ہیں کہ اگر ان کو اشارۃً و کنایۃً ظاہر کیا جائے تو حلقوم کاٹ دینے کی نوبت آجائے۔" یہی مضمون مشہور راوی احادیث صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کا علم حاصل کیا ایک وہ جو میں آپ لوگوں میں پھیلاتا ہوں دوسرا وہ ہے کہ اگر میں اس کو لوگوں میں بیان کردوں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے (او کما قال رضی اللہ عنہ)۔

کشف و الہام کا سلسلہ صوفیہ بلکہ غیر صوفیہ اور علماء سب کے نزدیک مسلم ہے اگرچہ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دین کتاب و سنت کے ذریعہ کامل ہو گیا تو کمال کے بعد کشف و الہام کی کیا ضرورت ہے اور وہ کون سی کمی ہے جو الہام سے پوری ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ مکتوب نمبر ۵۵ دفتر دوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ "الہام دین کے پوشیدہ کمالات کو ظاہر کرنے والا ہے نہ کہ دین میں زیادہ کمالات کا ثابت کرنے والا، جس طرح اجتہاد احکام کا مظہر ہے اسی طرح الہام ان دقائق و اسرار کا مظہر ہے جو اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اگرچہ اجتہاد و الہام میں فرق واضح ہے کہ وہ رائے کی طرف منسوب ہے اور یہ رائے کے پیدا کرنے والے اللہ جل شانہ کی طرف منسوب ہے۔ پس الہام میں ایک قسم کی اصالت پیدا ہو گئی جو اجتہاد میں نہیں۔" اسی مکتوب میں کچھ پہلے فرماتے ہیں "الہام انہی کے لئے ہے اور کلام انہی کے ساتھ مخصوص ہے ان کے اکابر علوم و اسرار کو بلاواسطہ اصل سے اخذ کرتے ہیں اور جس طرح مجتہد اپنی رائے و اجتہاد کا تابع ہوتا ہے، یہ حضرات بھی معارف و مواجید میں اپنی فراست و الہام کے تابع ہیں۔" اس عبارت سے معلوم ہوا کہ الہام کا حکم صاحب الہام کے حق میں مخصوص ہوتا ہے، بخلاف اجتہادِ مجتہد کے کہ وہ عامۃ المسلمین کے لئے عام ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی مضمون کو مکتوب

نمبر ۱۳۱ دفتر اول میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں "حاصل کلام یہ ہے کہ خطائے کشفی خطائے اجتہادی کا حکم رکھتی ہے کہ ملامت و عتاب اس سے دور کر دیا گیا ہے بلکہ ثواب کے درجات میں سے ایک درجہ ثواب اس کے حق میں ثابت ہے۔ البتہ ان دونوں میں اس قدر فرق ہے کہ مجتہد کی تقلید کرنے والے لوگ بھی (حصول ثواب کے بارے میں) مجتہد کا حکم رکھتے ہیں اور مجتہد کے خطا پر ہونے کی صورت میں بھی ثواب کے درجات میں سے ایک درجہ ثواب پا لیتے ہیں، بخلاف اہل کشف کے مقلدین کے کہ وہ معذور نہیں ہیں اور کشف میں خطا ہو جانے کی صورت میں ثواب کے درجے سے محروم ہیں کیونکہ الہام اور کشف غیر پر حجت نہیں ہیں اور مجتہد کا قول غیر پر حجت ہے۔ پہلی (اہل کشف کی) تقلید خطا کے احتمال کی بنا پر جائز نہیں ہے اور دوسری (مجتہد کی) تقلید خطا کے احتمال کی بنا پر جائز بلکہ واجب ہے۔" ایک جگہ فرماتے ہیں "ان (صوفیہ) کے امور کے ساتھ ایمان لانا لازمی نہیں ہے، ہاں ان امور کے انکار سے بچنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ ان امور کا انکار ان امور والوں کے انکار تک پہنچا دے اور حق تعالیٰ کے اولیاء کے ساتھ بغض پیدا ہو جائے۔ علمائے اہل حق کے عقائد کے موافق عمل کرنا چاہئے اور صوفیہ کی کشفیہ باتوں سے حسن ظن کے ساتھ سکوت اختیار کرنا چاہئے اور لا و نعم پر جرأت نہیں کرنی چاہئے (مکتوب نمبر ۲۷۲ دفتر اول)

مکاشفات و مشاہدات کے بارے میں مکتوب نمبر ۲۰۷، دفتر اور میں تحریر فرماتے ہیں:
"عجب کاروبار ہے کہ اگر ان مشاہدات و تجلیات کی حقیقت پوری طرح بیان کی جائے تو اس بات کا خوف ہے کہ اس راستے کے مبتدیوں کی طلب میں فتور اور ان کے شوق میں قصور واقع ہو جائے گا اور ساتھ ہی اس بات کا بھی ڈر ہے کہ اگر علم کے باوجود کچھ بھی نہ کہے تو حق باطل کے ساتھ ملا رہے گا۔"

رابطہ شیخ:

اگر مرید موسوی المشرب ہو اور شیخ محمدی المشرب تو مضبوط رابطہ شیخ کے بعد مرید پیر سے پیوند ہو جاتا ہے اور محمدی المشرب فیض حاصل کرتا ہے اگرچہ اس میں اور اصل محمدی المشرب میں فرق ہوتا ہے۔

معارفِ اسم ظاہر:

اس سے مراد وہ معارف و تجلیات ہیں جو سالک کے ادراک و تعبیر میں آسکتی ہیں جیسا کہ تجلیاتِ اسماء و صفاتِ تعالیٰ و تقدس اور یہ جو بعض عارفوں نے کہا من عرف اللہ طال لسانہ (جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا اسی کی زبان دراز ہو گئی) یہ معرفت اسم الظاہر کے معارف سے وابستہ ہے۔

معارفِ اسم باطن:

اس سے مراد وہ تجلیات و معارف ہیں جو کہ بے چونی و بے کیفی کے باعث سالک کے ادراک سے بلند ہیں اور یہ جو بعض عارفوں نے فرمایا من عرف اللہ کل لسانہ (جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا اس کی زبان گونگی ہو گئی) یہ معرفت اس باطن کے معارف سے وابستہ ہے۔

عروج: اس سے مراد اوپر کے مقام میں ترقی کرنا اور سالک کا حق تعالیٰ کی ذات و صفاتِ عالیہ کے مشاہدہ میں مستغرق ہو جانا اور مخلوق سے منقطع ہونا ہے۔

نزول: اس سے مراد اپنی تکمیل کے بعد دوسروں کی تکمیل و ارشاد کے لئے مخلوق کی طرف متوجہ ہونا۔ اصطلاح میں اس کو سیر عن اللہ باللہ کہتے ہیں۔ مراتب نزول کی انتہا مقام قلب تک ہے اور ارشاد و تکمیل اس مقام تک واپس آنے سے تعلق رکھتی ہے۔

سیر فی اللہ: اس سے مراد اسماء و صفات و شیون و اعتبارات و تقدیسات اور تنزیہات کے مراتبِ وجوب میں حرکتِ علمیہ ہے اور اسی سیر کو بقا باللہ بھی کہتے ہیں۔

مقام جذبہ: اس سے مراد سیر انفسی ہے اور اسی کو سیر فی اللہ بھی کہتے ہیں۔

صفات و شیونات:

ان میں بہت باریک فرق ہے۔ تمام صفات الہیہ خارج میں ذاتِ تعالیٰ و تقدس پر وجود

زائد کے ساتھ موجود ہیں اور شیونات محض اعتبارات ہیں جو ذات جل شانہ میں اعتبار کئے گئے ہیں

برزخ: دو چیزوں کے درمیان حائل کو کہتے ہیں اور مرنے کے بعد سے قیامت تک کے زمانے کو بھی اسی لئے برزخ کہتے ہیں۔

مقامِ قطبیت و مرتبہء فردیت:

ابدال واقطاب و اغوات و افراد و اوتاد و اخیار و ابرار اور نقباء اولیاء اللہ کے اقسام ہیں۔ ان میں سے بعض مخلوق سے پوشیدہ ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کو بھی نہیں پہچانتے اور اپنے حال کی عمدگی کو بھی نہیں جانتے اور ان میں سے بعض اہل حل وعقد ہیں اور وہ بارگاہ حق جل مجدہ کے سردار ہیں۔

سیر عنِ اللہ باللہ: علم اعلیٰ سے علم اسفل کی طرف اور پھر اس اسفل سے دوسرے اسفل کی طرف حرکتِ علمیہ کا نام ہے۔

جذبہ و سلوک: جذبہ سیر انفسی کو کہتے ہیں اور سلوک سیر آفاقی کو کہتے ہیں۔

مراقبہ اور خواب:

مراقبہ اور خواب میں فرق ہے۔ خواب میں دو طرح کی چیزیں نظر آتی ہیں، یا تو ان کا تعلق لاشعور سے ہوتا ہے کہ نیند کی حالت میں جب شعور معطل ہو جاتا ہے تو لاشعور بیدار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی چیزیں ماضی کے واقعات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور یا وہ چیزیں عالم مثال کی ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی تعبیر وہی بتا سکتا ہے جو قرآن و حدیث اور بزرگوں کے احوال و اقوال سے زیادہ سے زیادہ واقف ہو، تاکہ اسے اس پر عبور ہو کہ کس چیز کی مثالی شکل کیا ہے، مثلاً حضور علیہ الصلوۃ السلام نے شبِ معراج میں بعض دوزخیوں کی مخصوص حالت دیکھی تو یہ مثالی شکل تھی کیونکہ دوزخ تو ابھی دوزخیوں سے آباد نہیں ہوئی اور مراقبہ میں جو چیز دفعتہ بلا توجہ پہلی بار آتی ہے وہ واردات کے قبیل سے ہوتی ہے، پھر اس کے متعلق مزید کوئی خیال آنا یہ واردات کے قبیل سے بھی ہو سکتا

ہے اور دماغ کا عمل بھی اور اس کا فیصلہ خود صاحبِ واردات ہی کر سکتا ہے۔

خواب، واقعہ، مشاہدہ:

خواب، واقعہ اور مشاہدہ یہ تینوں مختلف چیزیں ہیں۔ جب سونے کے ارادہ سے لیٹے تو سونا اصالتہً ہوگا اور ذکر طبعاً اور جب مراقبہ میں بیٹھے اور نیند آجائے تو اس میں ذکر اصالتہً ہوگا اور نیند طبعاً۔ سونے کی حالت میں جو نظر آئے گا وہ خواب کہلائے گا اور وہ ضعیف ہوتا ہے اور مراقبہ میں نیند اور غفلت کی حالت میں جو نظر آئے وہ واقعہ کہلاتا ہے اور یہ خواب سے قوی ہوتا ہے اور اگر مراقبہ اور ذکر کی حالت میں بیٹھے اور نیند اور غفلت نہ ہو اور پھر کچھ نظر آئے خواہ آنکھیں بند ہوں یا کھلی آنکھوں سے کچھ نظر آئے تو اسے مشاہدہ کہتے ہیں۔ بند آنکھوں کی طرح کھلی آنکھوں سے بھی نظر آتا ہے اور حواس پر حال کا غلبہ ہوتا ہے۔ جیسے کہ انبیاء علیہم السلام کو سب کی موجودگی میں فرشتے نظر آتے ہیں اور دوسروں کو نظر نہیں آتے، یا جیسے قریب المرگ شخص کو ارواح اور فرشتے نظر آتے ہیں جبکہ پاس بیٹھنے والوں کو نظر نہیں آتے۔ مشاہدہ، واقعہ سے بھی قوی ہوتا ہے۔

قیومیت کے معنی:

عالم تجلیات صفات کا مظہر ہے لیکن تجلیاتِ ذات کا مظہر بھی کسی کو ہونا چاہئے اور وہی قیوم ہوتا۔ قیوم اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور آپ کے بعد بھی ہر دور میں قیوم ہوتے رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پہلے قیوم کے بجائے ان کے لئے اور کوئی اصطلاح تھی اور اب مجدد صاحبؒ نے یہ اصطلاح اختیار فرمائی۔ میرے ذہن میں قیومیت کے یہ معنی آتے ہیں کہ عالم کا قیام مادی وسائل کی فراہمی سے نہیں بلکہ اصل میں ذکر اللہ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب روئے زمین پر ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا نہ ہوگا تو قیامت آجائے گی، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے، اور یہ لوگ چونکہ ذکر اللہ کرتے اور ذکر اللہ کے سلسلہ کو جاری کرتے ہیں اس لئے وجہ قیام عالم بنتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ایک قیوم کے بعد دوسرا قیوم اس کے فوراً بعد ہو بلکہ پہلے قیوم کا فیض کم ہونے لگتا ہے اور دوسرے قیوم کی ضرورت ہوتی ہے تب دوسرا قیوم مقرر کیا جاتا ہے۔

حضوری کا مطلب:

اگر انسان خدا کو حاضر و ناظر جانے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ گناہ سے نہ بچے۔ گناہ کرنے سے پہلے ضرور خوفِ خدا پیدا ہو گا اور یہی حضوری ہے کہ ہر وقت اور ہر کام میں خدا کے احکام کا دھیان رہے۔

مجددی علوم:

عشق دو طرح کا ہوتا ہے، ایک یہ کہ محب محبوب کو چاہے، اس میں آہ و بکا زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ محبوب محب سے محبت کرے اس میں تازگی ہوتی ہے۔ محبوب مراقبہ میں بیٹھتا ہے، روتا دھوتا زیادہ نہیں، جیسے آئینہ کہ چل کر نہیں جاتا بلکہ نور کے ذریعے شئے کی شکل کو اپنے اندر لے لیتا ہے ایسے ہی محب چل کر نہیں جاتا بلکہ دل میں عکس لے لیتا ہے۔ یہ باتیں حضرت مجدد صاحبؒ نے بتائی ہیں ان سے پہلے کسی نے نہیں بیان کیں۔ حضرت مجدد صاحبؒ کو جیسے عمدہ علوم دیئے گئے ویسا ہی عمدہ اندازِ بیان بھی دیا گیا۔ عجیب طرزِ بیان ہے، عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اشعار ایسے موقع پر بٹھاتے ہیں جیسے اسی موقع کے لئے بنے ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بعض مسائل شافعیہ سے لئے ہیں اس لئے کہ ان کے استاد شافعی تھے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ کمالات ولایت والے تھے لہذا شافعی المسلک سے مناسبت تھی، اسی لئے کئی مسائل ان کے اپنائے۔

ولایت موسوی و محمدی:

جب سالک پر ذکر کے اثرات و کیفیات نمایاں ہوتی ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ سالک کا قدم کس ولایت میں ہے۔ ایک تو یہ طریقہ ہے کہ کسی بزرگ آدمی کو بذریعہ الہام معلوم ہو جائے جیسے ایک بزرگ نے اپنے ایک مرید کو کسی دوسرے بزرگ کے پاس بھیجا کہ جاکر معلوم کرو کہ میرے شیخ کس نبی کے قدم پر ہیں۔ مرید گیا تو جاتے ہی اس مرید نے سلام کیا۔ ان بزرگ نے وعلیکم السلام کے بعد فرمایا کہ ہمارے یہودی کا کیا حال ہے؟ مرید نے واپس آکر یہ بات بتائی تو ان کو معلوم ہو گیا کہ میرا قدم ولایتِ موسوی میں ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سالک کی کیفیات و

واردات سے اس کی ولایت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی (سالک) کو صحیفہ شریفہ کی تلاوت کا بہت شغف ہے یعنی اس کو اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کا بہت شوق ہے تو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صفات میں سے ایک صفت ہے یا اس سالک کو شریعت کے خلاف کاموں کو دیکھنے سے بہت غصہ آتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور سے واپسی پر جب قوم کو گمراہی میں مبتلا دیکھا تو ہارون علیہ السلام پر غصہ ہوئے، حتیٰ کہ انھوں نے کہا یا ابن ام لا تاخذ بلحیتی و لا برا سی۔ تو اگر ایک سالک کی طبیعت میں مندرجہ بالا صفات پائی جائیں گی تو وہ ولایتِ موسوی میں قدم رکھتا ہو گا۔ اگر سالک کو توکل کی خاص کیفیت حاصل ہو، خصوصاً رزق کے معاملہ میں اسے اللہ تعالیٰ کی پاک ذات پر کامل یقین ہو اور اس کے قلب و عمل سے واضح ہو کہ اسباب کی اس کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں، یا وہ سالک اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اوامر میں کوئی رعایت نہ کرتا ہو، تو ایسا سالک ولایتِ ابراہیمی کے مشرب میں شمار ہو گا اور اگر کسی سالک کو شرع شریف پر عمل خصوصاً اتباعِ سنت میں خاص رنگ نصیب ہو اور اخلاق حمیدہ سے متخلق ہو اور جذبہ قوی رکھتا ہو تو ایسا سالک ولایتِ محمدی کے مشرب کا ہو گا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب الہام و کیفیات دونوں سے سالک کے مشرب کی تصدیق ہو تو صحیح ہوتا ہے اور اس کی خوشخبری شیخ کامل سالک کو دیا کرتا ہے۔

کمالاتِ نبوت و ولایت:

تمام دین کا نچوڑ چار فقہیں ہیں اور وہ چار سمٹ کر دو میں آجاتی ہیں۔ حنفی، شافعی۔ حضرت مجدد صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفی المسلک میں کمالاتِ نبوت غالب ہیں اور شافعی المسلک میں کمالاتِ ولایت۔ اس لئے ان علاقوں میں ابدال اقطاب زیادہ ہوتے ہیں جہاں شافعی المسلک ہو۔ نیز فرمایا کہ کمالاتِ ولایت والے حضرات سے خوارق عادات زیادہ ظاہر ہوتی ہیں کیونکہ وہ عروج میں رہتے ہیں۔ ادھر کمالاتِ نبوت والوں میں زیادہ نہیں ہوتیں، جیسے صحابہؓ سے بہت کم واقعات منقول ہیں۔ کمالاتِ ولایت والے مجذوب ہوتے ہیں اور کمالاتِ نبوت والے سالک۔ کمالاتِ ولایت والے سُکر کی وجہ سے شریعت کے مکلف نہیں ہوتے اور کمالات نبوت والے صحو میں ہونے کی وجہ سے مکلف ہوتے ہیں۔ کمالاتِ نبوت والے مُراد ہوتے ہیں اور کمالاتِ ولایت والے مُرید ہوتے ہیں۔ نیز فرمایا کمالاتِ نبوت والے صاحب ارشاد ہوتے ہیں اور کمالاتِ ولایت

والے عزلت گزیں ہوتے ہیں ۔ کمالاتِ نبوت والوں کو پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ ان کا ظاہر عوام کے ظاہر کے ساتھ ہوتا ہے لیکن باطن اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور باطن کا پتہ مشکل سے لگتا ہے اسی لئے لوگ کہتے تھے کہ یہ کیسے رسول ہیں جو کھاتے پیتے ہیں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں ۔ لوگ ظاہر سے دھوکہ کھالیتے ہیں ۔

مبدأتعین:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بہت بلند ہے ۔ بموجب حدیثِ قدسی اللہ تعالیٰ ایک مخفی خزانہ تھا، اسے خواہش ہوئی کہ اسے پہچانا جائے، چنانچہ اس نے مخلوقات کو پیدا کیا بعض حضرات کہتے ہیں کہ خدا کا پہلی بار مخلوق کے پیدا کرنے کا علم یہ تعین اول ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ ارادہ (تخلیق) تعین اول ہے ۔ لیکن مجدد صاحبؒ کہتے ہیں کہ "حب" (یہ چاہنا کہ مجھے پہچانا جائے) یہ تعین اول ہے ۔ اور سب سے پہلے جس کی تخلیق ہوئی وہ نورِ محمدی ہے اور یہی حب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مبدأتعین ہے ۔ فرمایا کہ ہر سالک کے لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات میں سے ایک مبدأتعین ہوتا ہے اور اس کی رسائی اپنے مبدأتعین ہی تک ہوتی ہے اور اس کا وہی مقام ہوتا ہے ۔ اگر کسی سالک کو اپنے مبدأتعین سے اوپر کی سیر ہو تو وہ نظری ہوگی، اس کا مقام نہ بنے گی ۔ جیسے کہ کراچی میں، ہمارا گھر، ہمارا اصل مقام ہے، چاہے کہیں گھوم پھر آئیں مقام یہی رہے گا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی، ہر نبی کو معراج ہوئی اور ہر ایک کی رسائی معراج میں اس کے مبدأتعین تک ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسائی معراج میں اپنے مبدأتعین یعنی مقام حب تک ہوئی اور یہ تعین اول ہے ۔ اس سے اونچا مخلوقات کے لئے کوئی مقام ہی نہیں کیونکہ اس سے اوپر لاتعین کا مقام ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام اس قدر اونچا ہے کہ اس کے پیش نظر یہ کہنا گستاخی ہے کہ آپ بڑے بھائی کے برابر ہیں ۔ میں نے عرض کیا کہ بڑا بھائی کہنا تو ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ الی عاد اخاھم ھودا یا الی ثمود اخاھم صالحا ۔ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرمائے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے لئے یہ فرمائیں تو مضائقہ نہیں لیکن دوسروں کی زبان سے گستاخی معلوم ہوتی ہے ۔

مبداء فیض:

عرض کیا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کا مبداٗفیض ایک ہی ہے۔ (یعنی شان علم) اس کی وجہ کیا ہے ؟ فرمایا کہ بیشک دونوں کا مبداٗفیض ایک ہی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبداٗفیض کی حیثیت ایسی ہے جیسے دائرے میں مرکز کی حیثیت ہے اور محیط کی حیثیت حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ اب باہر سے مرکز میں جانے کے لئے محیط سے ہو کر جانا پڑتا ہے اس لئے آپ کی امت کو ملت ابراہیمی فرمایا۔

انبیاء سے فیض:

ہر نبی کا تعلق اللہ تعالیٰ سے دو قسم کا ہے، ایک براہِ راست اور ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں انبیاء علیہم السلام کے یثاق کا ذکر ہے وہاں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ذکر پہلے ہے اور اسی لئے اول ما خلق اللہ نوری (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا فرمایا ہے) کی تصدیق ہوتی ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون۔ کل امن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ (البقرہ، آیت ۲۸۵)، (مان لیا رسولؐ نے جو کچھ نازل ہوا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی۔ سب نے مانا اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو۔ اور کہتے ہیں کہ ہم جدا نہیں کرتے کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے)، تو ہر نبی کا ہمیں فیض ملتا ہے اور یہ فیض وہ ہوتا ہے جو انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرتؐ کے واسطے سے ملا ہے۔

سلبِ نسبت اور قبض:

عرض کیا کہ بہت دن سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نسبت سلب ہو گئی ہے، نہ اوراد میں جی لگتا ہے اور نہ عبادات میں۔ فرمایا کہ یہ نسبت کا سلب ہونا نہیں قبض کی کیفیت کہلاتی ہے۔ نسبت تو کفر، شرک، بدعات یا کبائر میں ابتلاء سے سلب ہوتی ہے لیکن قبض کی کیفیت منتدی سے

منتہی تک سب پر طاری ہوتی رہتی ہے۔ جب یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو انسان یہ سمجھتا ہے کہ شاید اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے چنانچہ وہ توبہ و استغفار کرتا ہے اور بسط کے مقابلہ میں زمانہ قبض کے توبہ و استغفار میں زیادہ خلوص ہوتا ہے۔ قبض کی کیفیت طاری ہو تو استغفار اور لاحول و لاقوۃ الا باللہ کثرت سے پڑھنا چاہیئے اور تکلف کرکے اوراد و عبادات ادا کرنا چاہیئے۔ اوراد و مراقبہ میں ناغہ نہیں کرنا چاہیئے، چاہے تھوڑی دیر ہی کرے۔ کبھی موسم کی خرابی بھی قبض کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ فرمایا کہ قبض بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کیونکہ اس کے بعد جب دوبارہ بسط ہوتا ہے تو زیادہ قوت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر درخت کی جڑ میں مسلسل پانی کھڑا رہے تو یہ درخت کے لئے نقصان دہ ہے۔ کاشتکار کرتا یہ ہے کہ پانی دیتا ہے پھر بند کر دیتا ہے، حتیٰ کہ جڑوں میں کچھ خشکی آجائے اور پھر دوبارہ پانی دیتا ہے۔ اس طرح پانی دینے سے درخت زیادہ قوی و شاداب ہوتا ہے اور اچھی طرح نشو و نما پاتا ہے۔

نسبت سلب ہونا:

نسبت نام ہے اس تعلق کا جو بندہ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس تعلق کو کوئی سلب نہیں کر سکتا۔ البتہ کیفیات سلب کی جا سکتی ہیں۔ بندہ کا اللہ تعالیٰ سے تعلق یا نسبت، یہ بندہ کے عمل اور اخلاص کے مطابق ہوتی ہے اور یہ شیخ عطا نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ خود عطا فرماتا ہے۔ شیخ توجہ دیتے وقت کچھ کیفیات کو اپنے اندر مجتمع کرتا ہے اور پھر ان کو اپنی ہمت سے مرید پر منتقل کرتا ہے۔ یہی چیز جو شیخ دیتا ہے سلب بھی کی جا سکتی ہے اور کیفیات دینے یا سلب کرنے کا عمل بالکل مسمریزم جیسا ہے کہ عامل اگر کوئی کیفیت معمول پر طاری کرنا چاہتا ہے تو معمول کو بھی اس کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے ورنہ اثر نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر عامل کسی سے کوئی کیفیت سلب کرنا چاہیئے اور وہ معمول، ہمت کرے کہ میں سلب نہیں ہونے دوں گا تو اگر معمول کی توجہ اور ہمت قوی ہے تو اس سے یہ کیفیت سلب نہیں ہوتی۔

ذکر و جنبشِ قلب:

ایک شعر پر گفتگو ہوئی۔ شعر یہ ہے؛

از جنبش غمزہ ہائے خوتی   دارد   نگرانی   درونی

فرمایا کہ صوفیانہ رنگ میں اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ سالک قلب کی نگرانی کرتا رہتا ہے کہ وہ ہر وقت ذاکر رہے ۔ قلب کی جنبش پر ہی ذکر کا دھیان کیا جاتا ہے اور اسی کو غمزہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور قلب کا کام چونکہ خون کو پھینکنا اور سمیٹنا ہی ہے اور اس لئے اس کے غمزوں (جنبشوں) کو خونی غمزے کہنا بھی درست ہے ۔

ذکر سالک کو فنائے نفس تک پہنچاتا ہے ۔ اس سے آگے جو ترقی ہوتی ہے فکر سے ہوتی ہے اس کے بعد وہ مرحلہ بھی آجاتا ہے جب نہ ذکر سے ترقی ہوتی ہے نہ فکر سے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ترقی ہوتی ہے ۔ جیسے کسی نے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے لئے مقالہ داخل کیا تو اگر وہ پاس ہے تو یونی ورسٹی سے مطالبہ کر سکتا ہے کہ اسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملے ، اس کا حق ہے ۔ لیکن جس کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی جاتی ہے وہ اس کا ایسا حق نہیں جس کا وہ مطالبہ کر سکے ۔ کوئی یونیورسٹی جس کو چاہے دے ، جس کو چاہے نہ دے ۔

قلبِ انسانی:

انسان کا قلب سلطانی شاہراہ کی طرح ہے جس پر سے موٹریں بھی گذرتی ہیں اور گدھا گاڑیاں بھی ، گدھے اور دوسرے جانور گذرتے وقت گندگی بھی کرتے جاتے ہیں ۔ اسی طرح قلب پر رحمانی خیالات بھی گذرتے ہیں اور شیطانی بھی ، ان کو گذرنے سے کوئی نہیں روک سکتا ۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ٹریفک کے سپاہی کا سا کام کرے یعنی ہر دوسرے کو پاس کرتا رہے (یعنی آگے ۔ بڑھاتا رہے) ورنہ اگر ٹریفک کا سپاہی ہاتھ دے کر گاڑیوں کو پاس ہونے کا اشارہ نہ کرے گا تو گاڑیوں کی لائن لگ جائے گی ۔

یاد کرد:

ابتداً یاد کرد کی منزل ہوتی ہے کہ دھیان کیا جائے تو اللہ یاد آتا ہے ۔ پھر کثرت ذکر سے " یاد کرد " کی کیفیت یادداشت میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ بظاہر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ نہیں ۔ بظاہر قلب بھی ذاکر نہیں لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کا دھیان تحت الشعور میں رہتا ہے ۔ عرض کیا گیا کہ نہ زبان سے ذکر ہو اور نہ دل سے کیا پھر بھی یادداشت کی منزل میں پہنچ کر انسان ذاکر رہتا ہے ؟ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہاں ، قلبی ذکر تو اس وقت ہوتا ہے جب قلب کی طرف دماغ کی

توجہ ہو لیکن دماغ دوسرے امور کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے اور ہمہ وقت قلب کی طرف متوجہ نہیں رہ سکتا ۔ لیکن شعوری ذکر کی کثرت سے تحت الشعور میں ذکر رچ بس جاتا ہے اور اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ ہر کام کے وقت خود بخود شریعت اور سنت کی مطابقت کا خیال رہتا ہے ۔ ایک شخص اگر گھر سے یہ سوچ کر روانہ ہو کہ مجھے فلاں مسجد میں نماز پڑھنی ہے تو راستہ میں وہ دوسروں سے باتیں بھی کرتا ہے ، آدمیوں اور سواریوں کو بھی آتے جاتے دیکھتا ہے ، راستے میں دوسری مشغولیتیں بھی ہو جاتی ہیں اور ہر ہر قدم پر یہ شعور نہیں ہوتا کہ مجھے مسجد جانا ہے مجھے مسجد جانا ہے پھر بھی گھر سے مسجد کے لئے روانگی کا ارادہ کرتے وقت دماغ نے جسم کو جو حکم دے دیا تھا لاشعور جسم سے اس کی متابعت کراتا ہے اور مسجد میں پہنچا دیتا ہے ۔

سلوک میں ترقی:

ہر چیز کے جداگانہ خواص ہیں ، تلاوتِ قرآن کے مخصوص اثرات ہیں اور دوسرے اذکار کے اس کے علاوہ دوسرے مخصوص اثرات ہیں ۔ ابتدائی مرحلہ میں سالک کو ترقی کے لئے ذکر کی کثرت کرنی چاہیئے ۔ مرتبہ فنائے قلب اور فنائے نفس حاصل ہو جانے کے بعد تلاوت ، نوافل اور دوسرے دینی اشغال سے ترقی حاصل ہوتی رہتی ہے ۔ یعنی جب انسان آفاق کے ساتھ قلبی وابستگی سے بھی آزاد ہو گیا جسے فنائے قلب کہتے ہیں اور اپنی خواہشات کے تابع ہونے سے بھی آزاد ہو گیا جسے فنائے نفس کہتے ہیں تو اب وہ جو کام بھی کرے گا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرے گا اور اسے ہر کام سے ترقی حاصل ہوتی رہے گی ۔

سلوک میں دفعتہً ترقی نہیں بلکہ تدریجی ترقی ہوتی ہے جو سالک کو بعض اوقات محسوس بھی نہیں ہوتی ۔ مثلاً ایک شخص کی جیب میں سو روپے ہوں اور ان میں ایک کا اضافہ ہو جائے تو اس کی طرف کوئی اعتناء نہیں ہوتا اور اسی عدم اعتناء کی وجہ سے بعض مرتبہ وہ محسوس نہیں ہوتا ۔ البتہ اگر وہ بڑھتے بڑھتے دو سو ہو جائیں تو نمایاں طور پر اضافہ محسوس ہونے لگتا ہے ۔ فرمایا کہ سالک کو اگرچہ بعض اوقات اپنی ترقی کا احساس نہیں ہوتا لیکن اس کا شیخ اس کے مختلف آثار و قرائن سے اس ترقی کو محسوس کر لیتا ہے اور اسی لئے اس کے اسباق بڑھاتا رہتا ہے ۔

قرب بالفرائض:

فنا کے ساتھ ساتھ بقا کا مرحلہ آتا جاتا ہے اور فنائے کامل کے بعد قرب بالنوافل سے ترقی ہوتی ہے۔ اس کے بعد قرب بالفرائض کا مرحلہ آتا ہے یعنی پہلے تو وہ اپنی طرف سے جو چاہتا تھا نفل کے طور پر عبادت کرتا تھا اب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض امور پر مامور کر دیا جاتا ہے اور ان امور کی بجاآوری ہی سے اس کی ترقی ہوتی ہے، حتیٰ کہ اگر قرب بالفرائض والا فرائض کو چھوڑ کر نوافل میں مشغول ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے گرفت ہوتی ہے۔ جیسے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خلوت میں آدمیوں کو پہنچا کر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی۔ قرب بالفرائض کی صورت میں کسی کو تبلیغ، کسی کو تصنیف و تالیف، کسی کو کوئی اور کام سپرد ہوتا ہے۔

اتباعِ شریعت:

ہر شخص کی کیفیات مختلف ہوتی ہیں۔ یہ کیفیات صحیح بھی ہوتی ہیں اور ان میں قوتِ واہمہ کی خلاقی کا اثر بھی ہوتا ہے جو ہر شخص میں موجود ہے اس لئے کشف کا کوئی اعتبار نہیں اور ہو بھی تو وہ معیار نہیں۔ اصل معیار تو یہ ہے کہ اتباع رسول کی جانب کتنا میلان ہوتا ہے اور شریعت کی پابندی کا کتنا خیال رہتا ہے۔ اسی لئے خواجہ نقشبندؒ نے فرمایا کہ اگر تمام اذواق اور مواجید دے کر ہم سے اتباع رسولؐ لے لی جائے تو سراسر خسارہ ہے اور اگر اتباع رسول دے کر تمام اذواق و مواجید لے لئے جائیں تو کوئی خسارہ نہیں۔ فرمایا کہ اگر کشف ہو، اذواق و مواجید ہوں لیکن اتباع سنت و اتباع شریعت نہ ہو تو یہ کوئی محمود تبدیلی نہیں۔

استطاعت مع الفعل:

معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ مکلف (انسان) میں ہر فعل کی استطاعت اس فعل کی ایجاد سے پہلے موجود ہے اور اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ ہر فعل کی استطاعت اس کی ایجاد کے ساتھ متصل ہی ہوتی ہے۔ پس استطاعتِ فعل بمعنی قدرتِ حقیقیہ جو اکتسابِ فعل کا سبب و علت ہے۔ فرقہ ناجیہ اہل سنت کے نزدیک فعل کے ساتھ متصل ہے۔ فعل پر تقدم زمانی نہیں رکھتی جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں اور احکام شرعیہ کی تکلیف کے صحیح ہونے کا دار و مدار اس قدرت پر نہیں ہے لیکن قدرت

و استطاعت بمعنی سلامتِ اسباب و آلات و جوارح کو فعل پر تقدم زمانی حاصل ہے اور احکام شرعیہ کا مکلف ہونا اسی پر مرتب ہے اور تکلیفاتِ شرعیہ کی صحت کا دارومدار اسی پر ہے نہ کہ پہلی استطاعت پر۔

فنائے ارادہ:

اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے ارادہ کو حق تعالیٰ شانہ کے ارادہ میں فنا و گم کردے۔

حقیقیِ منتہی:

جب سالک اپنے کام کو آخر تک پہنچالیتا ہے اور نہایت النہایہ تک پہنچ جاتا ہے تو باطن کو ظاہر شریعت کے ساتھ متفق پاتا ہے اور جو مخالفت اثنائے راہ میں نظر آتی تھی وہ دور ہو جاتی ہے۔

رابطہ: پیر کی صورت کو دل میں محفوظ رکھنا رابطہ کہلاتا ہے۔

ہبوط و نزول:

سالک کا تکمیل کے بعد مخلوق کی طرف ان کی ارشاد و تکمیل کے لئے متوجہ ہونا۔

صعود و عروج: اسماء و صفات الٰہیہ میں سیر واقع ہونا۔

تلوین (طرح طرح کا ہونا):

اہل تصوف کی اصطلاح میں فقر کے ایک مقام کا نام ہے۔ مشائخ طریقت کے نزدیک تلوین سے مراد سالک کے دل کا ان احوال میں پھرنا جو اس پر گزرتے ہیں۔

تمکین: (جگہ پکڑنا، قرار پکڑنا، قدر و مرتبہ) یہ بھی سالکوں کے ایک مقام کا نام ہے اور اہل تصوف کی اصطلاح میں اس سے مراد قربِ الٰہی میں دل کے اطمینان کے ساتھ کشفِ حقیقت کا دائمی ہونا۔

فنا: اس سے مراد ذاتِ حق تعالیٰ کے مشاہدہ کے غلبہ کی وجہ سے ماسویٰ اللہ سے نسیان ہونا۔

فناءُ الفناء: اس سے مراد یہ ہے کہ اس فنا کا بھی شعور نہ رہے۔

ایمان کی صورت و حقیقت:

ایمان حقیقی کا حاصل ہونا آفاقی اور انفسی دونوں قسم کے معبودوں کی نفی پر وابستہ ہے۔ لیکن ظاہر شریعت کے حکم میں صرف آفاقی معبودوں یعنی کافروں اور فاجروں کے معبودوں کی نفی کرنے سے ایمان ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ ایمان کی صورت ہے۔ لیکن ایمان کی حقیقت انفسی معبودوں یعنی خواہشاتِ نفسانی کی نفی پر موقوف ہے۔ صورتِ ایمان کے لئے تو زائل کا احتمال ہے لیکن حقیقی ایمان اس احتمال سے محفوظ ہے۔

رقت کا ختم ہونا:

رقت وغیرہ کیفیات ختم ہونا تو کوئی فکر کی بات نہیں کیونکہ ان کیفیات کو دوام نہیں ہوتا اور اس سلسلہ میں سالک کیف سے بے کیفی کی طرف جاتا ہے، البتہ اگر خلافِ شرع امور صادر ہونے لگیں تو یہ ضرور موجبِ تشویش ہے مگر غیبت کا مرض بہت عام ہے اور بڑے بڑے لوگوں کی زبان پر آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ اور پھر غیبت کے بارے میں جو شرعی مسئلہ ہے اس کی پوری تفصیل بیان فرمائی کہ کن حالات میں جائز اور کن حالات میں حرام ہے۔ سالک کی مثال درخت کی سی ہے، ایک وقت آتا ہے کہ درخت میں کونپلیں پھوٹتی ہیں، نئے پتے نکلتے ہیں پھر نئے پتے نکلنا بند ہو جاتے ہیں۔ نئے پتے نکلنا بند ہو جانے کی وجہ سے اگر کوئی شخص سمجھے کہ درخت کی ترقی رک گئی ہے تو یہ صحیح نہیں۔ دراصل اس وقت درخت کی طبیعت اپنے تنے اور شاخوں کو موٹا اور مضبوط کرنے کی جانب مائل ہوتی ہے۔ پھر جب وقت آتا ہے تو پھر نئے پتے نکلنے لگتے ہیں۔

نیز فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر جو بھی پہلی بار حاضر ہوتا ہے اس پر رقت طاری ہوتی ہے۔ شاذ و نادر ہی اس کے خلاف ہوتا ہے۔ لیکن چند روز وہاں رہے اور بار بار مواجہہ شریف پر حاضر ہوتا رہے تو یہ کیفیت نہیں رہتی۔ فرمایا کہ یہ رقت اس وقت زیادہ

ہوتی ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ادنیٰ سی توجہ بھی اس کی طرف ہو جائے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس روحانی عالم میں نہ جانے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کن امور پر مامور ہیں۔

احادیث میں ہے کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں سلام پیش کرتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے اور جواب دیتے ہیں۔ یہ سننا اور جواب دینا روحانی ہے اور انفرادی طور سے بھی ہو سکتا ہے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ہو کہ اتنے لوگوں نے حاضر ہو کر سلام کیا اور آپ سب کو بیک وقت جواب دے دیں۔ جیسے بادشاہ مصروف ہو اور لوگ سلام کے لئے آئیں اور ملاقات نہ ہو سکے اور اس تک یہ بات پہنچادی جائے کہ فلاں فلاں لوگ آئے ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں اور بادشاہ کہہ دے کہ اچھا وعلیکم السلام کہہ دو۔

کیفیات کا ختم ہونا:

سالک کو ابتداء واردات و کیفیات ہوتی ہیں اور پھر ایک مرحلہ پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس موقع پر پیر سمجھتا ہے کہ شاید اس نے ذکر میں کمی کر دی اور سالک سمجھتا ہے کہ کثرتِ ذکر کے باوجود ان سابقہ کیفیات کا نہ ہونا کوئی بری حالت ہے اور شاید پیر صاحب کے پاس اب کچھ اور نہیں اور ان سے وابستگی میں اب کوئی فائدہ نہیں۔ یہ مقام پیر و مرید کے لئے مزلت اقدام ہے اور دونوں کو شبہات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ حالانکہ اگر ذکر و مراقبہ میں فتور نہ ہو تو یہ مقام آتا ہے کہ واردات و کیفیات ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ مصطلحہ جہل و نکارت کا دور ہوتا ہے اور یہ ترقی کی علامت ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ سالک میں دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی رغبت بڑھ جاتی ہے۔

کیفیات کو ضبط کرنا:

مراقبہ کے دوران اگر گریہ اور بے قراری کی کیفیت زیادہ ہو تو حتی الوسع ضبط کرنا چاہیئے یہ احسن طریقہ ہے اور اگر ضبط نہ ہو سکے اور برداشت سے باہر ہونے لگے تو اسے بمشکل ضبط کرنے سے جسم میں درد وغیرہ کی تکلیف ہو جاتی ہے اس لئے جب تک وہ قابل برداشت ہو برداشت کرنا چاہیئے۔ مراقبہ کرانے والے کو بھی یہ چاہیئے کہ اگر کسی کی بیقراری حد سے زیادہ بڑھ جائے اور اسے کسی صورت قرار نہ آتا ہو تو فوراً مراقبہ ختم کر دے اور اسے باتوں میں لگا کر یا منہ پر پانی

جھڑک کر یا کچھ کھلا پلا کر سکون میں لانے کی کوشش کرے۔

علمی نکات کا ذہن میں آنا:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آیت یا کوئی عربی عبارت زبان پر از خود جاری ہو جاتی ہے۔
اس طرح کی واردات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ کونیہ (کہ ایسا ہو گا، ایسا نہ ہو گا) اور علمیہ۔ محمود دونوں ہیں، لیکن علمیہ، کونیہ سے اعلیٰ ہیں اور علمیہ ہر شخص کو نہیں ہوتی۔ "دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"۔

مراقبات مشارب میں لطیفہ شیونات ذاتیہ کا لطیفہ ہے اور علمی نکات کا ذہن میں آنا یہ شان العلم کا ظہور ہے۔ ایک تو ہے اللہ تعالیٰ کی ذات، ایک ہیں صفات۔ مثلاً علم، سمع، بصر وغیرہ اور ایک ہیں شیونات یعنی علیم، سمیع، بصیر وغیرہ ہونا۔ یہ شیونات صرف اعتبارات ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت جامع الصفات ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار تمام صفات کا جامع ہے۔ انسان کی طرح نہیں کہ اس کی آنکھ بصیر ہے، کان سامع ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تو پوری کی پوری ذات بصیر بھی ہے، سمیع بھی وغیرہ۔ ہر شخص کا مبدا تعین اللہ تعالیٰ کی کوئی ایک صفت ہوتی ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات کا جو فیض ملتا ہے وہ اس صفت کے واسطے سے ملتا ہے، جو اس کا مبداء تعین ہے۔

اللہ کی نماز:

معراج میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر پہنچے تو آواز آئی کہ قف یا محمد فان ربک یصلی (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہریئے، ابھی آپ کا رب نماز میں ہے) تو اللہ تعالیٰ کی نماز کی کیا صورت ہے؟ اس کی وضاحت حضرت مجدد صاحبؒ نے اور حضرت خواجہ محمد معصومؒ نے اپنے مکتوبات میں کی ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مراتب الٰہی میں ایک تو ذاتِ بحت کا مرتبہ ہے جسے ہویت کہتے ہیں اور قل ھو اللہ احد میں ھو سے جس طرف اشارہ ہے۔ دوسرا مرتبہ صفات کا اور تعینات کا مرتبہ ہے اور تعینات میں سب سے پہلا تعین مقام محمدی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ٹھہرو تمارا رب ابھی نماز میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرتبہ ہویت میں ہے اور اس مرتبہ میں اس سے تمہاری

ملاقات نہیں ہو سکتی ۔ جب وہ تنزل فرمائے گا اس وقت ملاقات ہو گی ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب تنزل فرمایا (اور یہ تنزل حقیقی نہیں صرف اعتباری ہے) تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوا اسی لئے قاب قوسین او ادنی فرمایا گیا کہ اتنا فاصلہ تھا جتنا کہ کمان کا ہوتا ہے یا اس سے بھی کم ، اور اسی لئے یہ بھی درست ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عدم رویت کے بارے میں یہ استدلال منقول ہے کہ لا تدرکہ الابصار (اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں) یعنی مرتبہ ہویت میں اس کو نہیں دیکھا جاسکتا ۔

واقعہ:

حضرات صوفیہ کرام کی اصطلاح میں واقعہ اس امر کو کہتے ہیں جو قلب میں واقع ہو خواہ جاگتے ہوئے ہو یا نیند کی حالت میں ۔ لیکن حواس کا معطل ہونا اس کے لئے ضروری ہے اور سالک بوجہ مراقبہ و مشغولی ذکر ، مسدود الحواس ہو جاتا ہے ۔ پس اس کے لئے واقعات میں نیند کا ہونا ضروری نہیں ہے ۔

مقامِ ولایت:

شہادت و صدیقیت میں سے ہر ایک مقام کے اپنے جدا علوم و معارف ہیں جو اس مقام کے مناسب ہیں ۔ چنانچہ مقام ولایت میں سُکر غالب ہے اور صحو مغلوب اور مقام شہادت میں اس کے برعکس یعنی محو غالب ہے اور سُکر مغلوب اور مقام صدیقیت میں سُکر بالکل نہیں ہے ۔

حقیقت:

اس سے مراد شریعت کی حقیقت ہے ۔ پس حقیقت شریعت سے جدا کوئی امر نہیں ہے اور طریقت سے مراد شریعت کی حقیقت تک پہنچنے کا طریقہ ہے ۔ شریعت کی حقیقت حاصل ہونے سے پہلے شریعت کی صرف صورت حاصل ہوتی ہے اور حقیقت شریعت کا حصول مقام اطمینان حاصل ہونے اور درجہ ولایت تک پہنچنے کے بعد ہے ۔

مقاماتِ عشرہ:

راہِ سلوک کے دس مقام ہیں جن میں سے پہلا مقام توبہ اور آخری مقام رضا ہے اور درمیان کے مقامات زُہد، توکل، صبر، قناعت، شُکر، خوف، رجا اور فقر ہیں۔

یاد کرد:

اس سے مراد لسانی و قلبی ذکر ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کے ذکر سے غفلت کو دور کرنا ہے۔ جب تک سالک طریقت و تصنع میں ہے اور اس کو حقیقت و ملکہء حضور حاصل نہیں ہوا وہ یاد کرد کے مقام میں ہے اور جب حضور و دوام حاصل ہو جائے اور یاد کرد کے تکلف سے چھٹکارا حاصل کرلے اور ایسا ملکہ حاصل ہو جائے کہ نفی کرنے سے بھی اس کی نفی نہ ہو سکے تو مقام یادداشت حاصل ہو جاتا ہے۔

یادداشت:

اس سے مُراد ہر وقت اور ہر حالت میں بطریق فوق حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا ہے۔ بعض نے کہا کہ یادداشت حضور بے غیبت کو کہتے ہیں اور اہل تحقیق بزرگوں کے نزدیک حب ذاتی کے وسیلہ سے شہودِ حق کا دل پر غلبہ ہونا حصول یادداشت کہلاتا ہے اور اس کو مشاہدہ کہتے ہیں اور حق یہ ہے کہ وہ مقام جس میں تمام توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے۔ فنائے تام و بقائے کامل کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

سفر در وطن:

اس سے مراد سیر انفسی ہے۔ اس کو جذبہ بھی کہتے ہیں۔ سلسلہء عالیہ نقشبند کے بزرگوں کی ابتدا اسی سیر سے ہوتی ہے اور سیر آفاقی اسی سیر کے ضمن میں طے ہو جاتی ہے اور دوسرے سلسلوں میں سیر آفاقی سے کام کی ابتدء ہوتی ہے اور ان کی انتہائی سیر انفسی کے ساتھ ہوتی ہے۔ سیر انفسی سے کام کی ابتداء ہونا سلسلہء عالیہ نقشبندیہ کی خصوصیت ہے اور اندراج نہایت در بدایت کے یہی معنی ہیں کہ سیر انفسی جو کہ دوسروں کی نہایت ہے وہ اس سلسلہ کے اکابر کی بدایت ہے

سیر آفاقی مطلوب کو اپنے سے باہر ڈھونڈنا ہے اور سیر انفسی اپنے آپ میں آنا اور اپنے دل کے گرد پھرنا ہے۔

نماز کی حقیقت:

نماز ایک تو انسان اس لئے پڑھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ یہ ابتدائی حالت ہے لیکن نماز کا حقیقی لطف اس وقت آتا ہے جب یہ اس کی روح کی غذا بن جائے کہ کھانے کی طرح اس کی بھی رغبت ہو، اور وقت ہو جانے پر نماز کے لئے دل اسی طرح بیتاب ہو جس طرح معدہ کھانے کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرۃ عینی فی الصلوۃ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) نیز فرمایا کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ مزید فرمایا کہ حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم تو آخرت میں اللہ میاں سے کہیں گے کہ اے اللہ ہمیں نماز پڑھنے کی اجازت تو عطا فرما ہی دے۔

حقیقتِ کعبہ:

دریافت کیا گیا کہ حضرت مجدد صاحبؒ نے مکتوبات میں کہیں لکھا ہے کہ آخرت میں حقیقتِ کعبہ اور حقیقتِ محمدیہ ایک ہو جائیں گے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جی ہاں لکھا ہے اور توجیہ یہ فرمائی کہ کعبہ بھی تجلیاتِ ذاتی کا مرکز ہے۔ اسی لئے مسجود الیہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب بھی آخر میں دائی طور سے تجلیاتِ ذاتی کا مرکز ہو جائے گا۔

جس طرح کعبہ تجلیات ذاتیہ کا مرکز ہے اسی طرح مؤمن کا قلب بھی تجلیاتِ ذاتیہ کا مرکز ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ لا یسعنی ارضی و لا سمائی و یسعنی قلب عبد مومن۔ فرق یہ ہے کہ کعبہ پر یہ تجلیاتِ دائی ہیں اور قلبِ مومن پر کبھی ہوتی ہیں کبھی نہیں ہوتیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا تھا اس کے بارے میں بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ سجدہ تعظیمی تھا جو ان کی شریعت میں تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ حقیقتہً سجدہ نہ تھا صورۃً سجدہ تھا۔ شاید اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے قلب پر تجلیاتِ ذاتیہ وارد ہو رہی ہوں جسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو خود بھی پیغمبر تھے جان لیا اور سجدہ کیا۔ فرشتوں کا

حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا بھی اسی قبیل سے ہو سکتا ہے۔

زمانہ کا طول و عرض:

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ایک رکاب میں پاؤں رکھتے اور قرآن شریف شروع کرتے تھے اور دوسری رکاب میں پاؤں جاتے تک قرآن ختم کر لیا کرتے تھے۔ یا بعض حضرات کے بارے میں منقول ہے کہ وہ کسی جنگل میں زمین کے کسی تہہ خانے میں داخل ہوئے اور کسی دوسرے شہر میں پہنچ گئے۔ وہاں برسوں رہے، شادی کی، بچے ہوئے اور پھر کسی طرح تہہ خانے کے اس دروازے پر پہنچے اور باہر کی دنیا میں واپس آئے تو ابھی چند گھنٹے ہی گذرے تھے۔ اس طرح کے واقعات سے ایسا گمان ہوتا ہے کہ یہ کام زمانہ کے عرض میں ہوتے ہیں اور یہ عرض خاص لوگوں کو اور خاص حالات ہی میں میسر آتا ہے ورنہ عام طور پر کہا یہی جاتا ہے کہ زمانہ میں صرف طول ہے عرض نہیں۔

ارواح کی حاضری:

اول تو یہ بات ہی ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ارواح، علیین یا سجین سے آتی ہوں۔ یہ عامل کی صرف توجہ کا اثر ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علیین کی نیک ارواح کو اللہ تعالیٰ نے انعام کے طور پر کہیں جانے کی آزادی دے رکھی ہو اور سجین کی بد ارواح کو سزا کے طور پر کسی پر مسلط کر دیا جاتا ہو کیونکہ ہوتا یہی ہے کہ عامل لوگ اس شخص کو جس پر بری ارواح کا اثر ہوتا ہے تکلیف دیتے ہیں، جوتے تک مارتے ہیں۔

خناس اور شیطان:

خناس اور شیطان ایک ہی چیزیں ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اللہ پاک اس کے ساتھ ایک فرشتہ اور ایک شیطان لگا دیتے ہیں۔ شیطان انسان کے دائیں اور بائیں طرف سے حملہ آور ہوتا ہے جبکہ فرشتہ اچھائی اور نیک اعمال میں انسان کی مدد کرتا ہے۔ یہ دائیں اور بائیں محض سمجھانے کے لئے ہے۔

حال و مقام:

ان واردات کو کہتے ہیں جو سالک کے دل پر نازل ہوتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ حال کو استقرار نہیں ہے بلکہ بدلتا رہتا ہے اور مقام کو استقرار ہوتا ہے جب تک اس کے آگے کا مقام حاصل نہ ہو۔ اس مقام میں سالک کو قرار رہتا ہے۔

صوفی: یہ ابن الوقت ہوتا ہے یعنی تابع وقت و حال ہوتا ہے جیسا کہ بیٹا باپ کے تابع ہوتا ہے۔ پس اس قسم کا صوفی وقت و حال کا مغلوب ہوتا ہے۔

صافی: وہ ہے جو کہ وقت اور حال سے فارغ بلکہ وہ ابو الوقت ہوتا ہے کیونکہ وہ وقت اور حال پر غالب ہوتا ہے۔

ولایت و وِلایت:

ولایت واؤ کے زبر کے ساتھ حق تعالیٰ کے ساتھ بندہ کے قرب کو کہتے ہیں اور ولایت واؤ کی زیر کے ساتھ اس صفت کو کہتے ہیں جس کے سبب سے بندہ مخلوق میں مقبول ہو جاتا ہے اور دنیا والے اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ خوارق و تصرفات اسی دوسری قسم میں داخل ہیں اور جو برکات مستعد لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں وہ ولایت (زبر کے ساتھ) کا اثر ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو ان دونوں قسموں میں سے صرف ایک قسم حاصل ہوتی ہے اور بعض حضرات کو ان دونوں کا کافی حصہ حاصل ہوتا ہے۔ اور بعض میں ان دونوں قسم کی ولایتوں میں سے کسی ایک کا حصہ دوسری سے زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ مشائخ نقشبند رحمہم اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ ولایت (زبر کے ساتھ) ولایت (زیر کے ساتھ) پر غالب رہتی ہے۔ اور اگر کوئی مقتداء شخص اس دنیا سے انتقال فرماتا ہے تو ولایت (زیر کے ساتھ) کو اپنے کسی مخلص کے لئے چھوڑ جاتا ہے اور ولایت (زبر کے ساتھ) کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور کبھی کسی لغزش کی بنا پر ولایت (زبر کے ساتھ) کو ولی سے واپس لے لیتے ہیں۔

تقویٰ کی حقیقت:

تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا استعمال شریعت میں دو معنی میں ہوتا ہے۔ ایک ڈرنا دوسرے بچنا۔ اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصد تو گناہوں سے بچنا ہی ہے مگر اس کا ذریعہ ڈرنا ہے، کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل میں ہوتا ہے تب ہی تو اس سے بچا جاتا ہے۔ تقویٰ کے مختلف مدارج ہیں، ایک یہ کہ کفر و شرک سے بچے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ کو ترک نہ کرے اور محرمات کا ارتکاب نہ کرے۔ پھر جیسے جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی تقویٰ پیدا ہوتا رہے گا۔ اور تقویٰ کے کمال سے ایمان بھی کامل ہوتا رہے گا یہاں تک کہ درجہ احسان حاصل ہو جائے گا جو کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے اور یہی تقویٰ کا بھی اعلیٰ درجہ ہے اور یہی درجہ مطلوب ہے۔

واضح رہے کہ ہر شئے اور اعضاء کا تقویٰ ہے۔ مثلاً آنکھ کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کو بری نگاہ سے نہ دیکھے، زبان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ کرے، جھوٹ نہ بولے، بدکاری نہ کرے، ہاتھ کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے، کسی کو نہ ستائے، پاؤں کا تقویٰ یہ ہے کہ بری جگہ نہ جائے، کان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ سنے، راگ و ساز نہ سنے، پیٹ کا تقویٰ یہ ہے کہ حرام مال نہ کھائے وضع و قطع کا تقویٰ یہ کہ خلافِ شریعت نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ پس جس شخص میں یہ اوصاف پائے جائیں وہ متقی ہے اور ان اوصاف کا حاصل ہونا اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کی ناراضگی اور عتاب کو یاد کرنے پر موقوف ہے۔

تقویٰ:

تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو اس کام کے کرنے سے بچائے جس کے سبب سے وہ عذاب کا مستحق ہوتا ہے خواہ وہ چیز کرنے کی ہو یا چھوڑ دینے کی۔ پس اوامر پر عمل کرنا اور نواہی سے بچنا تقویٰ ہے، بلکہ ممنوعات سے بچنے کا اہتمام زیادہ ضروری ہے۔

اگر کوئی معاملہ دلائل و قرائن کی بنا پر مشتبہ ہو اور ذلت و حرمت کا کوئی پہلو واضح نہ ہو تو پھر شک و تذبذب کی حالت میں مبتلا ہونے کی بجائے ایسا قدم اٹھایا جائے جس کی بنیاد یقین یا کم از کم گمان غالب ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ خوامخواہ وہم و شک میں مبتلا ہو کر ہر معاملہ میں شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں کیونکہ یہ بات تقویٰ کے منافی ہے۔

تقویٰ یا خوفِ خدا فی الحقیقت اللہ تعالیٰ پر کامل ایمام کی دلیل ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور کبریائی کے اعتراف کا اظہار ہے، ہدایت و رہنمائی قبول کرنے کی شرط اول ہے، تزکیہء نفس و روح کی بنیاد ہے، نیکی اور خیر کی تحریک اور برائی اور شر سے بچنے کی ترغیب ہے، اسلام کی اساس ہے اور پرہیزگاری اور پارسائی کی ضمانت ہے ۔

تقویٰ کے درجات:

تقویٰ کے کئی درجے ہیں ۔ اس کا ادنیٰ درجہ ہر مومن مسلمان کو حاصل ہے اور وہ کفر و شرک سے بچنا ہے ۔ اس معنی کے لحاظ سے ہر مومن مسلمان متقی ہے ۔ دوسرا درجہ جو دراصل مطلوب ہے یہ ہے کہ ہر اس چیز سے بچا جائے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے ۔ تیسرا درجہ جو تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاص متبعین اولیاء اللہ کو حاصل ہوتا ہے، یہ ہے کہ اپنے دل کو غیر اللہ سے بچایا جائے اور اس کی رضاجوئی سے آباد رکھا جائے ۔ یہی تقویٰ کا حق ہے ۔

تقویٰ کے فوائد و نتائج:

تقویٰ کے نتائج بڑے دور رس اور انسان کی انفرادی، معاشرتی اور تمدنی زندگی کے لئے انتہائی بابرکت ہیں ۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا پرہیزگاری کو تحریک دیتا ہے ۔ برائیوں سے بچنے اور بھلائیوں کے اختیار کرنے کا درس دیتا ہے ۔ زندگی کو فعال اور سود مند بناتا ہے ۔ ایک ایک لمحہ کی نگہداشت پر توجہ دلاتا ہے ۔ نفس کی شیطنت سے روکتا ہے اور بھلائیوں پر اکساتا ہے ۔ اخلاق کو سنوارتا اور کردار کو نکھارتا ہے ۔ یہ آدمی کی عزت و وقار کو بڑھاتا ہے ۔ خدا ترسی، رحم دلی عدل و انصاف، سخاوت، ایثار، جود و کرم، عفور و درگزر، بردباری و خودداری اور صبر و تحمل جیسی ساری اقدارِ خیر تقویٰ ہی کا ماحصل ہیں ۔ اسی طرح جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، غرور، خودستائی، حسد، بخل، بدعہدی اور خودغرضی جیسی تمام معاشرتی برائیوں سے نفرت اور اجتناب کی تحریک تقویٰ ہی کے طفیل پیدا ہوتی ہے ۔

تقویٰ و پرہیزگاری لازم و ملزوم ہیں اور اس حد تک کہ جتنی نیکی بڑھتی ہے اللہ تعالیٰ کا خوف بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا جاتا ہے ۔ اس طرح تقویٰ بندگی کے مدراج کو ارفع سے ارفع تر بناتا جاتا

ہے ۔ پس تقویٰ ہی باعثِ فلاح و نجات ہے ، اس لئے ہمیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے اور اس فطری اور اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ استعداد کو روز افزوں ترقی دینی چاہئے ۔ یہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار المکافات ہے ۔ یہاں ہم جیسا بوئیں گے وہاں ویسا ہی کاٹیں گے ۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم تقویٰ کو اپنی زندگی کا وطیرہ بنائیں ۔ دنیا میں ہر عمل پر آخرت کی بھلائی کو نگاہ میں رکھیں اور یہ کبھی نہ بھولیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے ۔ جو ظاہر و باطن سب کا جاننے والا ہے ، وہ رحیم و کریم بھی ہے اور منتقم و جبار بھی ، وہ ہمارے کاموں کی پوری پوری جزا و سزا دے گا ۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ ہم کسی کے ساتھ کوئی برائی کریں گے تو دراصل خود اپنے ساتھ برائی کریں گے اور اچھائی کریں گے تو اپنے اعمال حسنہ میں اضافہ کریں گے جس کا بدلہ ہمیں ضرور ملے گا یہی تقویٰ کی تلقین ہے ۔

شکر کا طریقہ:

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر تین طریقے سے ادا کیا جاتا ہے ۔ یعنی دل ، زبان اور جسم کے اعضاء سے ۔ دل کا شکر یہ ہے کہ دل سے اس بات کو تسلیم کرلے کہ یہ سب نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں عنایت فرمائی ہیں اور مخلوق خدا کے ساتھ بھلائی کا خیال ہر وقت دل میں رکھے ، زبان سے شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی نعمت کا شکر ادا کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرے اور وہ دعائیں پڑھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مختلف موقعوں پر پڑھی ہیں ۔ اعضائے بدن کا شکر یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ طاعت و عبادت میں استعمال کرے اور ان کو گناہ کے کاموں میں استعمال کرنے سے اچھی طرح پرہیز کرے ۔ مثلاً آنکھوں کا شکر یہ ہے کہ کسی مسلمان کا عیب دیکھے تو اس کو ظاہر نہ کرے اور غلط جگہ نظر ڈالنے سے نگاہ کو محفوظ رکھے ۔ کانوں کا شکر یہ ہے کہ خلافِ شریعت امور ، غیبت و راگ وغیرہ سننے سے کانوں کو بچائے ۔ جس کا کوئی عیب سنے تو اس کی پردہ پوشی کرے ۔ اسی طرح دوسرے اعضاء کا شکر ہے ۔ مال و متاع کا شکر یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے میں خرچ کرے ۔ زکوۃ وغیرہ ادا کرے اور نیت خالص اللہ تعالیٰ کے لئے رکھے ۔

شکرِ نعمت:

شیخ سعدی علیہ الرحمہ گلستان کے شروع میں لکھتے ہیں کہ انسان جو سانس اندر کی طرف لے جاتا ہے وہ زندگی کو بڑھانے والا ہے اور جو سانس وہ باہر نکالتا ہے وہ فرحت بخشنے والا ہے۔ پس ہر سانس پر دو شکر واجب ہوئے۔ اندازہ کیجئے کہ انسان دن رات میں کس قدر سانس لیتا ہے اور روزانہ کتنے شکر سانس لینے پر واجب ہوتے ہیں۔ بزرگوں نے اندازہ لگایا ہے کہ انسان دن رات میں جو بیس ہزار مرتبہ سانس لیتا ہے۔ پس روزانہ چوبیس ہزار مرتبہ تو سانسوں ہی کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگانِ دین روزانہ کم از کم چوبیس ہزار مرتبہ ذکرِ الہٰی کرنا اپنے اوپر لازم کرتے ہیں۔ اب اندازہ لگائے کہ اللہ تعالیٰ کی دوسری بے شمار نعمتیں جو ہر انسان پر وارد ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا شکر کس قدر واجب ہوگا۔

بلا و مصیبت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اس پر صبر کرنا بھی شکر ہی کی ایک فرع ہے۔ مصیبت میں بندہ کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس پر صبر کرنے سے ثواب ملتا ہے اور نفس کی اصلاح ہوتی ہے اور کبھی اس کا عمدہ بدلہ دنیا میں بھی مل جاتا ہے اور مصیبت مومن بندہ کے لئے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ بلا و مصیبت سے مراد فقر و فاقہ و بیماری و خوف وغیرہ ہے نہ کہ مطلق مصیبت کہ اس میں کفر و معصیت بھی شامل ہے۔ حالانکہ کفر و معصیت پر صبر کرنے کے کوئی معنی نہیں بلکہ ان کا ترک کرنا اور اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا ضروری ہے۔

جب بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں اللہ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور جس قدر احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر محبت الہٰی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں بندہ کے دل میں شوق پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ پاک ہمیں ایسی ایسی نعمتیں دے رہا ہے تو ہمیں اس کی عبادت اور فرمانبرداری خوب کرنی چاہئے، ایسی نعمتیں دینے والے کی نافرمانی کرنا نہایت شرم کی بات ہے۔ چونکہ بندے پر اللہ تعالیٰ کی بیشمار نعمتیں ہر وقت نازل ہوتی رہتی ہیں، اس لئے اس کے دل میں ہر وقت یہ خوشی اور محبت رہنی چاہئے کہ اس کے احکام بجالانے میں کبھی کوتاہی نہ کرے اور اس کی نعمتوں کا ہر وقت شکر ادا کرتا رہے۔

تصوف کی حقیقت:

تصوف کے ذریعہ دین اسلام میں دو طرح سے گمراہیاں داخل ہوئیں اور افراط و تفریط کا جال پھیل گیا۔ ایک طرف تو بدعات اور کفر و شرک کی کوئی شکل باقی نہیں بچی ہوگی جس کو کسی نہ کسی طرح داخل تصوف بلکہ عین تصوف نہ سمجھا گیا ہو۔ عوام بلکہ خواص تک کو کیسے کیسے مغالطے ہیں کہ کوئی کشف و کرامات و تصرفات کو تصوف جانتا ہے تو کوئی اشغال و مراقبات، احوال و کیفیات اور رقص و سرود وغیرہ کو تصوف یقین کرتا ہے۔ کسی نے ریاضات و مجاہداتِ غیر شرعیہ اور ترکِ تعلقات کا نام تصوف رکھا ہے تو کسی فلسفی مزاج نے تصوف سے مراد وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود کے نظریات کو لیا ہے۔ کوئی اسرار و مغیبات کا مجموعہ قرار دیتا ہے تو کوئی طریقت و حقیقت و معرفت کو شریعت کی ضد خیال کرتا اور تصوف کے بلند ترین مقام پر فائز ہونے سے تمام احکام شرعیہ کا اس سے مرتفع ہونا گمان کرتا ہے، حالانکہ تصوف کی حقیقت پابندیٔ شریعت کے ساتھ باطن صفائی کا حاصل ہونا ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو تصوف کے سرے سے ہی منکر ہیں۔ وہ لوگ تصوف کو غیر دین اور طریقت کو خلافِ شریعت قرار دیتے ہیں اور حضراتِ صوفیائے کرام کے حقائق و معارف، اذکار و اشغال، مجاہدات و مراقبات، احوال و کیفیات، توجہ و تصرفات، کشف و کرامات، تعلقاتِ بیعت و نسبت اور رسوم و عادات وغیرہ کی خاص خاص صورتوں کو کتاب و سنت کی عام منصوص تعلیمات میں سے نہیں سمجھتے، جس کی وجہ سے ان کے جواز و ضرورت کے منکر ہو جاتے ہیں اور تصوف کو اسلام میں بہت بعد کی اور بیرونی اثرات کی پیداوار کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی تصوف آیہ مبارکہ کے لفظ یزکیہم کی تعبیر ہے اور حدیث شریف کے لفظ احسان کی تفصیل ہے۔ البتہ افہام و تفہیم کے لئے بعض رائج الوقت بیرونی تعبیرات و اصطلاحات سے کام لیا گیا ہے اور غیروں کی بعض تدبیری چیزیں تدبیری کے درجہ میں اختیار کرلی گئی ہیں اس کی اجازت شریعتِ مقدسہ میں پائی جاتی ہے اور اس کے نظائر شرع میں موجود ہیں کمالایخفی علی اربابہ اور محبت الہیٰ جو تصوف کی اصل و اساس ہے، قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ صوفیا کا لطیفہ ہے کہ اپنے اسرار کو عوام سے بچانے کے لئے اصطلاحیں مقرر کرلی ہیں۔ علماء ظاہر جو ان کی اصطلاحیں نہیں سمجھتے اعتراض کر دیتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے اس افراط و تفریط کی بدرجہ اتم اصلاح فرمائی ہے۔

حسد کی مذمت:

کسی کی نعمت و راحت کو دیکھ کر جلنا اور یہ چاہنا کہ اس شخص سے یہ نعمت زائل ہو جائے اگرچہ اس کو بھی حاصل نہ ہو حسد کہلاتا ہے۔ حسد حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ یہ سب سے پہلا گناہ ہے جو آسمان میں کیا گیا اور یہ سب سے پہلا گناہ ہے جو زمین میں کیا گیا۔ آسمان میں سب سے پہلے ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا اور زمین میں حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل سے حد کیا۔ حسد سے ملتی جلتی چیز غبطہ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کی نعمت و راحت اور عزت و آبرو کو دیکھ کر یہ تمنا کرنا کہ ایسی نعمت و راحت اور عزت و آبرو مجھے بھی حاصل ہو جائے اس کو رشک بھی کہتے ہیں۔ یہ جائز بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن ہے۔

حسد بہت بری چیز ہے۔ ایسے شخص کی ساری زندگی تلخی میں گزرتی ہے۔ جب تک حسد کرنے والا اپنے حسد کی وجہ سے کسی کو ایذا پہنچانے کا اقدام نہ کرے اس وقت تک اس کا نقصان خود اس کی ذات تک پہنچتا ہے، کہ وہ کسی دوسرے کو کھاتا پیتا اور پھلتا پھولتا اور عزت و آبرو کے ساتھ دیکھ کر اپنے دل میں جلتا اور کڑھتا ہے۔ البتہ جس سے حسد کرتا ہے اس کو نقصان اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے حسد کے مقتضا پر عمل کر کے اس شخص کو ایذا پہنچائے اور اس کی نعمت کے زوال کے لئے کوشش کرے۔ پس حاسد اپنی جان کو ہر وقت تکلیف پہنچاتا رہتا ہے اور گناہ و آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے۔

حسد خواہ دنیاوی کمال پر ہو یا دینی کمال پر، دونوں قسم کا حسد حرام ہے۔ حسد کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب عداوت ہے، یعنی دشمن کی وجہ سے کسی کی نعمت کا زوال چاہنا اور اس کی نعمت سے اپنے دل میں جلنا۔ اس کا ایک سبب تکبر ہے، یعنی جب اپنے اندر تکبر اور بڑائی کا مادہ ہوتا ہے تو اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ دوسرا شخص اس نعمت کے باعث اس سے بڑا نہ بن جائے۔ اس لئے وہ اس کی نعمت کا زوال چاہتا ہے یا وہ اس لئے حسد کرتا ہے کہ اس محسود کی نعمت و عزت کے باعث حاسد کو اپنے مطلوبہ مقاصد فوت ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے یا حبِ جاہ وغیرہ کوئی اور سبب ہوتا ہے یا کوئی بھی سبب نہیں ہوتا بلکہ صرف حاسد کی طبیعت کی خباثت ہی حسد کا سبب ہوتی ہے۔ چونکہ حاسد کی دنیا اور دین دونوں مصیبت اور تکلیف میں گزرتے ہیں اس لئے اس بیماری سے بچنے اور اس آفت سے نکلنے کے لئے بہت کوشش کرنی چاہیے

اور اس بیماری کا جو سبب ہے اس کے تدارک کے ذریعہ اس کا علاج کرنا چاہئے۔

بخل کی مذمت:

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن بری عادتوں کی نشاندہی کی اور ان سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے ان میں سے ایک بخل بھی ہے، جس کو اردو زبان میں کنجوسی کہتے ہیں۔ یہ سخاوت کی ضد ہے۔ شرع میں بخل کی تعریف یہ ہے کہ جن مواقع میں شرع نے خرچ کرنا فرض و واجب قرار دیا ہے ان میں خرچ نہ کرنا یعنی زکوۃ و صدقات واجب ان کے مستحقین کو نہ دینا بخل ہے اور اس کے بالمقابل اسراف یعنی فضول خرچی ہے۔ ان دونوں عادتوں کی قرآن حکیم اور احادیث میں بہت مذمت آئی ہے۔ ان دونوں کے درمیان کا درجہ اعتدال کا درجہ ہے۔ انسان پر واجب ہے کہ اوسط درجہ کو اختیار کرے اور بخل و اسراف دونوں سے بچے۔

بخل کے بہت سے نقصانات ہیں۔ اس سے دین کا نقصان یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سے حق جن کا ادا کرنا فرض و واجب ہے جیسے زکوۃ، قربانی، فطرہ، کسی محتاج کی مدد کرنا، اپنے غریب رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرنا وغیرہ ادا نہیں ہوتے۔ اور اس کا گناہ اس کے ذمہ رہتا ہے جس کی سزا آخرت میں دوزخ ہے۔ بخل سے دنیاوی نقصان یہ ہے کہ بخیل آدمی سب کی نگاہوں میں ذلیل و خوار اور بے قدر و بے وقار ہوتا ہے۔

مال کو مستحق لوگوں پر تقسیم کرنے اور اپنے عزیزوں اور بھائیوں کی خبر گیری کرنے سے آپس میں محبت اور میل ملاپ بڑھتا ہے اور بخل کرنے سے آپس میں میل ملاپ ختم ہو جاتا ہے اور قطع تعلق لازم آتا ہے جو لڑائی اور دشمنی کا باعث ہوتا ہے اور یہ دشمنی خونریزی تک پہنچا دیتی ہے اور جب آپس میں دشمنی ہو جاتی ہے تو حرام کو حلال جاننے لگتا ہے یعنی دشمن کی عورتوں اور مال اور ان کی آبرو ریزی کو جو کہ اس کے لئے حرام میں حلال جاننے لگتا ہے۔ جس طرح مال میں بخل ہوتا ہے اسی طرح علم سکھانے اور تبلیغ دین وغیرہ نیک امور میں بھی بخل ہو سکتا ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

نفس مطمئنہ:

انسان کا نفس اس کا دوست نما دشمن ہے۔ جب تک اس کی خود رائی و انانیت قائم ہے،

اس کا حکم قائم ہے اور انسان حرص و ہوس، تکبر و عجب، بخل و حسد، غصہ و غیبت وغیرہ برائیوں میں ملوث رہتا ہے۔ یہ انسان کو دنیا میں مصیبتوں میں گرفتار کرتا اور ذلیل و خوار بناتا ہے اور آخرت میں بھی عذابِ الہیٰ میں گرفتار کرتا ہے۔ لیکن جب شرعی طریقے پر بتائی ہوئی ریاضتوں اور مجاہدوں اور ذکر الہیٰ کی برکت سے اس کا تزکیہ ہونے لگتا ہے اور انسان آخرت کے خوف سے نفس کے تقاضے پورے کرنے سے رک جاتا ہے تو اس کا نفس لوامہ یعنی برے کاموں پر بکثرت ملامت کرنے والا بن جاتا ہے اور جب اصلاح نفس میں کوشش کرتے کرتے اس کے نفس کی یہ حالت ہو جائے کہ برے کاموں کا تقاضا ہی اس میں نہ رہے تو وہ نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں داخل ہونے کی بشارت سے سرفراز فرمایا ہے۔

اطمینان قلب:

آج کل دنیا کی ہر قوم اور قوم کا ہر فرد بے اطمینانی کا شکار اور افراتفری سے دوچار ہے۔ امریکہ ہو یا یورپ، چین ہو یا جاپان، آسٹریلیا ہو یا افریقہ، مشرق وسطیٰ ہو یا برصغیر ہند و پاک، ہر جگہ لوگ دولت کی فراوانی، صنعت و حرفت کی بلندی، تخت و تاج کی عظمت، عیش و عشرت کی سہولتوں اور سیر و سیاحت کی کامرانیوں کے باوجود اطمینان قلب کی دولت سے عام طور پر محروم ہیں۔ اس کی ضرورت کو نہایت شدت سے محسوس کرتے اور اس کی طلب میں اندھوں کی طرح اندھیرے میں ٹٹولتے پھر رہے ہیں۔ کچھ لوگ مختلف مذاہب میں اس گوہر مقصود کی جستجو کرتے ہیں تو کچھ لوگ متفرق نظریاتِ حکمت و فلسفہ میں اس دولتِ نایاب کو تلاش کرتے ہیں۔ لیکن محرومی و ناکامی کے سوا ان کو کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ فلسفہ و حکمت نے اطمینان قلب کے حصول کے لئے جو نظریات مہیا کئے ہیں ان میں بے اطمینانی کے مرض کا کوئی مداوا نہیں ہے بلکہ وہ اس میں مزید اضافہ کا باعث ہوتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ دیگر مروجہ مذاہبِ عالم نے بھی عدم سکون اور بے اطمینانی کی بیماری کے لئے جو نسخے تجویز کئے ہیں وہ سب عملی طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس مرض کا تیر بہدف اور کامیاب نسخہ مرحمت فرمایا ہے۔

قرآن کریم نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ اطمینان قلب نہ مال و دولت کی کثرت سے حاصل ہوتا ہے نہ ملوں، کارخانوں اور زمینوں سے اور نہ عہدوں اور جاہ و مراتب سے حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ صرف مومنوں کو حاصل ہوتا ہے جو ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ مومنوں

کے دل کی غذا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ انس بڑھتا ہے جس کی برکت سے ان کو اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے اور جو دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے محروم ہوتا ہے اس پر غفلت طاری رہتی ہے۔ وہ اہل غفلت کی محبت اختیار کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کے دل کو قلق و اضطراب لاحق رہتا ہے۔ جس طرح مچھلی جب پانی سے جدا ہو جاتی ہے، خشکی کا جانور جب پانی میں جا گرتا ہے اور جنگلی جانور جب پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے تو اس کو اضطراب لاحق ہو جاتا ہے، اسی طرح اللہ کی یاد سے غافل دل بھی مضطرب و بیقرار رہتا ہے۔ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور جو شخص کسی سے محبت کرتا ہے وہ اس کو بہت زیادہ یاد کرتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اس مومن سے محبت کرتا ہے اور اس کو دوست رکھتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو اس کو دنیا و آخرت میں اطمینان نصیب فرماتا ہے اور خوف و حزن کو اس سے دور فرما دیتا ہے۔

طہارتِ قلبی:

جس طرح انسان فطری طور پر ظاہری پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے اور اگر اس کے جسم یا لباس پر کسی قسم کی نجاست لگ جائے تو جب تک وہ اس کو پاک و صاف نہ کر لے بیتاب رہتا ہے اسی طرح اس کی فطرت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ اس کا باطن بھی پاک و صاف رہے۔ اور جس طرح ظاہری جسم و لباس کی پاکیزگی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے شرط ہے اسی طرح ہر انسان باطنی پاکیزگی اور قلبی طہارت حاصل کرنے کے لئے بھی فطرت کی طرف سے مامور اور قدرت کی طرف سے مکلف ہے۔ چونکہ انسان سہو و نسیان کا پتلہ اور خطاء و اغلاط سے مرکب ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح و تربیت کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ قرآن کریم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو مقاصدِ رسالت اور فرائضِ منصبی بیان کئے ہیں ان میں سے ایک تزکیہ ہے، جس کے معنی ظاہری و باطنی نجاست سے پاک کرنا ہے۔ ظاہری نجاست سے تو عام مسلمان واقف ہیں لیکن باطنی نجاستوں سے پوری طرح بہت ہی کم لوگ واقف ہیں اور وہ کفر و شرک و عقائد فاسدہ اور برے اخلاق مثلاً تکبر و حرص و طمع و بغض و حسد و حبِ مال و حبِ جاہ و کذب و افتراء وغیرہ ہیں، کہ ان سب سے پاک ہونا تزکیہ اور طہارتِ قلبی ہے۔

اعضاء کا سردار:

انسان کا دل اس کے جسم کا بادشاہ اور تمام اعضاء کا سرادر ہے ۔ دل کی اصلاح اور پاکیزگی پر تمام جسم انسانی کی اصلاح کا مدار ہے ، کیونکہ جب بادشاہ درست ہوتا ہے تو رعایا بھی درست اور نیک ہوتی ہے ۔ جسم کے اعضاء کی درستی اور اعضاء کا اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنا ، قلب کی درستی و پاکیزگی پر موقوف ہے ۔ بدن کے دوسرے اعضاء نیک کام اس وقت کریں گے جب قلب نیک و صالح ہو گا ، اس لئے قلب کی اصلاح میں کوشش کرنا واجب ہوا ۔

اصلاح قلب کا نسخہ:

جس طرح انسان کے ظاہری جسم پر پسینہ و گرد و غبار کی وجہ سے میل آجاتا ہے اور ظاہری نجاست لگ جانے کی وجہ سے وہ ناپاک ہو جاتا ہے ، اسی طرح باطنی خرابیوں اور برائیوں کی وجہ سے انسان کا دل زنگ آلود ہو جاتا ہے اور جس طرح ظاہری جسم کو صابن وغیرہ اور پانی سے پاک و صاف کرتے ہیں ، اسی طرح باطنی زنگ و ظلمات کو دور کرنے کے لئے بھی کچھ اعمال ہیں جو شریعتِ مقدسہ نے ہمیں تعلیم دیئے ہیں ۔ دل کا میل اور زنگ و ظلمات دور کرنے اور اس کی اصلاح و صفائی کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نسخہ تجویز فرمایا وہ موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن مجید کی تلاوت ہے ۔

عبادت میں دل نہ لگنا:

عام طور پر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ عبادت میں دل نہیں لگتا ، سستی ہو جاتی ہے ، پابندی نہیں ہو پاتی ۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا دل بیمار ہے ، گناہوں اور غفلت کی سیاہی اس پر اس قدر جم گئی ہے کہ وہ کسی اچھی بات کو قبول نہیں کرتا ۔ اگر نہایت کوشش اور کسی کی ترغیب سے ہم کسی عبادت یا نیک کام کو شروع بھی کرتے ہیں تو اس کو دوام حاصل نہیں ہوتا ۔ جس طرح ظاہری جسم جب بیمار ہو جاتا ہے تو اس کو کھانے پینے اور دیگر آرام و آسائش کی طرف رغبت نہیں ہوتی ۔ بعض امراض میں میٹھی چیزیں کڑوی اور بعض امراض میں پھیکی اور بدمزہ معلوم ہوتی ہیں ۔ اسی طرح جب ہمارا دل بیمار اور باطن زنگ آلود ہو جاتا ہے تو عبادت و نیک اعمال میں لذت

حاصل ہونے کے بجائے ان سے نفرت و بے رغبتی پیدا ہو جاتی ہے۔

فلاح دارین کا انحصار:

دونوں جہان کی کامیابی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہونے کا مدار قلب کی طہارت و اصلاح پر ہے۔ آج کل ہم لوگوں میں یہ بہت بڑی کمزوری ہے کہ ہم لوگ ظاہر اعمال تو تھوڑے بہت کرتے بھی ہیں اور ان کا علم بھی حاصل کرتے ہیں لیکن باطن کی اصلاح اور قلب کی درستگی و پاکیزگی کی طرف کچھ بھی دھیان نہیں دیتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک باطن و قلب کو اس کی برائیوں یعنی ریا، کینہ، حسد، بغض، تکبر، خود پسندی، کذب و افتراد وغیرہ سے محفوظ رکھنے اور ان برائیوں کا علاج کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے، صرف ظاہری اعمال کو فرض و واجب سمجھتے اور ان کو نجات کے لئے کافی جانتے ہیں، حالانکہ طہارت قلبی اور ظاہری اعمال لازم وملزوم ہیں۔ ظاہری اعمال قلب کی اصلاح و طہارت کا ذریعہ ہیں اور طارتِ قلبی سے اعمال میں حسن و خوبی اور دوام کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر و باطن میں ایک ایسا قدرتی تعلق ہے کہ ظاہر کی درستگی کے بغیر باطن درست نہیں ہوتا اور جب تک ظاہری اعمال پر ہمیشگی حاصل نہ ہو باطنی اصلاح بھی دائمی نہیں رہتی۔ جب باطن درست ہو جاتا ہے تو ظاہری اعمال خوب اچھی طرح ادا ہوتے ہیں اور ان کو ادا کئے بغیر چین نہیں آتا۔

باطنی عروج کے مدعی:

بعض لوگ ظاہری اعمال سے صرفِ نظر کرکے باطنی طور پر اعمال ادا کرنے اور باطنی عروج و وصول کا دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب قلب درست ہو گیا تو اب ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں رہی۔ ان کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے، کیونکہ جب قلب درست ہو جائے گا تو وہ شخص ہر وقت حتی المقدور اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری میں لگا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر بلند مرتبہ اور انتہائی عروج پر ہونے کے باوجود ظاہری اعمال میں نہایت مصروف رہتے تھے اور آخر دم تک آپ کا یہی معمول رہا۔

ذکر اللہ کی برکتیں:

اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بیشمار برکتیں اور سعادتیں حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً جب بندہ اللہ تعالیٰ کا ذکر شروع کرتا ہے تو اس کا دل اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہوتا ہے اور اس کی برکت سے وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ ذکرِ الہیٰ کی برکت سے گناہوں سے دور و محفوظ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اس کو یاد کرتا ہے۔ اس کو اس دنیا میں بھی اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے، مرنے کے بعد قبر میں بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کو تسلی دیتا اور اس کا غم دور کرتا ہے اور حشر کے روز بھی وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سائے میں رہتا اور ہر قسم کے خوف و حزن سے محفوظ ہوتا ہے۔ اس کا نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے اور نفس اس وقت تک مطمئنہ نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی صفاتِ رزیلہ حسد و بغض، کبر و کینہ اور بخل وغیرہ زائل ہو کر صفاتِ حمیدہ و حسنہ، ایثار و سخاوت، تواضع و خدمتِ خلق وغیرہ حاصل نہ ہو جائیں اور ان صفاتِ حسنہ کا دار و مدار اللہ تعالیٰ کے ذکر پر موقوف ہے۔

ہر بنی نوع انسان کے لئے جو اطمینان قلب کا طالب ہے، اسلام کی یہ دعوت عام ہے کہ ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد کثرت سے کرے اور ذاکرین کی مجلس میں شامل ہو کر جنت کے باغوں سے میوے کھائے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایسے لوگ تھوڑے ہی عرصہ میں اطمینان قلب کی دولت سے سرفراز ہوں گے اور ذکر کی دائمی طور پر پابندی سے اطمینان قلب میں بھی دوام حاصل ہوگا۔

اچھی صحبتوں کا بدل:

اگر کسی شخص کو اہل اللہ کی صحبت میسر نہ ہو تو اس کو چاہیئے کہ کم از کم ان کے ملفوظات و تحریر کا بہ نظر اصلاح و استفادہ مسلسل مطالعہ کرتا رہے کہ اس سے بھی اہل اللہ کا ایمان و عمل ہمارے اندر منتقل ہو جاتا ہے اور قالب سے تجاوز کر کے قلب و روح میں اتر جاتا ہے۔ چونکہ اس زمانے میں صلحاء و علماء ربانی کمیاب ہیں اور ہر جگہ اچھی صحبتیں میسر نہیں ہیں، اس لئے مذہبی کتابوں کا مطالعہ اچھی صحبتوں کا بدل ہے اور وہ کتابیں جو بزرگوں کے حالات، نصائح اور دینداری کا جذبہ پیدا کرنے والے مضامین پر مشتمل ہوں یقیناً نیک صحبتوں کے قائم مقام ہیں۔

خواہشات کی اصلاح:

انسان کے اندر جو خواہشات وعادات موجود ہیں وہ اپنی ذات میں سب اچھی ہیں لیکن صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے انسان ان خواہشات وعادات کا استعمال غلط طریقے پر کرنے لگا ہے۔ اس غلط طریقہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے وہ خواہشات نفس کی طرف منسوب ہوتی ہیں اور بری کہلاتی ہیں۔ لیکن جب مجاہدہ اور ریاضت سے اس کے دل کی صفائی اور ان خواہشات کی اصلاح ہو جاتی ہے تو ان کا استعمال غلط طریقے کی بجائے صحیح طریقے پر اور بری جگہ کے بجائے اچھی جگہ پر ہونے لگتا ہے۔ یعنی ان خواہشات وعادات کی جڑ تو نہیں جاتی البتہ وہ اچھے اور صحیح طریقے کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کسی شخص میں کنجوسی اور غصہ کی عادت ہے تو کوشش اور مشق کرنے سے یہ تو نہیں ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر کنجوسی اور غصہ بالکل نہ رہے البتہ اس کی اصلاح اس طرح ہو جائے گی کہ پہلے وہ نیکی کے موقعوں پر کنجوسی کرتا تھا، نیک کاموں اور نیک بندوں پر غصہ کرتا تھا، اصلاح ہو جانے کے بعد وہ شرع کی منع کی ہوئی جگہ پر خرچ کرنے سے کنجوسی کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے نافرمان بندوں پر اور اپنے سرکش نفس پر غصہ کرے گا۔

نفس کی خواہشات بے شمار ہیں۔ مثلاً زیادہ کھانے کی حرص جس سے بہت سے گناہ سرزد ہوتے ہیں اور دوسری خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے تکبر، حسد، کینہ اور طلب جاہ وغیرہ۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پیٹ حد سے زیادہ نہ بھرے بلکہ دو چار لقموں کی بھوک رکھ کر کھائے۔ اس سے طبیعت میں اعتدال پیدا ہو جائے گا، اسی طرح نفس کی ایک خواہش زیادہ بولنا ہے، اس سے بہت سے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں، مثلاً جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، طعنہ دینا، اپنی بڑائی جتانا وغیرہ۔ اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ فضول اور بیہودہ کلام نہ کرے۔ صرف ضروری بات کہے وہ بھی خوب سوچ سمجھ کر۔ غیبت کی طرف بھی نفس کی خواہش ہوتی ہے، حدیث میں اس سے بچنے کی تاکید اور اس کو بہت بڑا گناہ کہا گیا ہے۔ اگر خوانخواستہ کسی کی غیبت ہو جائے تو توبہ کرے اور اس شخص سے معافی مانگے اور اس کے ساتھ رعایت کرے اور اس کے لئے دعا بھی کرے۔ غصہ بھی نفس کی ایک بیماری ہے، اس سے عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ اس کی وجہ سے مار پیٹ، گالی گلوچ، زبان درازی وغیرہ کئی طرح کے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس پر غصہ آئے اس کو اپنے سامنے سے ہٹا دے، اگر وہ نہ ہٹے تو خود وہاں سے ہٹ جائے۔ اس کے بعد سوچے کہ اس سے

زیادہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہوں ۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر غصہ کرے تو میرا کیا حال ہو گا اور جب میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے تو مجھے بھی چاہیئے کہ میں اس کو معاف کر دوں ۔ غصہ کے وقت پانی پی لے یا وضو کر لے اور اگر کھڑا ہوا ہے تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہوا ہو تو لیٹ جائے ۔ حسد بھی ایک بہت بڑی بیماری ہے ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کو کھاتا، پیتا پھلتا، پھولتا اور عزت و آبرو سے رہتا ہوا دیکھ کر جلے اور اس کی خوشحالی جاتے رہنے سے خوش ہو ۔ ایسے شخص کی تمام عمر رنج و غم میں گزرتی ہے ۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے دل پر جبر کر کے دوسروں کے سامنے اس کی تعریف کرے ، اس کے ساتھ بھلائی کرے ، اللہ تعالیٰ سے اس کی نعمت زیادہ ہونے کی دعا کرے اگر اس سے ملاقات ہو جائے تو اس کی عزت کرے اور اس کے ساتھ تواضع سے پیش آئے ۔ شروع میں ذرا تکلیف ہو گی مگر آہستہ آہستہ اصلاح ہو کر حسد جاتا رہے گا ۔

اسی طرح دنیا اور مال کی محبت ، نام اور تعریف چاہنے کی خواہش ، غرور و شیخی ، خود پسندی اور ریا وغیرہ اور بھی نفس کی خواہشات اور بیماریاں ہیں اور ان کی اصلاح کی ضرورت ہے ۔ ان سب خواہشات کی اصلاح کا ایک آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ جب نفس سے کوئی برائی یا گناہ کا کام ہو جائے تو اس کو کچھ سزا دے مثلاً اپنی حیثیت کے مطابق جرمانہ کے طور پر کچھ پیسے غریبوں کو دے دیا کرے ، یا کھانا کھلا دیا کرے یا نفلی روزہ یا نماز ادا کر لیا کرے ۔ انشاء اللہ اس سے بہت فائدہ ہو گا اور نفس کی اصلاح ہو جائے گی ۔

جزا و سزا:

عرض کیا گیا کہ مکتوباتِ معصومیہ میں ہے کہ " کافر اور کافری سے اللہ تعالیٰ کو ذاتی عداوت ہے " اور حضرت مجدد صاحبؒ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ " اس شخص پر نسبت حرام ہے جو اپنے آپ کو کافر زندیق سے بدتر نہ سمجھے " ان دونوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے ۔

فرمایا: ۔ کہ کافر اللہ تعالیٰ کا انکار کرتا ہے اور بغاوت کرتا ہے ، یا شرک کرتا ہے ، یا تکبر کرتا ہے ، جو کہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر حملہ ہے اور جو دوسرے جرائم اور گناہ ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیز یعنی دنیا کے نظام میں خلل ڈالتے ہیں ، جیسے ایک بڑھئی ، لوہار ، کمہار وغیرہ کوئی چیز بناتا ہے ، وہ اس کو ہر خراب کرنے والے سے بچاتا ہے اور بہتر طریقہ پر استعمال کی خواہش کرتا ہے ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی چاہتا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی چیز یعنی دنیا میں کوئی خلل نہ ڈالے

اور تھوڑی حرکت کو جو کہ قابل برداشت ہے برداشت کرتا ہے اور جو حد سے تجاوز کرے اس کو سزا دیتا ہے یعنی چور، ڈاکو، زانی وغیرہ۔ جیسا کہ دنیا کا دستور ہے کہ اگر کوئی بادشاہ کا باغی ہے تو بادشاہ اس کی سزا پھانسی رکھتا ہے لیکن جو اس کو حاکم تو مانتا ہے لیکن جرم کرتا ہے تو بادشاہ اس کو قتل نہیں کرتا بلکہ اصلاح کے لئے کچھ سزا دے دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی قیاس کرنا چاہئے کہ جو اس کا انکار کرے اس کو دائمی عذاب دے گا اور دوسرے گنہگاروں کو کچھ نہ کچھ سزا دے کر معارف کر دے گا۔ ان اللہ لا یغفر الذنوب۔ الخ۔

نیز فرمایا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "کبر میری چادر ہے"۔ حضرت مجدد صاحبؒ کا ایسا سمجھنا اعمال کی وجہ سے ہے نہ کہ اعتقاد کی وجہ سے، اور سالکِ کامل کو ایسا ہی سمجھنا چاہئے، کیونکہ اگر سالک کے دل میں ذرہ بھر بھی کبر باقی رہ گیا تو نقص ہے اور تکمیل نہ ہوئی۔ اور سالک کو اگر اپنے اعمال اچھے لگیں تو یہ نفس کی خواہش ہے، کیونکہ اچھے اعمال تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اگر نفس کی خواہش سے ہوں تو فنائے نفس مکمل نہ ہوئی اور نسبت فنائے نفس سے حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے "تم اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتے جب تک تمہاری ہر خواہش اس دین کے تابع نہ ہو جائے جس کو لے کر میں آیا ہوں۔"

غصہ کا ضبط کرنا:

انسان کا نفس اس کا نہایت طاقتور دشمن ہے۔ اس کو قابو میں رکھنا خاص طور پر غصے کے وقت میں ضبطِ نفس کرنا بہت بڑی بہادری ہے۔ انسان کے جسم کی ظاہری قوت فنا ہونے والی ہے اس لئے اگر کسی نے کسی آدمی کو پچھاڑ دیا تو اس کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ اس کے بالمقابل انسان کے نفس کی باطنی قوت باقی رہنے والی قوت ہے اور نفس امارہ کا مارنا عجیب چیز ہے۔

غصہ ایک ایسی حالت اور صفت ہے جس کے باعث نفس بدلہ لینے کے لئے حرکت میں آتا ہے اور خلافِ طبع امر کو دفع کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے باعث آدمی اعتدال کی حد سے نکل جاتا ہے، باطل و فحش کلام کرنے لگتا ہے، شرع اور عام اخلاق کے خلاف افعال و اعمال کا ارتکاب کرتا ہے، دل میں کینہ رکھتا ہے۔ غصہ کا آنا طبعی امر ہے۔ یہ محمود بھی ہے اور مذموم بھی۔ پس اگر یہ شرع کے موافق ہو، حق اور شرعی امور کے لئے ہو تو محمود ہے اور اگر حق کے خلاف ہو اور شرعی امور کی مخالفت میں یا حدودِ شرعی سے متجاوز ہو تو مذموم ہے۔

غصے میں انسان کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی اور انجام سوچنے کا ہوش نہیں رہتا، اس لئے اس کو روکنا چاہئے۔ حدیث میں اس کو روکنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ جب کسی کو غصہ آئے تو وہ وضو کر لیا کرے۔ بزرگوں نے اپنے تجربات کی بنا پر کچھ اور طریقے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً یہ کہ سب سے پہلے اس شخص کو اپنے سامنے سے ہٹادے جس پر غصہ آیا ہے۔ اگر وہ نہ ہٹے تو خود اس جگہ سے ٹل جائے۔ اگر کھڑا ہوا ہو تو بیٹھ جائے، پانی پی لے۔ اس جگہ سے ہٹنے کے بعد اپنے دل میں سوچے کہ جس قدر یہ شخص میرا قصور وار ہے میں اس سے بھی زیادہ اللہ کا قصور وار ہوں۔ جس طرح میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرا قصور معاف فرمادے، اسی طرح مجھے بھی اس کا قصور معاف کر دینا چاہئے۔

زبان کی حفاظت:

انسان کو اپنی زبان کی حفاظت کرنی چاہئے، یونہی بلا سوچے سمجھے نہیں بولنا چاہئے۔ یہی زبان ہے جو آدمی کو جنت میں لے جاتی ہے جبکہ وہ اس سے ایسا کلام کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہو اور یہی زبان آدمی کو دوزخ میں لے جاتی ہے جبکہ وہ اس سے ایسا کلام کرے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی و ناخوشی کا باعث ہو۔ اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ پہلے بات کو تولو پھر منہ سے بولو۔

جھوٹی افواہیں پھیلانا اور بلا تحقیق افواہوں پر یقین کرنا دونوں شیطانی کام ہیں۔ اس لئے کسی سے کوئی بات سنے تو اس کا صحیح یا غیر صحیح ہونا معلوم کر لینا چاہئے۔ اور جس کسی سے جو کچھ سنے، تو اس کی تصدیق کرنے سے پہلے اور اس کا جھوٹ سچ پرکھے بغیر اس کو خود بیان نہ کرے۔ اسی لئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ جو کچھ سنے اسے ویسا ہی بیان کر دے۔ یعنی جو کچھ سنا جائے اس کو یہ تحقیق کئے بغیر کہ سچ ہے یا جھوٹ ویسا ہی بیان کر دینا بمنزلہ جھوٹ بولنے کے ہے۔ اگر کوئی شخص جھوٹ نہ بولتا ہو لیکن یہ عادت رکھتا ہو کہ سنی ہوئی بات کو بلا تحقیق آگے بیان کر دے تو وہ ضرور جھوٹ میں گرفتار ہو جائے گا۔ اس لئے کہ کوئی شخص جو کچھ سنتا ہے وہ سب سچ نہیں ہوتا۔

تکبر کی مذمت:

اگر کوئی شخص اپنی حیثیت کے مطابق لباس اور رہائش میں زیب و زینت اختیار کرے اور اس کے دل میں اترانے اور دوسروں کو حقیر جاننے کا خیال نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کر کے اس کے انعامات کا اظہار اور ان کا شکر ادا کرنے کی نیت ہو تو یہ کبر و غرور نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ عادت ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر انسان دنیاوی لذتوں اور آسائشوں میں اس طرح مشغول ہو جائے کہ نہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرے اور نہ بندوں کے حقوق کی پرواہ کرے اور کمال کی صفات میں اپنے آپ کو دوسروں سے بڑھ کر جانے اور ساتھ ہی دوسروں کو حقیر و ذلیل بھی سمجھے تو یہ تکبر و غرور ہے۔

تکبر ایک سخت ترین مرض ہے بلکہ ام الامراض ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کی بہت زیادہ مذمت بیان ہوئی ہے۔ تکبر کرنے والا دنیا میں ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ وہ اپنی نگاہ میں تو بڑا ہوتا ہے لیکن لوگوں کے نزدیک ذلیل ہوتا ہے۔ تکبر ایک اعتبار سے کفر سے بھی اشد ہے اس لئے کہ کفر بھی دراصل تکبر ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ تکبر انفرادی اور اجتماعی نااتفاقی اور لڑائی جھگڑے کا باعث ہے۔ اس سے غصہ، حسد، حب جاہ وغیرہ برے اخلاق پیدا ہوتے ہیں، جس سے سیکڑوں قسم کے دنیاوی نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ انسان اپنی عزت و جاہ کے لئے تکبر والے اعمال کرتا ہے، لیکن ان اعمال و عادات میں اس بدتر ترین خصلت کا پایا جانا اسے قطعاً محسوس نہیں ہوتا اور دوسرے لوگ اسے فوراً سمجھ لیتے ہیں، اس لئے ان کی نظروں میں اور بھی ذلیل ہو جاتا ہے۔ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ اس کے عیب کے سبب حق تعالیٰ شانہ، اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور مخلوق کے دل چونکہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں اس لئے وہ لوگوں کو بھی اس شخص سے ناراض کر دیتا ہے اور سب کو اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔

بدگمانی:

باطنی گناہوں اور نفس کی برائیوں میں سے ایک برائی بدگمانی ہے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے، اس لئے کہ یہ نہ صرف خود گناہ ہے بلکہ بہت سے گناہوں کے ارتکاب کا باعث بھی ہے۔ کسی کے

متعلق بدگمانی کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کے ساتھ بدکلامی کرنا، بدگمانی کی پیدائش نفس امارہ سے ہے۔ جب نفس امارہ کو اپنے عیب نظر نہیں آتے تو وہ اپنے آپ کو پاکیزہ سمجھ کر شیطانی خیالات میں قدم رکھتا ہے اور اس کے باطن میں مومنوں کے متعلق بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان بدگمانیوں سے اس کے دل پر پے در پے سیاہ دھبے آتے رہتے ہیں، جن سے اس کا دل پوری طرح سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ شخص مؤمنوں سے منقطع ہو کر شیطانی گروہ میں بڑھتا جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کی توفیق نہ پائے تو پوری طرح شیطانی گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بدگمانی سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

گمان کی قسمیں:

ہر گمان گناہ نہیں ہے البتہ بعض گمان ایسے ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔ اس لئے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ کون کون سے گمان گناہ ہیں تاکہ ان سے بچا جاسکے اور جب تک کسی گمان کا شرعاً جائز ہونا معلوم نہ ہو جائے، اس سے بچتے رہنا چاہئے۔ علماء و فقہا نے گمان کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم حرام ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی رکھے کہ وہ اس کو عذاب ہی دے گا یا مصیبت ہی میں رکھے گا، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت سے بالکل مایوس ہو جائے۔ ظن کی دوسری قسم وہ ہے جو مامور بہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جو کام ایسے ہیں جن کی کسی حالت پر عمل کرنا ضروری ہے اور اس جانب کے لئے کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے تو وہاں ظن غالب پر عمل کرنا واجب ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو اور وہاں کوئی ایسا آدمی موجود نہ ہو جس سے سمتِ قبلہ معلوم کی جاسکے تو وہاں اٹکل کر کے اپنے گمان غالب پر عمل کرنا واجب ہے۔ پس اگر اس نے اپنے گمان غالب پر عمل کرتے ہوئے کسی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نماز قبلہ سے مختلف سمت میں پڑھی گئی ہے تو اس کی نماز جائز ہو جائے گی کیونکہ اس پر جو کچھ واجب تھا اس نے اس کو پورا کر دیا ہے۔

ظن کی تیسری قسم مستحب و مندوب ہے، وہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ نیک گمان رکھے کہ اس پر ثواب ملتا ہے۔ چوتھی قسم مباح ظن ہے، مثلاً اگر کسی شخص کو نماز کی رکعتوں میں شک ہو جائے کہ تین رکعت پڑھی ہیں یا چار تو اپنے ظن غالب پر عمل کرنا جائز و مباح ہے۔

باطل گمان:

گمان کے حکم کے متعلق کلیہ قاعدہ یہ ہے کہ جس گمان سے کوئی غیب کا دعویٰ کرے یا کسی مسلمان کے حق میں عیب لگائے یا اس سے ملال پیدا ہو یا اس سے اپنے نفس میں تکبر وغیرہ بری خصلت پیدا ہو یا باری تعالیٰ جل شانہ کی نسبت اپنی رائے سے کوئی حکم تراشے یا شریعت میں کمی بیشی کرے یا مؤمنوں کے خلاف راہ بنائے تو یہ سب گمان باطل اور شیطانی وسوسہ ہیں اور اگر ایسا گمان ہو کہ جس سے اپنے نفس کی اصلاح کرے یا اس سے اس کا تکبر ٹوٹے یا مسلمان بھائی کی نسبت نیک گمان کرے یا اس سے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق بڑھے یا باری تعالیٰ جل شانہ کی طرف رجوع ہو تو ایسے گمان میں مضائقہ نہیں بلکہ یہ اچھا گمان ہے۔

شیطانی القاء:

جس چیز کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھا ہو یا اپنے کان سے نہ سنا ہو اور دل میں اس کے بارے میں بد گمانی پیدا ہو تو یہ شیطانی القاء ہے، اس لئے اس کو جھٹلانا اور اس کی نفی کرنا چاہئے کیونکہ یہ بہت بڑا فسق و گناہ ہے۔ بد گمانی کا نتیجہ تجسس ہے کیونکہ دل محض گمان پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی تحقیق میں لگ جاتا اور تجسس میں مشغول ہو جاتا ہے جو جائز نہیں۔ چھپ کر کسی کی باتیں سننا یا اپنے آپ کو سوتا ہوا ظاہر کر کے کسی کی باتیں سننا، یہ بھی تجسس میں داخل ہے۔

بد گمانی دل کی غیبت ہوتی ہے اور غیبت ایک بہت بڑا گناہ اور بہت بڑی برائی ہے۔ جس طرح قول و فعل سے غیبت ہوتی ہے اسی طرح دل سے بھی غیبت ہوتی ہے۔ اسی کو بد گمانی کہتے ہیں اور بد گمانی پر بھی وہی وعید لازم آئے گی جو غیبت پر لازم آتی ہے۔

باب ششم:

وعظ ارشاد

مجذوب و دیوانہ:

مجذوب اور دیوانے میں بظاہر کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ لوگ تکوینی امور کے لئے مقرر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی عقل سلب فرمالیتا ہے تاکہ وہ امور شرعیہ کے مکلف نہ رہیں اور تشریعی احکام کی بجائے صرف سپرد کردہ تکوینی امور میں مشغول رہیں کیونکہ وہی ان کی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رجالِ تشریع اور رجال تکوین علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات رجال تشریع کو رجال تکوین کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اپنے وقت کے انبیاء علیہم السلام کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانہ میں رجال تکوین کون ہیں۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا واقعہ مذکور ہے۔ حضرت خضرؑ رجال تکوین میں سے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو رجال تشریع میں سے ہیں خبر بھی نہیں۔ البتہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تکوین و تشریع ایک ہی شخص میں جمع ہو جاتی ہیں۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات حضرت خضرؑ سے ہوئی اور انھوں نے ساتھ رہنے کی فرمائش کی تو حضرت خضرؑ نے کہا "انی علیٰ علم من علم الله علمنیه لا تعلمه انت و انت علی علم علمکه الله لا اعلمه (کتاب العلم) (اللہ تعالیٰ نے ایک قسم کا علم مجھ کو دیا ہے جو تم کو نہیں ملا ہے اور تم کو ایک قسم کا علم دیا ہے جو مجھ کو نہیں ملا ہے)۔

مجذوب اور دیوانہ (پاگل) میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ بعض مجذوب ظاہر میں شریعت کی بالکل پابندی نہیں کرتے، ستر بھی کھلا رہتا ہے، قدرت ان کو عجیب حال میں رکھتی ہے۔ سمجھ سے باہر ہے، یہی تو وجہ ہے کہ شریعت نے واضح حکم فرمایا کہ صاحبِ عقل کو صاحبِ حال کی قطعاً اتباع نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اس کے متعلق زیادہ سوچنا بھی نہیں چاہیئے اور اس کا

معاملہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سپرد کرنا چاہیئے، نہ ان سے زیادہ عقیدت رکھے نہ بد ظن رکھے۔ ان کا معاملہ جدا سمجھے جس کا اپنے سے تعلق نہیں۔ اور بعض مجذوب ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بظاہر شرع شریف کے خلاف کوئی کام ان سے صادر نہیں ہوتا۔ دراصل بات یہ ہے کہ قدرت جب کسی بندے کو اپنے تکوینی نظام کے امور کے لئے منتخب کر لیتی ہے تو اس کا معاملہ عوام سے مختلف کر دیتی ہے اس کو ہم صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے وہی جانتا ہے، جس کے ذمہ کام لگایا جاتا ہے۔ لیکن وہ بھی قدرت کے معاملات کو پوشیدہ رکھنے کے مکلف ہوتے ہیں۔ لہذا یہ مسئلہ واضح نہیں ہوتا۔ ہاں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مجذوب جب کسی آدمی پر توجہ ڈالتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس آدمی کا حال مجذوب کی طرح ہو جاتا ہے۔

تعمیر جنت

قرآن کریم میں جنت کے بارے میں یہ بھی ہے کہ اعدت للمتقین (وہ تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کے لئے) اور پھر روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جس نے فلاں عمل کیا اس نے جنت میں ایک گھر بنا لیا، تو اگر جنت بنی بنائی ہے تو اس تعمیر کا کیا مطلب؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے شہروں میں کوئی بستی بسائی ہوتی ہے تو حکومت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پانی، بجلی فراہم کر دیتی ہے اور سڑکیں بنا دیتی ہے، پلاٹوں کو بھی قطع کر دیتی ہے، اس کے لئے بعد وہ پلاٹ مالکان کو دے دیئے جاتے ہیں کہ جس طرح چاہیں تعمیر کریں اور جس نقشہ کا چاہیں مکان بنائیں بشرطیکہ نقشہ گورنمنٹ منظور کر لے۔ یہی حال جنت کا ہے کہ پلاٹ مخصوص کر دیا ہے جس طرح چاہیں اپنے اعمال کے ذریعہ اس میں تعمیر کرتے رہیں۔ نہریں، باغات اور عام آسائش کی چیزیں اللہ تعالیٰ نے پہلے سے فراہم کر دی ہیں۔

یوم حساب کی مقدار

ازل سے ابد تک کا زمانہ اللہ تعالیٰ کے حق میں تو آن واحد ہے۔ ماہ و سال کا اجرا اس پر نہیں ہوتا کیونکہ زمین، چاند اور سورج کی حرکت سے شب و روز اور ماہ و سال بنتے ہیں اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح اس کی تمام صفات ہر وقت فعال ہیں۔ محل اگر قابل ہو تو جس صفت کا قابل ہے اس کا اثر قبول کرتا ہے ورنہ نہیں۔

مثلاً صفتِ احیاء و اماتت دونوں بیک وقت ہرآن کام کر رہی ہیں اور ہرآن ہر چیز پر اماتت بھی واقع ہو رہی ہے اور احیاء بھی لیکن یہ اس طرح سرعت کے ساتھ علی التوالی واقع ہو رہی ہے کہ جس میں صفتِ احیاء کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے اس پر اصطلاحی موت طاری نہیں ہوتی لیکن جب اس میں صفت احیاء کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی تو اس پر صرف اماتت کا اثر واقع ہوتا ہے احیاء کا نہیں۔

اسی طرح یوم حساب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حساب کی صفت کار فرما ہوگی۔ اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کوئی تو صلوۃ مفروضہ کی ادائیگی کے عرصہ میں حساب سے فارغ ہو جائے گا، کوئی ہزار سال کے عرصہ کے برابر میں اور کوئی پچاس ہزار سال کے عرصہ کے برابر میں۔

صحابہء کرام کا اختلاف

صحابہء کرام کا آپس کا اختلاف اجتہادی تھا، ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ کسی بات پر الزام لگائیں کسی کو صحیح کسی کو غلط ٹھہرائیں کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے صحابہ مثل ستاروں کے ہیں جس نے ان میں سے کسی کی بھی اتباع کر لی وہ فلاح پا گیا۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کا اختلاف اجتہادی تھا، ان میں سے کسی کو غلط راستے پر ٹھہرا کر اسلام سے خارج نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ ان حضرات میں سے بہت سے عشرہ مبشرہ میں سے تھے گو کہ ان میں آپس میں اختلاف تھا مگر اسلام کے نام پر حرف نہیں آنے دیتے تھے۔

خواب بیان کرنا

بعض خواب تو اضغاثِ احلام ہوتے ہیں، بعض حدیث نفس یا تحت الشعور کی باتیں اور بعض مبشرات ہوتے ہیں۔ پھر مبشرات میں سے بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ جیسے دیکھے ویسی ہی تعبیر سامنے آجاتی ہے اور بعض تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں۔ جو مبشرات محتاج تعبیر ہوں انھیں ہر شخص سے بیان نہیں کرنا چاہئے کیونکہ بزرگ کہتے ہیں کہ ایسا خواب معلق رہتا ہے اور جب اس کی تعبیر کوئی شخص بیان کر دے تو جیسی تعبیر اس نے بیان کی ہے ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ (حدیث میں بھی یہی آتا ہے) اس لئے ایسے خواب کسی ایسے شخص کے سامنے بیان کرے جو اہل ہو، اور اہل دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جو عالم مثال سے واقف ہوتے ہیں اور جنہیں قرآن و حدیث وغیرہ کے

ذریعہ اس کا علم ہوتا ہے کہ عالم مثال میں کس چیز کی کیا شکل ہے۔ مثلاً عزیز مصر کا خواب کہ سات دبلی گائیں، سات موٹی گائیوں کو کھا رہی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ابتدائی سات سالوں میں شادابی اور بعد کے سات سالوں میں قحط سالی کی تعبیر بیان فرمائی ہے اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ عالم مثال میں شادابی کی شکل موٹی گائے اور قحط سالی کی شکل دبلی گائے ہے۔ دوسرے حضرات وہ ہوتے ہیں کہ جب ان سے کوئی اس طرح کا خواب بیان کیا جائے تو اپنے دل کو ہر نسبت سے خالی کر کے اس میں دیکھتے ہیں اور پھر انھیں جو تعبیر معلوم ہوتی ہے بیان کر دیتے ہیں۔

حضورؐ کی زیارت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شکل وصورت یا لباس میں دیکھنا منجملہ اور وجوہ کے اس تعبیر کی وجہ سے بھی ہوتا ہے جو اس خواب کی ہوتی ہے۔ یعنی اس خواب کے ذریعے اللہ تعالیٰ خواب دیکھنے والے کو جو کچھ بتانا چاہتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل و لباس اس کے مناسب ہوتی ہے۔

اعمال نامہ

عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیں گے اور اعمال نامہ آدمی کی عمر کے مطابق بہت بڑا ہو گا یعنی اس کی بہت جلدیں ہوں گی تو آدمی ان بہت ساری جلدوں کو ایک ہاتھ میں کیسے اٹھائے گا؟ آپؒ نے جواب میں فرمایا کہ "آپ نے کتنی کتابیں پڑھی ہیں اور وہ سب دماغ میں محفوظ ہیں بلکہ دماغ کی بھی ایک چھوٹی سی رگ میں۔ بس اسی پر اس بات کو بھی قیاس کر لیجئے۔

نور

جو نور کہ مخلوق ہے خواہ وہ آگ کا ہو یا سورج کا یا فرشتے وغیرہ کا یہ سب ذی جسم ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی نور ہے۔ لیکن مخلوق کے نور کو اللہ تعالیٰ کے نور سے کچھ نسبت نہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ ازل ہے جس کی کوئی ابتدا نہیں نہ معلوم کب تک پردہ، اخفا میں رہا اور کتنے عرصہ کے بعد اسے

اپنے ظاہر کرنے کی خواہش ہوئی (کنت کنز امخفیا کے الفاظ بتاتے ہیں کہ خفا پر بھی ایک عرصہ گذرا ہے) تو جب اس نے ظہور فرمایا تو اس کا تعین اول نورِ محمدی ہوا۔ یہ نورِ محمدی بھی نمعلوم کتنے عرصہ پردہ، خفا میں رہا اور پھر مکہ میں ظہور ہوا۔

صفات و تجلیات الہیٰ

عرض کیا گیا کہ حدیث شریف میں آیا ہے حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "میں بندہ سے ایسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ مجھ سے گمان کرتا ہے۔ جو میرا ذکر کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں اور جو مجھے اپنے نفس میں یاد کرتا ہے، میں اس کو اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں۔ الخ۔" یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں اس سے کیا مفہوم ہے؟ فرمایا: اس کی کیفیت کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ بے چون و بے چگون ذات ہے۔ بہرحال اس طرح کی اور بھی کئی حدیثیں ہیں۔ مثلاً میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، یا بندہ جب سجدہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے قدموں پر کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا وغیرہ۔ یہاں علماء اور صوفیا نے یہ توضیح کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی مختلف تجلیات ہیں اور یہ تجلیات بالواسطہ ہوتی ہیں، اور دنیا کی چیزوں میں جو رونق اور صفات ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی تجلیات ہیں۔ وہ چیزیں اس وقت تک اپنی صفات سے متصف رہتی ہیں جب تک اللہ تعالیٰ کی صفات کی تجلیات ان پر پڑتی رہتی ہیں۔ اور یہ تجلیات براہ راست نہیں ہوتیں، بلکہ کئی کئی حجابات کے ساتھ ہوتی ہیں اور بعض دفعہ تو صفات کی تجلیات کی ظل ہوتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی مربی اللہ تعالیٰ کی صفات کی تجلیات مختلف حجابات کے ساتھ ہوتی ہیں، لیکن دوسروں کے مربی انبیاء علیہم السلام کی صفات کے ظلات ہوتے ہیں۔ ہر ولی کسی نبی کے قدم پر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات ایک مخفی خزانہ تھا۔ اللہ نے چاہا کہ میں اپنے آپ کو ظاہر کروں، یہ تنزل اول تھا اور چاہت (حب) پہلی صفت، اسی کو صوفیا نے نقش اول کہا ہے۔ اس کے بعد حقیقت محمدی علیہ الصلوۃ والسلام ہے، سب سے پہلے ذاتِ تعالیٰ سے شوق ظاہر ہوا، اسی لئے اللہ تعالیٰ کو بندے سے بندے کی نسبت زیادہ محبت ہے۔ اب کائنات کو وجود دینے کے لئے علم کی ضرورت ہوئی، علم تنزل ثانی ہے۔ دوسری ضرورت شان علم ہے اور اس کے بعد قدرت اور وجود ہے اور اس میں جان اور روح ڈالنے کی ضرورت تھی، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی صفت حیات ہے۔ جب

اللہ تعالیٰ کسی چیز کو زندگی بخشتا ہے تو اس پر صفتِ حیات کی تجلی ڈالتا ہے اور یہ تجلی مختلف حجابات کے ساتھ ہوتی ہے اور بعض دفعہ تجلی کا ظل ہوتی ہے۔ یہ جو اپنی ذات کی حیات ہے یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ اسی طرح علم کی شان، قدرت کی شان وغیرہ۔ انہی کو شیونات کہتے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام کے پتلے میں روح پھونکوں تو تم اس کو سجدہ کرنا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اصل میں اپنی صفتِ حیات کی تجلی آدم علیہ السلام کے پتلے پر ڈالی تو آدم علیہ السلام میں جان آگئی۔ یہ جو فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا دراصل اسی تجلی کو سجدہ کرنے کا حکم تھا۔ خانہ کعبہ جو ہمارا مسجود الیہ ہے وہاں بھی ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ذات کی تجلیات پڑتی رہتی ہیں اور انہی تجلیات کو ہم سجدہ کرتے ہیں۔ نماز کے اندر ہم یوں گمان کرتے ہیں کہ خانہ کعبہ گویا ہمارے سامنے ہے حالانکہ وہ یہاں سے بعض دفعہ ہزاروں میل دور ہوتا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کی تجلیات کو سجدہ کر رہے ہوتے ہیں۔ جب آدمی کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ فنائے نفس اور اس کے اوپر کے کمالات تک پہنچ جاتا ہے تو بعض دفعہ نماز کے اندر اللہ تعالیٰ کے فضل سے آدمی اور خانہ کعبہ کے درمیانی حجابات اٹھا دیئے جاتے ہیں اور وہ بالکل خانہ کعبہ کے سامنے ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ان ذاتی تجلیات کے قدموں پر سجدہ کرتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہر وقت وہاں پڑ رہی ہیں تو اس وقت یہ حدیث شریف صادق آتی ہے کہ "سجدہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے قدموں پر سجدہ کرتا ہے۔" جب کسی کی زندگی ختم کرنی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی تجلیات حیات اس سے اٹھالیتا ہے اور اس چیز کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

تلاش حق

تلاش حق کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ ہر شخص خواہ وہ خاندانی طور پر کسی مذہب اور عقیدہ پر ہو وہ فطری طور پر ہمیشہ تلاش حق میں سرگرداں رہتا ہے اور اپنی سمجھ و کوشش کے مطابق کوئی نہ کوئی راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اس کو حق سمجھتا اور حق تعالیٰ تک پہنچانے والا جانتا ہے اگرچہ صحیح رہنمائی حاصل نہ ہونے کے باعث وہ گمراہی کے جنگل میں بھٹکتا رہتا ہے۔

تلاش حق سے مراد حق تعالیٰ شانہ کی تلاش ہو یا راہ حق یعنی صراط مستقیم کی تلاش ہو، دونوں کا مطلب ایک ہی ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کی تلاش سے بھی یہی مراد ہے کہ اس تعالیٰ شانہ کو راضی اور خوش کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی حقیقت

حقیقت یہ ہے کہ نگاہ تو انسانی حواس میں سے ایک حاسہ ہے، جس سے صرف محسوس چیزوں کا علم ہو سکتا ہے۔ حق تعالیٰ کی ذاتِ پاک تو عقل و وہم کے احاطہ سے بالاتر ہے۔ اس کا علم حاسہ، بصر سے کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات و صفات غیر محدود ہیں اور انسانی حواس اور عقل و خیال سب محدود چیزیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک غیر محدود کسی محدود میں نہیں سما سکتا۔ اسی لئے تمام عقل مند اور فلسفی اور تمام صوفیائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی حقیقت کو نہ کسی نے پایا ہے اور نہ کوئی پاسکتا ہے۔ البتہ اس قدر سب مانتے ہیں کہ وہ ذاتِ پاک موجود ہے اور اس کی صفات برحق ہیں۔

وجودِ خالق کائنات

کائنات کی ہر ادنیٰ سے ادنیٰ چیز اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کا خالق کوئی ہے۔ وہ وحدہ لاشریک اور قادر مطلق ہے۔ اس پروردگارِ عالم نے اپنی قدرت کاملہ سے زمین کے فرش کو سنوارا، آسمانوں کو ستونوں کے بغیر قائم کیا۔ ملکوت کی دنیا کو منور کیا، بلند پہاڑوں کو زمین پر قائم کیا۔ انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر حضرت آدم علیہ السلام کو مسجود ملائک ٹھہرایا۔ کائنات کی ایک ایک چیز اس کی قدرتِ کاملہ کی طرف دلالت کرتی ہے۔ خود ہمارے جسم کی ساخت و پرداخت اس امر کی رہنمائی کرتی ہے کہ وہ ذاتِ پاک جس نے انسان کو بنایا مبارک اور احسن الخالقین ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام جہان اور تمام موجودات کا خالق و مالک صرف اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہے، اسی کا ملک ہے اور اسی کا حکم ہے، اسی کی اطاعت ہر انسان پر لازم ہے، اسی کی ہدایت پر چلنا اور اسی کی خوشنودی کو حاصل کرنا باعث فلاح و نجات ہے۔

ہدایت کا ادنیٰ درجہ

ہدایت کا لفظ عام ہے، اس کے مختلف درجات ہیں۔ کیونکہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور قربِ الٰہیٰ کے طریقے پر چلنے کا نام ہے اور قربِ الٰہیٰ کے درجات

مختلف اور غیر متناہی ہیں، اس لئے ہدایت کے درجات بھی بے حد ہیں۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ بندہ کفر و شرک سے نجات پائے اور اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک مانے، جس سے انسان کا رخ غلط راستہ سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جس قدر فاصلہ ہے اس کو طے کرنے کے ہر درجہ کا نام ہدایت ہے۔ اس لئے ہدایت کی طلب سے کوئی انسان کسی وقت بھی بے نیاز نہیں ہے۔ ہدایت کا واحد ذریعہ اب قرآن حکیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہء حسنہ ہے۔

کامل ترین ضابطہء حیات

اسلام بہترین دین اور مکمل ترین ضابطہء حیات ہے۔ صرف اس سچے دین پر عمل کر کے ہی تمام دنیا کے انسان نیکی و بھلائی اور ہر قسم کی ترقی کے اعلیٰ درجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ مادی زندگی ہو یا روحانی اس کے ہر حصہ میں اسلام نے انسان کی ایسی مکمل رہنمائی کی ہے جس کے مطابق عمل کر کے وہ اس کے انتہائی کمال تک پہنچ سکتا ہے۔

امن کا داعی

حقیقت یہ ہے کہ جو بڑی طاقتیں دنیا میں امن قائم کرنے کی دعویدار ہیں ان کے سوچنے کا انداز اور کام کرنے کا طریقہ فطرت کے بالکل مخالف اور اصول کے سراسر خلاف ہے، کیونکہ وہ مرض کا علاج تو کرتے ہیں لیکن اس کے اسباب پر توجہ نہیں دیتے۔

آج دنیا کی تمام قومیں اخلاقی پستی کے بھنور میں گرفتار اور روز بروز پستی کی تہہ میں چلی جارہی ہیں۔ اخلاقی گراوٹ نے اچھے اور برے کی تمیز اٹھادی ہے۔ خود غرضی اور حرص نے لوگوں کو ایسا اندھا بنا دیا ہے کہ وہ اپنے تھوڑے سے فائدہ کے لئے دوسرے کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ مذہب ان سب برائیوں کی روک تھام کرتا ہے، کیونکہ اس کی نگاہ برائیوں کی جڑ یعنی نفس کی اصلاح پر ہوتی ہے۔ نفس کی اصلاح ہو جائے تو زندگیاں سنور جاتی ہیں اور خوشی کی فضا عام ہو کر انسانیت کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتی ہے۔ وہ مذہب جو حقیقت میں دنیا کو امن کی دعوت دیتا ہے، وہ اسلام ہی ہے۔ اسلام شروع سے آخر تک امن و سلامتی ہے۔ اسلام کی امن پسندی ہر دور میں تمام دنیا والے مانتے ہیں۔ اسلام کسی پر زبردستی اور سختی کر کے نہیں منوایا گیا۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچایا تو آپ کے پاس نہ کوئی حکومت تھی نہ جنگی طاقت اور نہ مال و دولت کے خزانے تھے، بلکہ یہ سب کچھ مخالفین کے پاس تھا، جس کو وہ اسلام لانے والے نہتے مسلمانوں پر ظلم ڈھانے کے لئے برابر تیرہ برس تک مکہ مکرمہ میں استعمال کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کو وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کو ہجرت کی۔ تاریخ گواہ ہے اسلام سے پہلے دنیا میں امن و امان کی حالت نہایت خراب تھی، انسانیت دم توڑ رہی تھی، عجمی بادشاہوں نے دنیا کو غلام بنا رکھا تھا۔ مجبور و بے بس انسانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے۔ خود عرب میں جنگ و فساد کا بازار گرم تھا۔ اسلام نے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے دنیا کو زندگی کے صحیح انداز سکھائے اور انسان کو اس کا صحیح مقام عطا کیا۔ اسلام کا انقلابی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے غلاموں کو بھی انسانی برداری میں برابر کا شریک ٹھہرایا اور فرمایا کہ تم سب ایک جماعت کے افراد ہو، سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو، نہ آقا کو غلام پر فضیلت ہے اور نہ حاکم کو محکوم پر، کسی عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے بلکہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ○ (الحجرات، آیت ۱۳) جو زیادہ تقویٰ اور پرہیزگاری کرنے والا ہے، اللہ کے نزدیک وہی زیادہ بزرگ ہے۔

آج مغرب میں آزادی، جمہوریت اور مساوات کا بڑا چرچا ہے، حالانکہ انہوں نے گورے اور کالے کا فرق اور علاقائی تعصب کو اس قدر ہوا دی ہوئی ہے کہ خود موجودہ تہذیب کے چاہنے والے اس سے شرمندہ ہیں۔ لیکن اسلام نے زندگی کا جو نظام پیش کیا ہے اس میں نسلی برتری کی گنجائش نہیں ہے۔ تمام ملتِ اسلامیہ ایک وحدت ہے۔ اس نے اتحاد و اتفاق کا وہی تصور پیش کیا ہے جو قانون فطرت کے عین مطابق ہے۔ اسلام نہ تو محض عقیدہ کا نام ہے اور نہ یہ انفرادی و اجتماعی زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے تک محدود ہے، بلکہ یہ ایک دائمی سچائی ہے اور یہ دنیا کے لئے زندگی کا ایک مکمل اور انصاف والا نظام پیش کرتا ہے۔

احترام آدمیت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اپنی خلافت کا تاج اس کے سر پر رکھا۔ تمام مخلوق کو انسان کے لئے اور انسان کو اپنے لئے پیدا فرمایا ہے۔ انسان اور اس کے تمام اعضاء و

اجزاء کو محترم قرار دے کر احترام آدمیت کی ہدایت فرمائی ہے۔ اسلام تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ کا کنبہ اور ایک گھرانہ قرار دیتا ہے اور کسی کو بھی دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام انسانی اخوت و بھائی چارے کا سب سے بڑا داعی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد اگر کوئی عمل زیادہ اہمیت رکھتا ہے تو وہ خدمتِ خلق ہے یعنی ہر شخص معاشرہ کے بے سہارا اور کمزور افراد کی مدد کرے اور انسانی ہمدردی اور احترام آدمیت کو اپنی زندگی کا شعار بنائے۔ عداوت و نفرت اور بغض و حسد سے اپنے آپ کو دور رکھے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور میں خاص امتیاز عطا فرمایا ہے، جس کے ذریعہ وہ تمام کائنات سے اپنے کام نکالتا ہے۔ قوتِ گویائی اور افہام و تفہیم کا جو ملکہ اسے عطا فرمایا گیا ہے وہ کسی دوسرے حیوان کو حاصل نہیں، پس عقل و شعور اور افہام و تفہیم کی صلاحیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر آدمی ایک دوسرے کا احترام کرے، اپنے خالق و مالک و رازق کو پہچانے اور اس کی مرضی و نامرضی کو معلوم کر کے اس کی مرضیات کی پیروی کرے اور اس کی نامرضیات سے بچتا رہے۔

احترام و شفقت

جو شخص اپنے سے چھوٹوں پر رحم کرتا ہے اور ان کے ساتھ شفقت سے پیش آتا ہے۔ تو وہ بھی اس کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آتے ہیں، اسی طرح جو شخص اپنے بڑوں کا ادب و احترام کرتا ہے وہ بھی اس کے ساتھ شفقت و رحمت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس طرح اپنے کنبے، اپنے متعلقین، اہل محلہ اور اہل شہر میں ایک اچھا معاشرہ جنم لیتا ہے اور تمام لوگ عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔

نفس کے حقوق

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذمہ ماں، باپ، اولاد، میاں، بیوی، عزیز و اقارب، دوست احباب، ہمسایوں، خادموں، یتیموں اور اہل شہر اور اہل ملک وغیرہ کے حقوق عائد کئے ہیں اسی طرح اس کی اپنی ذات اور اس کے نفس کے حقوق بھی لازم کئے ہیں۔ حقوق نفس میں سے ایک حق یہ ہے کہ اپنے اوپر اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی امر کا مکلف نہیں بنایا۔ تمام احکام شریعت میں بیمار، کمزور، ضعیف، مرد و عورت کی رعایت کی گئی ہے۔

ملی وحدت

اسلام امن و سلامتی کا دوسرا نام ہے۔ملی وحدت اور قومی یکجہتی اسلام کی امتیازی شان ہے۔ مل جل کر رہنا اور امن قائم کرنا مسلمانوں کا مقصدِ حیات ہے۔اقوام عالم میں فرزندان اسلام کو ہی یہ فضیلت حاصل ہے کہ یہ کائنات کے محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔آپ ہی نے انسانی برادری کو سماجی تحفظ اور معاشی استحکام کا راستہ دکھایا، عدل و انصاف اور امانت و دیانت کے طریقے سکھائے، ذاتی مفادات پر قومی و ملی مفادات کو ترجیح دینے کا درس دیا۔

جو لوگ رنگ و نسل، قبیلہ و قوم، امیری و غریبی، حاکمیت و محکومیت کی بنیاد پر بندگان خدا میں امتیاز و تفریق قائم کرتے ہیں، وہ اسلامی، ملی اور قومی وحدت کے تقاضوں سے ناواقف ہیں۔ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے بے خبر ہیں یا اپنی بد نیتی کے باعث ان باتوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ایسے لوگ نہ مزدوروں کے ہمدرد ہو سکتے ہیں، نہ کسانوں کے، نہ طالبِ علموں کے مخلص ہیں اور نہ دانشوروں کے قدر دان ہیں۔ان لوگوں کا اعلیٰ انسانی قدروں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔خواہ وہ ظاہری شان و شوکت، چرب زبانی اور بلند بانگ دعووں میں کتنے ہی آگے کیوں نہ ہوں۔اسلام تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ کا کنبہ اور ایک ہی گھرانہ قرار دیتا ہے اور ان میں فضیلت و بزرگی کا معیار تقویٰ کو قرار دیتا ہے۔

دنیا کی کامیابی کا انحصار

جس طرح آخرت کی کامیابی اس صراط مستقیم پر موقوف ہے جو انسانوں کو جنت کی طرف لے جاتی ہے، اسی طرح دنیا کے تمام کاموں میں بھی غور کیا جائے تو کامیابی کا مدار صراط مستقیم پر ہی ہے۔جس کام کے حاصل کرنے کے لئے سیدھے اور صحیح راستے پر چلا جائے اور وہ آلات و ذرائع استعمال کئے جائیں جن کے نتیجے میں اس مقصد کا حصول عادۃ لازمی ہو تو عادۃ کامیابی لازمی ہوتی ہے جہاں کہیں انسان اپنے دنیاوی مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ کام کے کسی مرحلہ میں اس نے غلطی کی ہے اور سیدھا راستہ چھوٹ گیا ہے اس لئے ناکامی ہوئی ہے۔پس صراط مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دین کے کاموں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے، دنیا کے کاموں کی درستگی و کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے۔اور دین و دنیا دونوں میں صراط مستقیم

کے بغیر فلاح و کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ رہا یہ سوال کے سیدھا راستہ کون سا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ نے خود متعین کر دیا ہے کہ اگر تم سیدھا راستہ چاہتے ہو تو ان لوگوں کو تلاش کرو اور انہی کا طریقہ اختیار کرو جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ نبی کا راستہ اختیار کرو کیونکہ اس دنیا میں نبی کا موجود رہنا بھی دائمی طور پر نہیں ہے اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اس لئے اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم حاصل ہونے کے ذرائع میں انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ایسے حضرات کو بھی شامل فرما دیا جو قیامت تک ہمیشہ پائے جاتے رہیں گے اور وہ صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔

بلند ہمتی

انسان کا کمال اور اس کی فضیلت اچھے اخلاق و عادات سے ہے۔ کوئی شخص جس قدر اچھے اخلاق و عادات کا حامل ہو گا اس کو اسی قدر فضیلت حاصل ہو گی۔ سخاوت، شجاعت، بردباری، تواضع اور خدمت خلق وغیرہ کی طرح بلند ہمتی بھی ایک اچھی عادت ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو انسان کو ترقی کی معراج پر پہنچاتی اور دین و دنیا میں سعادت مند بناتی ہے۔

بلند ہمتی انسان کی فطرت ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اسی وقت سے بلند ہمتی اور جدوجہد کا مظاہرہ شروع کر دیتا ہے۔ ہاتھ پاؤں مارتا، اپنے آپ کو بستر سے بلند کرتا اور ہر چیز کو اپنے قبضہ میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔ پست ہمتی سے عمل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور ایسا آدمی بے عمل زندگی کے باعث دنیا میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ دنیا میں ذلت و خواری، بے قدری و بے وقاری سے زندگی بسر کرتا ہے اور کس مپرسی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

جن لوگوں نے ناموری حاصل کی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کام کئے ہیں وہ بلند ہمتی کی بدولت انجام دئے ہیں۔ اگر سائنسی تحقیقات میں ترقی کی ہے تو وہ بھی اسی کا نتیجہ ہے اور اگر ایجادات کی ہیں تو وہ بھی اسی کی مرہون منت ہیں۔ اگر انسان کا حوصلہ بلند نہ ہوتا تو بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں کو کون سر کرتا، چاند کی سرزمین پر کون اترتا، انسان کی روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی بیشمار ایجادات کون کرتا۔ اگر ہمت نہ ہوتی تو محنت و مشقت کی عادت ہی نہ ہوتی اور تمام کام نامکمل رہ جاتے۔ مشکلات پر قابو پانا بھی بلند ہمتی ہی کے طفیل حاصل ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور صحابہ کرام و سلف صالحین کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے بڑی سے بڑی مشکلات اور مصائب کے وقت میں بھی اپنی ہمتوں کو پست نہیں ہونے دیا۔ پریشانیوں اور مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، بالاخر کامیابی نے ان کے قدم چومے اور ان کی کوششیں بارآور ہوئیں۔

تخلیق آدم کا مقصد

حقیقت یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے راضی ہو جاتا ہے تو جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے وہ اس سے اپنے اس بندے کو نفع حاصل کرنے کی اجازت عطا فرما دیتا ہے۔ پس رضائے الٰہی ہی انسان کی پیدائش کا اصل مقصد، اس کی زندگی کا حقیقی منشا، محبت الٰہی کے ثمرات میں سب سے اعلیٰ ثمرہ اور مقربین خدا کے درجات قرب میں سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔

تخلیق آدم

جس خالق کائنات نے آسمانوں و زمین، چاند و سورج، سیاروں و ستاروں، باد و باراں اور گرمی و سردی وغیرہ کا ایسا محیر العقول نظام پیدا کیا ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو بالکل اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو اور اس کو یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے، یہاں اس کے ذمہ کیا کیا فرائض ہیں، اس کی منزل مقصود کیا ہے او وہ کس طرح منزل مقصود کو حاصل کر سکتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا فرمایا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ جن کاموں کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان کو بجا لانا اور جن کاموں سے منع کیا ہے ان سے رک جانا۔ اس مقصد کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ ایک نظام بنایا ہے جس کا نام رسالت وحی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے، وہ کون سے کاموں کو پسند فرماتا ہے اور کون سے کاموں کو ناپسند فرماتا ہے۔ ان میں سے ایک چیز انسان کے حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، منہ

اور ہاتھ پاؤں ہیں۔ دوسری چیز عقل اور تیسری چیز وحی ہے۔ انسان کو بہت سی چیزیں حواس کے ذریعہ معلوم ہو جاتی ہیں اور بہت سی عقل کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتیں ان کا علم وحی کے ذریعہ عطا کیا جاتا ہے۔ ان تینوں ذرائع میں سے ہر ایک کا مخصوص دائرہ کار اور ایک خاص حد ہے جس سے آگے وہ کام نہیں دیتا۔ چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں، ان کا علم محض عقل سے نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک دیوار کو آنکھ سے دیکھ کر آپ کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس کا رنگ سفید یا سرخ یا سبز ہے۔ لیکن اگر آپ اپنی آنکھ کو بند کر کے صرف عقل کی مدد سے اس دیوار کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو ناممکن ہے۔ اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے ان کا علم صرف حواس کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ آپ صرف آنکھ سے دیکھ کر یا ہاتھ سے چھو کر یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ اس دیوار کو کس انسان نے بنایا ہے بلکہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔ غرض یہ کہ جہاں تک حواس خمسہ کام دیتے ہیں وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی اور جہاں حواس خمسہ جواب دے دیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے۔ لیکن عقل کی رہنمائی بھی ایک حد تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عقل کے ذریعہ۔ مثلاً اسی دیوار کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ اس کو کس طرح استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گا اور کس طرح استعمال کرنے سے ناراض ہو گا، نہ حواس کے ذریعہ ممکن ہے اور نہ ہی عقل کے ذریعہ۔ اس قسم کے سوالات کا جواب انسان کو وحی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ پس حواس ظاہری و عقل کے ذریعہ یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون سے کام پسندیدہ ہیں اور کون سے ناپسندیدہ۔ ان کے معلوم کرنے کے لئے وحی الٰہی کی ضرورت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے کسی برگزیدہ بندے پر نازل فرماتا ہے، جس کو نبی یا رسول یا پیغمبر کہتے ہیں۔

خلافتِ آدم

اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کے لئے کسی کو خلیفہ و نائب بنانے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کی احتیاج سے بے نیاز ہے، لیکن بندے اس قابل نہیں تھے کہ کسی واسطے کے بغیر وہ اللہ تعالیٰ کا فیض حاصل کر سکتے اور اس کے احکامات معلوم کر کے ان پر عمل کرتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بندوں ہی میں سے کچھ بزرگ ہستیوں کو اپنی نبوت و رسالت کے

لئے منتخب فرما کر مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر معبوث فرمایا۔
آیتِ خلافتِ الٰہیہ سے انسان کی فضیلت فرشتوں پر بلکہ تمام مخلوقات پر ثابت ہوتی ہے۔
لیکن اس سے ہر انسان مراد نہیں ہے بلکہ جو انسان اللہ تعالیٰ کی خلافت کا حق ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق علم و عمل سے آراستہ ہو کر دنیا میں امن و امان قائم کرنے اور مخلوق خدا کے حقوق کما حقہ ادا کرنے کا التزام کرتا ہے وہی اس شرافت و فضیلت کا مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت کے لئے اس مشتِ خاک انسان کو منتخب فرمایا کیونکہ اسی کے ضمیر میں اللہ تعالیٰ نے اس بزرگ مذہب کی صلاحیت ودیعت فرمائی تھی۔ اس کی ہستی ہی اس کی سربلندی کا باعث بن گئی۔
خلافتِ الٰہیہ کے مستحق ہونے والے انسان کے لئے صفات و اخلاق الٰہیہ سے متصف ہونا لازمی ہے، تاکہ وہ دوسروں کو ان اخلاق و اوصاف کی تعلیم و تربیت دے سکے۔ جس قدر انبیاء دنیا میں تشریف لائے وہ سب ان اخلاق و اوصاف سے مزین تھے۔

خالق کائنات کا عکس کامل

اخلاق و صفاتِ خداوندی سے متصف ہونے کے بعد انسان میں خالق کائنات کا کامل درجہ کا عکس پایا جاتا ہے اور وہ اپنی اصل کا ایک سایہ سا معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے تو اس کا بندہ بھی شفیق و مہربان ہوتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے تو اس کا بندہ بھی آنکھ اور کان رکھتا اور دیکھتا اور سنتا ہے اور چونکہ وہ عادل ہے تو اس کا بندہ بھی منصف مزاج ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے تو اس کا بندہ بھی وحی الٰہی اور الہام سے ان پوشیدہ باتوں کا علم حاصل کرتا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا نور ہے تو اس کا بندہ اپنے پہلو میں اللہ تعالیٰ کے نور سے آراستہ دل رکھتا ہے جس سے بہت سے سیاہ دل منور ہو جاتے ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ جبار و قہار ہے تو بندہ بھی اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ غیظ و غضب کا اظہار کرتا ہے۔
امانتِ الٰہی کی حفاظت اور خلافتِ الٰہی کے فرائض منصبی کی ادائیگی اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ اس کے خلیفہ کے اندر یہ تمام اخلاق و صفات الٰہیہ پیدا ہو جائیں اور وہ بی یبصر و بی یسمع و بی یبطش و بی یمشی کا مصداق ہو جائے۔ وہ خود بھی قانون خداوندی کی اطاعت کرے اور دوسروں سے بھی اس قانون کی اطاعت کرائے، نہ یہ کہ اپنی اطاعت کرانے لگے۔

بعثتِ انبیاء کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی پیدا کی ہے اس کی نشو و نما اور تحفظ و بقا کے ساز و سامان بھی تخلیق فرمائے ہیں ۔ انسان جو کہ اشرف المخلوقات اور جسم و روح سے مرکب ہے ، اس کے جسمانی نشو و نما اور روحانی ارتقا و بقا کے لئے بھی ہر قسم کی ضروریات پیدا فرمائی ہیں ۔

جب شیطانی و طاغوتی طاقتیں انسان کے روحانی ارتقا کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہیں اور مصیبتیں ہر طرف تباہی و فساد پھیلاتی ہیں ، انسان کی معاشرتی زندگی اجیرن بن جاتی ہے ، معاشی ، اقتصادی ، مادی ، روحانی ہر طرح کا ارتقاء ایک جمود و تعطل کا شکار ہو جاتا ہے تو پروردگار عالم کی رحمت جوش میں آتی ہے اور وہ کسی عظیم انقلابی شخصیت کو بھیجتا ہے جو دنیا میں ایک ایسا ہمہ سمتی انقلاب لاتی ہے جو بیک وقت سماجی اور معاشرتی بھی ہوتا ہے اور اقتصادی اور معاشی بھی ، مادی بھی ہوتا ہے اور روحانی بھی ۔ یہ برگزیدہ ہستی نبی و پیغمبر ہوتی ہے ۔

مقاصد نبوت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک عرب و عجم میں تمام لوگوں کے نبی ہیں ۔ آپؐ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ۔ آپؐ کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آپؐ کی نبوت کے تین مقاصد بیان کئے ہیں ۔

ا.... امت کے سامنے قرآنی آیات کی تلاوت کرنا:

پس قرآنی آیات کو تلاوت کرنا اور پڑھنا ایک مستقل فرض اور ایک علیحدہ مقصد ہے ۔ اور ان آیات کے معانی و مطالب کو سمجھنا ایک الگ فرض و مقصد ہے ۔ جس طرح قرآن مجید کی آیات کے معانی و مطالب کو سمجھنا اور ان میں بتائے ہوئے اعمال و احکام پر عمل پیرا ہونا فرض اور اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے ، اسی طرح اس کے الفاظ کو پڑھنا بھی ایک مستقل عبادت ہے ۔ یہ تلاوتِ انوار و برکات کا موجب اور نجات اخروی کا سرمایہ ہے اور اس کے معانی و مطلب کو سمجھنے ، اس کے حقیقی انوار و برکات کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے ۔

۲.... کتاب و حکمت کی تعلیم:

اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مرضیات پر چلنے اور اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ کاموں سے بچنے کا علم حاصل کرے اور ان احکام پر عمل کر کے اپنے ظاہر کو شریعت کا پابند بنائے۔ لیکن کسی چیز کا علم ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ شخص اس کے مطابق عمل ضرور کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کا نفس جب تک برائیوں سے پاک نہ ہو جائے وہ نیکی کے کاموں میں روکاٹ ڈالتا اور عمل سے روکتا ہے۔

۳.... تزکیہء نفس:

اس کے معنی ظاہری و باطنی نجاست سے پاک کرنا ہے۔ ظاہری نجاست تو عام طور پر لوگ جانتے ہیں اور وہ نجاستِ حکمی یعنی حدثِ اصغر و اکبر اور نجاست حقیقی ہے۔ باطنی نجاست سے مراد کفر و شرک، غیر اللہ پر اعتمادِ کلی، اعتقاداتِ فاسدہ اور تکبر، حسد، بغض، حبِ دنیا، حرص، بخل، عناد، کذب، افترا، غیبت اور چغلخوری وغیرہ خصائل رذیلہ ہیں۔ اگرچہ علمی طور پر کتاب و حکمت یعنی قرآن و سنت میں ان سب چیزوں کا بیان موجود ہے، لیکن تزکیہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا الگ مقصد قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ جس طرح محض الفاظ کے سمجھنے اور کسی زبان کے سیکھ لینے سے کوئی فن حاصل نہیں ہوتا اور اس فن کی کتاب کے معنی کو سمجھ لینا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس شخص کو وہ فن بہ تمام و کمال حاصل ہو گیا ہے، اسی طرح محض نظری و علمی طور پر کوئی فن حاصل ہو جانے سے اس کا استعمال و کمال حاصل نہیں ہوتا، جب تک کہ کسی مربی و استاد کی نگرانی میں اس کی عملی مشق کر کے عادت نہ ڈالی جائے۔ چونکہ تعلیم کا مقصد عمل ہوتا ہے اور عمل وہی درست و قابل ہوتا ہے جس میں اخلاص ہو، اس لئے تعلیم کے ساتھ تزکیہ ہونا ضروری ہے۔

اسوہء انبیاء

اللہ تعالیٰ نے بندوں کی عملی رہنمائی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کمالاتِ ظاہری و باطنی سے اکمل درجے تک مزین فرما کر اس دنیا میں بھیجا تاکہ آپؐ قیامت تک ہر دور کے لئے زندگی کے ہر شعبے کا عملی نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی

زندگیاں خدائے علیم و خبیر کی مرضی میں کامل طور پر ڈھل کر نکلتی ہیں۔ اس لئے ان کی ایک ایک بات ان کا ایک ایک فعل اور ان کی ایک ایک ادا امت کے لئے اسوہ، حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ، حسنہ اکمل و اتم ہے۔ آپؐ نے اس دنیا میں تشریف لا کر اختلافات کو مٹایا، اتفاق و اتحاد اور اخوت کی بنیادیں استوار کیں، عصبیت اور نسل پرستی کے بت کو توڑا، انسانیت کے مسائل زندگی کو حل کیا، کفر و شرک و بدعت کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکال کر نور اور روشنی میں لائے اور انسان کو خالق حقیقی سے ملایا۔

آپؐ نے ایمان، توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، صدقہ، خیرات، ایثار، قربانی، عزم، استقلال، صبر، شکر، سخاوت، شجاعت، عفت، صداقت، حلم، عدالت، تسلیم رضا اور ان کے علاوہ حسن عمل و حسن خلق کی جس قدر تعلیم فرمائی ان سب کے لئے آپؐ نے اپنا نمونہ پیش فرمایا۔

ایمان

لغت کے اعتبار سے ایمان کے معنی تصدیق کے ہیں اور شرعاً اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے جن احکام کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے دل سے ان کی تصدیق اور زبان سے اقرار کرے۔ چونکہ انسان اس تصدیق اور اقرار کے ساتھ دونوں جہان میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مامون ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو ایمان کہتے ہیں۔ اور جس شخص کو یہ تصدیق و اقرار دونوں باتیں حاصل ہو جاتی ہیں وہ مومن کہلاتا ہے۔ اور جو شخص زبان سے تو احکام الہیٰ کا اقرار کرتا ہے لیکن دل سے ان کی تصدیق نہیں کرتا وہ شخص منافق ہے۔ اگرچہ وہ دنیا میں مسلمانوں کے حقوق کا حق دار ہو جاتا ہے اور اسلام کی طرف سے کافروں پر عائد ہونے والے احکام سے بچ جاتا ہے لیکن آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ کے دائمی عذاب سے نجات حاصل نہیں کر سکتا اور جو شخص نہ دل سے ان احکام کی تصدیق کرتا ہے اور نہ زبان سے اقرار کرتا ہے وہ کافر ہے۔ وہ دنیا میں بھی مسلمانوں کے حقوق سے محروم رہتا ہے اور آخرت میں بھی ابدی عذاب میں گرفتار رہے گا۔ وہ خسر الدنیا والاخرۃ کا مصداق ہوتا ہے۔

ایمان کے ثمرات

ایمان اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے جو اس نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے

بندوں کو عنایت فرمائی ہے ۔ہمارے اعمال و افعال کے محرک ہمارے خیالات و جذبات ہیں جن پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں جن کا سرچشمہ دل ہے ۔ دل ایمان کا گھر ہے اور ایمان تمام اعمال کی اساس ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ کا حکم فرمایا ہے اس سے پہلے ایمان لانے کو لازمی قرار دیا ہے ۔

ایمان کی برکتیں اور ثمرات پوری طرح تو آخرت ہی میں حاصل ہوں گے ، کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۔ لیکن اللہ تعالیٰ مومن کو اس دنیا میں بھی ایمان کی برکتوں ، فائدوں اور ثمرات سے محروم نہیں رکھتا۔مومن کے سات حقوق ہیں جن میں سے دو کا تعلق آخرت سے ہے ۔ (۱) مومن دائمی طور پر دوزخ میں نہیں رہے گا ،(۲) اگر اس کی نیکیاں اس کی برائیوں پر غالب ہوئیں تو اس کو اللہ کے فضل و کرم سے بلاحساب جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور اگر اس کی برائیاں نیکیوں پر غالب ہوئیں تو وہ گناہوں کے مطابق سزا بھگت کر یعنی ان برائیوں سے پاک و صاف ہو کر جنت میں جائے گا۔

پانچ حقوق دنیا سے تعلق رکھتے ہیں ۔(۱) شرعی حکم کے علاوہ اس کو قتل نہیں کیا جائے گا (۲) شرعی حکم کے علاوہ اس کو قید نہیں کیا جائے گا ۔ (۳) اس کا مال ناحق نہیں کھایا جائے گا ۔ (۴) اس کو کوئی ایذا نہیں دی جائے گی ۔ (۵) اس پر بدی کا ظن جائز نہ ہو گا جب تک کہ ظاہر نہ ہو جائے ۔

ایمان کی آزمائش

زبان سے اس بات کا اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور بندے ہیں، ایمان کہلاتا ہے ۔ اس اقرار لسانی اور قلبی تصدیق کا نتیجہ یہ ہے کہ اس شخص کا پورا وجود اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور اس کے افکار و احساسات اور عملی زندگی کے تمام پہلو اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے قانون کے تابع ہو جاتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکام کی تعمیل کرنا ،اپنے اوپر لازم جانتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لانے سے اس کی آزمائش شروع ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ایمان میں کتنا صادق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کس قدر فرمانبردار ہے ۔ہر مومن کو اعمال صالحہ کا مکلف ٹھہرا کر آزمائش میں مبتلا کیا گیا ہے اور اعمال صالحہ کو اس کے ایمان کی کسوٹی قرار دیا گیا ہے ۔جس قدر ایمان کامل ہو گا آزمائش بھی اسی قدر زیادہ سخت ہو گی ۔

عبادت

عبادت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی پوری عملی و ذہنی طاقت اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری اور اس کی رضا جوئی میں صرف کرے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے خوف کے پیش نظر اس کی نافرمائی و ناراضگی سے دور رہے اور کسی معمولی سی بات میں بھی اس کے حکم کے خلاف نہ کرے ۔ مختصر یہ کہ اللہ کے اوامر کو بجالائے اور نواہی سے اجتناب کرے ۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو عبد کامل اور مقبول بندہ بناتی ہے ۔ لیکن غافل انسان نے اپنی کم فہمی اور عاقبت نا اندیشی کے باعث اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو یکسر فراموش کر دیا اور ایک خدا کی بندگی کے بجائے بے شمار دیوی دیوتاؤں اور ارباباً من دون اللہ کی غلامی کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھ لیا ۔

تمام آسمانی کتابوں اور انبیاء کرام علیہم السلام کو اس دنیا میں بھیجنے کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ عبادات کے صحیح مقصد کو سمجھیں اور اس بات کی معرفت حاصل کریں کہ اس تمام کائنات کا خالق و مالک اور رب ایک اللہ ہے ، اس کا کوئی شریک نہیں ہے ، ہم سب کو اسی وحدہ لا شریک لہ کی ذات کی عبادت کرنی چاہیئے اور ہر قسم کے جلی و خفی شرک سے ہر وقت اپنے آپ کو دور رکھنا چاہیئے ۔

عقیدہء توحید کی برکات

عقیدہء توحید جو اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے صرف ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ یہ انسان کو صحیح معنیٰ میں انسان بنانے کا واحد ذریعہ ہے ۔ یہ انسان کی تمام مشکلات کا حل اور ہر قسم کے فکر و غم میں اس کا غمگسار ہے ۔

قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں توحید کا یہ بنیادی عقیدہ اور عبادات کا یہ اصلی مقصد اس قدر راسخ تھا کہ کسی قوم کی عددی اکثریت یا مالی و سیاسی قوت ان کے قلوب کو حق کے خلاف نہیں جھکا سکتی تھی ۔ اسی کی بدولت وہ حضرات تھوڑی سی مدت میں تمام دنیا پر چھاگئے اور انہوں نے تمام دنیا سے اپنی قوت و حاکمیت کو تسلیم کرالیا تھا ۔ آج مسلمانوں نے اپنے اسلاف کے طریقے کو چھوڑ دیا اور اسلام کے اس بنیادی عقیدے کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ اس لئے ایک اللہ کے در کو چھوڑ کر دردر کی غلامی ہمارے گلے کا طوق بن گئی ہے ۔ اور ذلت و خواری قدم قدم پر ہمارا

استقبال کرتی ہے ۔آج بھی اگر مسلمانوں میں توحیدِ خداوندی کا عقیدہ صحیح طور پر راسخ ہو جائے اور اس ایک در کے سوا کسی اور در سے کوئی امید وابستہ نہ رکھیں اور اس ایک ذات کے خوف کے سوا ہر خوف کو دل سے نکال دیں تو آج بھی کامیابی ان کے قدم چومے گی اور دنیا و آخرت کی سرخروئی ان کو حاصل ہو جائے گی ۔

نماز کی برکات

نماز وقت کی پابندی کا عادی بناتی ہے ، کیونکہ نماز کے اوقات مقرر ہیں ۔ان اوقات کی پابندی کرنے سے انسان ہر کام میں پابندی، وقت کا عادی ہو جاتا ہے ۔ نماز نظم و نسق اور ڈسپلین کی تعلیم دیتی ہے کیونکہ اس کے لئے کچھ شرائط اور کچھ ارکان ہیں ، جن کی پابندی کرنے سے نمازی میں نظم و ضبط کی عادت پیدا ہو جاتی ہے ۔خاص طور پر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے میں صفوں کی ترتیب اور ان کے سیدھا رکھنے کا اہتمام ہوتا ہے اور سب نمازی ایک ساتھ ارکان کو مل کو ادا کرتے ہیں ۔اس لئے ان میں اطاعتِ امام ، یک جہتی ، یکسانیت وغیرہ اوصاف حمیدہ کی عادت ہو جاتی ہے ۔ امیر و غریب ، گورے کالے ، چھوٹے بڑے بلاامتیاز ایک ساتھ کھڑے ہو کر اور مل کر نماز ادا کرتے ہیں جس سے آپس میں محبت و یگانگت ، ایثار و قربانی اور اتفاق پیدا ہوتا ہے ۔

جمعہ کی فضیلت

آج کل مسلمانوں میں دین کے کاموں میں سستی اور لاپرواہی کی یہ حالت ہے کہ جمعہ جیسے مبارک دن سے بھی ہماری اکثریت بالکل بے نیاز اور اس کی عظمت و اہمیت سے بالکل بے خبر ہے ۔ہمارے اکثر بھائی نمازِ جمعہ کے لئے مسجدوں میں آتے ہی نہیں اور جو آتے ہیں ان میں سے بھی اکثر اس کے لئے اتنا اہتمام نہیں کرتے جتنا کرنا چاہئے ۔حالانکہ حدیثوں میں اس کی فضیلت اور اس کے آداب کا بہت زیادہ ذکر ہے ۔

ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بزرگ دن ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی عظمت عید الفطر اور عید الاضحیٰ سے بھی زیادہ ہے ۔

ابن ماجہ کی ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے

مسلمانو! اس دن کو اللہ تعالیٰ نے عید مقرر فرمایا ہے۔ پس اس دن غسل کرو، جس کے پاس خوشبو ہو وہ خوشبو لگائے، اس دن مسواک کو لازم کرو۔

دعا کی قبولیت

دعا کی قبولیت کا جو وعدہ قرآن کریم اور احادیث میں بیان ہوا ہے اس میں ایک شرط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ گناہ اور قطع رحمی کی دعا نہ ہو۔ اس کے علاوہ بظاہر اور کوئی شرط نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان ہونا بھی قبولیت کی شرط نہیں ہے۔ کافر کی دعا بھی اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے، یہاں تک کہ ابلیس کی دعا قیامت تک زندہ رہنے کی قبول ہو گئی۔ دعا کے لئے نہ وقت کی کوئی شرط ہے اور نہ طہارت اور نہ باوضو ہونا شرط ہے۔

دعا کی قبولیت کی تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ضرور ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ جو مانگا وہی مل گیا۔ اگرچہ بعض دفعہ اس کے ملنے میں مصلحت الہیٰ سے کچھ تاخیر بھی ہو جاتی ہے، دوسرے یہ کہ اس مطلوبہ چیز کے بدلے اسے آخرت کا کوئی اجر و ثواب دے دیا جاتا ہے، تیسرے یہ کہ مانگی ہوئی چیز تو نہ ملی مگر کوئی آفت و مصیبت جو اس پر آنے والی تھی وہ ٹل گئی۔

روزہ کا مقصد

فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی عقل کو اس کے نفس پر ہمیشہ کا غلبہ اور تسلط حاصل رہے، لیکن اکثر اوقات بشری تقاضوں کے باعث اس کا نفس اس کی عقل پر غالب آجاتا ہے، اس لئے اسلام نے نفس کی اصلاح اور پاکیزگی کے لئے روزہ کو فرض فرمایا اور اصول دین میں سے ٹھہرایا کیونکہ زیادہ کھانے پینے اور نفسانی خواہشات میں مبتلا رہنے سے ہوائے نفسانی و شہوانی کو ترقی ہوتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ گناہ، برائی اور بے حیائی ہے۔ اس سے انسان کی دنیا اور آخرت کی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور کم کھانے پینے اور خواہشاتِ نفسانی میں میانہ روی اختیار کرنے سے پرہیز گاری حاصل ہوتی ہے۔

جو شخص بھوک اور پیاس کی مشقت سے واقف نہ ہو وہ رزاق مطلق کی نعمتوں کا شکر حقیقی طور پر ادا نہیں کرسکتا، اگرچہ زبان سے شکر کے الفاظ ادا کرتا رہے۔

ایک جامع عبادت

نماز و روزہ بدنی عبادتیں ہیں اور زکوۃ مالی عبادت ہے اور حج بدنی و مالی دونوں کی جامع عبادت ہے ۔ اس میں اظہار عبودیت اور شکرِ نعمت دونوں کا کامل اظہار ہے ۔ یہ سفر ایک والہانہ سفر ہے ۔ حاجی میں عبودیت کا اظہار نہایت کامل ہوتا ہے، خصوصاً احرام باندھنے کے وقت انتہائی انکسار و تذلل کا اظہار ہوتا ہے ۔ اس کی ہر حرکت و سکون سے عاجزی ظاہر ہوتی ہے ۔ گھر بار، عزیز و اقارب، مال و دولت، آرام و آسائش سب کو چھوڑ کر بحری و بری و ہوائی سفر کی تکالیف کو برداشت کرتا ہوا پراگندہ حال دیارِ محبوب کی طرف دیوانہ وار چلا جاتا ہے ۔ کفن کفایت یعنی ایک تہبند اور ایک چادر پہنتا ہے اور محبوب پر جان دینے کے لئے بیتاب ہے ۔ بال و ناخن بڑھے ہوئے ہیں میل کچیل بدن پر جما ہوا ہے اور زبان پر لبیک لبیک ہے ۔ جب محبوب کے دربار میں پہنچتا ہے تو اس کے در و دیوار کو چومتا، حجر اسود کو بوسہ دیتا ہے ۔ دار محبوب کے گرد گھومتا اور طواف کرتا ہے پھر سجدہ، شکر بجالاتا ہے اور دوگانہ طواف ادا کرتا ہے ۔ اپنی غلامی اور اللہ تعالیٰ کی معبودیت کا اقرار کرتا ہے ۔ اس میں شکر نعمت بھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت کو اس کی اطاعت میں صرف کیا جائے ۔

حج کی اہمیت

اس مبارک سفر میں دینی فائدوں کے ساتھ بے شمار دنیوی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں ۔ لیکن اس سلسلہ میں دو باتوں کا جاننا ضروری ہے ۔

۱ ۔ حج کا سفر دو منظروں کا نمونہ ہے ۔ ایک یہ کہ یہ سفر مرنے کے بعد کا منظر پیش کرتا ہے ۔ جس وقت حاجی اپنے عزیز و اقارب، دوست و احباب، ساز و سامان، گھر اور وطن وغیرہ سب کو چھوڑ کر روانہ ہوتا ہے تو گویا وہ دوسری دنیا کا سفر کر رہا ہے ۔ دوسرا منظر یہ ہے کہ حاجی اپنی روح کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے سرشار کر کے عشق و محبت کا والہانہ اظہار کرتا ہے، اس لئے اس مبارک سفر کا ہر لمحہ اور ہر عمل اسی جذبہ کا آئینہ دار ہونا چاہیئے ۔

۲ ۔ دوسری بات جس کا جاننا ضروری ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر فعل اور ہر حکم میں بے شمار حکمتیں اور لاتعداد فائدے پوشیدہ ہیں جن کو ہر شخص سمجھ نہیں سکتا ۔ لیکن دین کے احکام کی بنیاد

ان حکمتوں اور فائدوں پر نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا زائد انعام ہے۔ اگر یہ حکمتیں اور فائدے بالکل بھی نہ ہوں تب بھی ہمارا فرض ان احکام کو ماننا اور ان پر عمل کرنا ہے۔ اسلام کی جتنی عبادتیں ہیں وہ اپنے اندر دو پہلو رکھتی ہیں ایک اجتماعی یعنی اس میں تمام مسلمانوں کے لئے بہتری و بھلائی اور خیر و برکت ہوتی ہے۔ دوسرا پہلو انفرادی ہے یعنی اس میں ہر مسلمان اپنی انفرادی حیثیت سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ حج میں یہ دونوں پہلو نمایاں طور پر موجود ہیں۔

اسرارِ حج

اللہ تعالیٰ حکیم مطلق ہے۔ اس کے ہر کام میں لاکھوں اسرار و حکمتیں ہیں، جن تک ہر شخص کی عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی اور ان کا احاطہ کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ حج کے افعال میں بھی بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ یہ اسلامی دنیا کے مختلف طبقات میں مساوات پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ مختلف ممالک سے آئے ہوئے حجاج کے درمیان اخوت و محبت کے تعلقات و تعارف اور اتحاد و اتفاق کا رشتہ قائم ہوتا ہے اور ان میں ایک دوسرے کے مسائل کو جاننے اور سمجھنے اور باہمی تعاون و امداد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ تبلیغ اسلام کا نادر موقع فراہم کرتا ہے۔

رہبانیت کا نعم البدل

حج کا ایک سر یہ ہے کہ یہ رہبانیت کا نعم البدل ہے۔ پہلی امتوں میں رہبانیت کو مذہبی حیثیت حاصل تھی، اسلام نے ان کو ناپسند فرما کر ممنوع قرار دیا اور اس کے فوائد حاصل کرنے کے لئے سفرِ حج کو اس کا نعم البدل قرار دیا۔

جزا و سزا

اسلامی نظام حیات چونکہ انسانی دماغوں کی پیدائش نہیں ہے بلکہ رب العالمین کا بھیجا ہوا نظام ہے، اس لئے وہ ہر پہلو سے مکمل بلکہ اکمل ہے اور اس میں تمام انسانی معاملات و تعلقات کا لحاظ کیا گیا ہے۔ یہ نظام عالمگیر ہے اور ہر دور کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قوانین ہر زمانے

اور خطہ کے لئے موزوں اور کارآمد ہیں ۔ اس نظام میں غریب و امیر، مزدور و مالک، محنت کش و سرمایہ دار، گورے اور کالے سب کے حقوق کی حفاظت کی گئی ہے اور جزا و سزا کا ضابطہ بھی سب کے لئے یکساں ہے ۔ اسلام نے دنیا و آخرت میں جزا و سزا کا سب سے مکمل تصور پیش کیا ہے جو وحی الہیٰ سے ثابت اور عقل و سائنس کے عین مطابق ہے ۔ تجربات و مشاہدات سے بھی اس کی پوری طرح تائید ہوتی ہے ۔

انسان کے ظاہری اعمال جو آنکھ، کان، زبان، ہاتھ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک وہ جو اپنے اختیار اور ارادہ سے کئے جاتے ہیں، مثلاً اپنے ارادہ سے بولنا، اپنے ارادہ سے کسی کو مارنا وغیرہ، دوسرے وہ جو بلا ارادہ سرزد ہو جائیں مثلاً زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ اور نکل گیا کچھ اور یا جیسے رعشہ کی بیماری کے سبب بلا اختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی اور اس سے کسی کو تکلیف پہنچ گئی ۔

اسی طرح جو افعال باطن یعنی دل سے تعلق رکھتے ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں ۔ ایک اختیاری جیسے کفر و شرک کا عقیدہ جس کو قصد و اختیار کے ساتھ اپنے دل میں جمایا ہے یا سوچ سمجھ کر اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، تکبر کرنا یا کسی گناہ کا عزم کرنا ۔ دوسری قسم غیر اختیاری افعال کی ہے جیسے مقصد و ارادہ کے بغیر دل میں کسی برے خیال کا آجانا ۔

ظاہری و باطنی دونوں قسم کے اعمال و افعال میں حساب و کتاب اور جزا و سزا صرف اختیاری افعال کے ساتھ مخصوص ہیں ۔ غیر اختیاری امور کا نہ انسان مکلف ہے اور نہ ہی ان پر مؤاخذہ اور ثواب و عذاب ہوتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو پیدا فرماتے وقت طاعت اور گناہ دونوں کا مادہ اور استعداد اس کے اندر پیدا کی ہے ۔ پھر انسان کو اختیار دیا کہ وہ اپنے قصد و اختیار سے خواہ گناہ کا راستہ اختیار کرے یا اطاعت کا ۔ اسی مقصد و اختیار کو عمل میں لانے کے باعث گناہ کا ارتکاب کرنے پر وہ عذاب کا مستحق ہوتا ہے اور طاعت و نیکی کا ارتکاب کرنے سے ثواب کا مستحق ہوتا ہے ۔

رہبانیت

رہبانیت، سخت ریاضات و مجاہدات کرنے اور لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے اور اپنے نفس کو کئی طرح کی مشقتوں میں مبتلا کرنے کو کہتے ہیں ۔ رہبانیت کی

وجہ سے انسان اپنے ہم جنسوں اور اپنے نفس کے حقوق ادا نہیں کر سکتا، اس لئے اسلام نے اس سے بالکل منع فرمادیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نفس اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی پر بہت زور دیا ہے اور عملی طور پر آپؐ نے ایک ایسا جامع و مکمل نمونہ پیش فرمایا ہے کہ اس پر عمل کرنے سے انفرادی و اجتماعی، معاشرتی و عبادتی زندگی بطریق احسن انجام پاتی ہے اور آپؐ کی سنت پر عمل کرنے سے تمام دنیا امن و امان کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ آپ کی سنت کو ترک کرنا اور رہبانیت اختیار کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ناراضگی کا سبب ہے اور اپنے اوپر سختی مسلط کرنا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسا کرنے والا عاجز ہو کر عبادت کو ترک کردے گا اور دنیا و آخرت کے خسارے میں پڑ جائے گا۔ ہم اپنے اوپر غیر شرعی ریاضتوں اور مشقتوں کو مسلط کرکے اللہ تعالیٰ کو نہیں تھکا سکتے، وہ تو بے نیاز ذات ہے۔ بلکہ ہم خود ہی تھک جائیں گے اور عاجز ہو کر بالکل عبادت چھوڑ بیٹھیں گے اور شیطان کے چنگل میں پھنس جائیں گے۔

حقوق العباد

حقوق العباد کا معاملہ بڑا نازک ہے، اس لئے شریعتِ مقدسہ نے اس کی طرف بہت تاکید کے ساتھ توجہ دلائی ہے۔ دنیا میں کوئی شخص اپنا حق کسی کو نہیں بخشتا تو آخرت میں جو کہ نفسی نفسی کا مقام ہے کسی سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنا حق معاف کردے گا اور ہم بندوں کے حقوق ادا کئے بغیر اس ذمہ داری سے بچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جب تک بندہ اپنا حق خود معاف نہ کردے اللہ تعالیٰ بھی اس کو معاف نہیں فرمائے گا اور اس کی نیکیاں صاحبِ حق کو دے دی جائیں گی اور اگر پھر بھی اہل حقوق کے حقوق باقی رہ جائیں گے تو ان کی برائیاں اس کے نامہ اعمال میں شامل کردی جائیں گی اور ان کی وجہ سے اس شخص کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس لئے ابھی سے اسی دنیاوی زندگی ہی میں ہمیں اس کا تدارک کرنا چاہئے، اہل حقوق کے حقوق ادا کرنے چاہئیں، جھوٹی قسموں سے کسی کا حق مارنے سے بچنا چاہئے اور توبہ کرلینی چاہئے۔ اگر اہل حقوق کے حقوق ادا کرنے سے قاصر ہوں تو ان سے معاف کرا لینے چاہئیں۔ جب تک اہل حقوق کے حقوق کی ادائیگی یا ان سے معافی اور اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار نہ کرے گا نجات نہ ہوگی

آج کل معاشرے میں بندوں کے حقوق ادا کرنے کی طرف سے برابر لاپرواہی برتی جارہی ہے، بلکہ ہماری اکثریت دوسروں کے حقوق غصب کرنے کو ہنر سمجھتی ہے جس کا لازمی نتیجہ

پریشانی، تنگدلی، تنگ نظری، افلاس اور خود غرضی وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ ہم سب عاقبت سے بے خبر اور آخرت سے بے نیاز ہیں۔ ماں باپ کی نافرمانی عام ہے، والدین اولاد کی تربیت سے غافل اور ان کے رویے سے بیزار ہیں، بھائی بھائی کا دشمن ہے، پڑوسی پڑوسی سے نالاں ہے، خویش و اقارب سانپ بچھو کی مانند ہو گئے ہیں۔ غرض یہ کہ تمام معاشرہ افراتفری کا شکار ہے اور تمام نظام عالم درہم برہم ہے۔ حالانکہ اسلام نے ہمیں حقوق العباد کی ادائیگی کی نہایت تاکید کے ساتھ تعلیم دی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے ساتھ ان حقوق کی ادائیگی پر بھی زور دیا ہے اور اس سلسلہ میں ایک ایسا منظم اور مربوط نظام ہمیں دیا ہے جس پر چل کر ہماری زندگی نہایت خوشگوار بن سکتی ہے اور آخرت بھی سنور سکتی ہے۔

حقوق العباد کے بہت سے شعبے ہیں۔ مثلاً والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، خاوند بیوی کے حقوق، رشتہ داروں، ہمسایوں، خادموں، یتیموں، مزدوروں، اہل شہر اور اہل ملک وغیرہ کے حقوق۔ لیکن ان سب میں والدین کے حقوق کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کے بعد یعنی مخلوق کے حقوق میں سب سے اعلیٰ درجہ والدین کے حقوق کا ہے۔

والدین کے حقوق

عبادت کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔ اس کو حقوق اللہ اور حقوق العباد میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ حقوق اللہ میں نماز، روزہ وغیرہ عبادات شامل ہیں کیونکہ یہ عبادات کسی اور کی شرکت کے بغیر خالص طور پر اللہ تعالیٰ کے لئے کی جاتی ہے۔ حقوق العباد میں معاملات یعنی بیع و شرا، نکاح و طلاق اور جملہ لین دین کے معاملات اور اخلاق حسنہ شامل ہیں۔ ان کا تعلق بندوں اور خلق خدا سے ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق طے کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت ان کو بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیتے ہوئے حقوق العباد کے ادا کرنے کی بھی نہایت تاکید فرمائی ہے۔

ظاہری اسباب کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے بعد انسان پر سب سے زیادہ احسانات اس کے والدین کے ہیں، کیونکہ عالم اسباب میں وہی اس کے وجود کا ظاہری سبب ہیں اور پیدائش سے لے کر اس کے جوان اور خود مختار ہونے تک جتنے دشوار مرحلے ہیں ان سب میں ظاہری اسباب کے طور پر اس کے ماں باپ ہی اس کے وجود اور اس کے بقا و ارتقاء کے ضامن ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید میں

متعدد جگہ ماں باپ کے حقوق کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے متصل ہی بیان فرمایا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرح والدین کا شکر گزار ہونا بھی واجب ہے۔ قرآن کریم نے متعدد جگہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا جو حکم دیا ہے اس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ حسب ضرورت ان کے نفقہ میں اپنا مال خرچ کیا جائے، ضرورت کے وقت ان کی جسمانی خدمت کی جائے، ان کے ساتھ گفتگو کرنے میں سخت آواز سے یا بہت زور سے نہ بولا جائے کہ جس سے ان کی بے ادبی ہو، کوئی حکم ایسا نہ کیا جائے جس سے ان کی دل شکنی ہو، ان کے دوستوں اور تعلق والوں سے بھی کوئی ایسا سلوک نہ کیا جائے جس سے والدین کی دل آزاری ہو، بلکہ ان کو آرام پہنچانے اور خوش رکھنے کے لئے جو صورتیں اختیار کرنی پڑیں وہ سب اختیار کی جائیں یہاں تک کہ اگر ماں باپ نے اولاد کے حقوق میں کوتاہی کی ہو تب بھی اولاد کے لئے ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

والدین کی خدمت اور اچھے سلوک کے لئے ان کا مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ اگر اولاد مسلمان ہو گئی اور ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک کافر ہی رہا تب بھی ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ لیکن ناجائز کاموں میں والدین اور کسی بھی مخلوق کی اطاعت نہیں کرنی چاہیئے۔ علماء و فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ والدین کی اطاعت صرف جائز کاموں میں واجب ہے، ناجائز یا گناہ کے کاموں میں ان کی اطاعت جائز نہیں۔ ضروری علم دین حاصل کرنے کے بعد مکمل علم دین حاصل کرنے کے لئے اور تبلیغ دین کے لئے سفر کرنا بھی والدین کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔

ایام جاہلیت میں عرب کی حالت

اسلام سے قبل عورتوں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ ایام جاہلیت میں عورت کو جانور سے بدتر سمجھا جاتا تھا اور اس کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا جاتا تھا اگر اس کا تصور بھی کیا جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قدیم زمانے میں مال و اسباب اور چوپایوں کی طرح عورتوں کی خریداری ہوتی تھی۔ انہیں کسی چیز کی ملکیت کا حق حاصل نہ تھا۔ ان کی حیثیت کنیزوں اور باندیوں کی سی تھی۔ حتیٰ کہ شوہر کے مرنے کے بعد وہ بھی میراث میں وارثوں کے حصہ میں آتی تھی سب سے عجیب بات یہ تھی کہ عورت کو نجس، حیوان اور ذلیل مخلوق سمجھا جاتا تھا اور بعض قبائل میں تو لڑکی پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دی جاتی تھی۔ بعض مذاہب میں اسے جنت میں

داخل ہونے کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔ بعض مذاہب میں اس کو تعلیم سے بے بہرہ رکھا جاتا تھا۔ بعض قومیں عورتوں کو جانوروں کی طرح مقید رکھتی تھی۔ بعض قوموں میں باپ بیٹی کو فروخت کر سکتا تھا۔ غرض یہ کہ اس دور میں عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔

عورت کے حقوق

اسلام نے عورتوں کو ایسے مساوی حقوق عطا فرمائے جو کسی مذہب اور کسی قوم نے نہیں دیئے تھے۔ قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ میں مرد و عورت کے حقوق پر کثرت سے احکام وارد ہوئے ہیں اور تمام احکام میں مرد و زن کو یکساں طور پر مخاطب فرمایا ہے اور چند احکام و فرائض کے سوا جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور کسی حکم میں مرد و عورت میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔

بعض قوموں اور مذاہب کا عورتوں کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ عورتوں کا دین و ایمان صحیح نہیں ہوتا اور ان کی روحیں فانی ہوتی ہیں۔ مرنے کے بعد وہ بالکل نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ اس لئے وہ مومنوں کے ساتھ بہشت میں داخل نہیں ہوں گی۔ قرآن کریم نے ان کے اس نظریئے کی تردید فرماتے ہوئے عورتوں کو بھی مردوں کی طرح نیک کام کر کے جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو عورت کی تین نمایاں حیثیتیں سامنے آتی ہیں۔ عورت یا تو ماں ہے یا بیوی یا بیٹی۔ اسلام نے اس کی ہر حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے حقوق کی حفاظت فرمائی ہے۔ چنانچہ ماں کی حیثیت سے اس کو سب سے بڑا مقام دیا ہے اور ماں کا حق باپ سے فائق قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے، یعنی ماں کی خدمت و اطاعت سے جنت ملے گی۔

زوجین کے حقوق

قرآن کریم نے زوجین کے تعلقات کو اجتماعی زندگی کے لئے بنیادی اہمیت دی ہے اور ان تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فوقیت دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ اس لئے ہے کہ گھر میں ایک فرد سردار اور ذمہ دار ہو، اس کی صوابدید سے گھر کا نظم و نسق قائم رہے اور اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں۔ مرد کو بیوی بچوں کے نان و نفقہ کا ذمہ دار

ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ فضیلت مرد کو صرف گھریلو انتظام چلانے کے لئے دنیا میں دی گئی ہے۔ آخرت میں تو خواہ مرد ہو یا عورت اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو زیادہ متقی و پرہیزگار ہے۔

قرآن کریم نے جس طرح عورتوں کو مردوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے، اطاعت گزار رہنے، امانت کی حفاظت کرنے، تعلقات کو اچھی طرح نباہنے وغیرہ امور کی ہدایت کی ہے، اسی طرح مردوں کو بھی عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے، آپس میں صلح کے ساتھ رہنے، تحمل اور حسن ظن سے کام لینے، عفو و درگذر کی روش اختیار کرنے وغیرہ امور کی تاکید فرمائی ہے۔ میراث میں عورتوں کا حصہ مقرر فرمایا ہے، جس سے عورتوں کو ہمیشہ محروم رکھا جاتا تھا۔

عورت کی ایک حیثیت بیٹی کی ہے۔ قرآن مجید نے جس طرح اولاد پر والدین کے حقوق کا اظہار فرمایا ہے اسی طرح والدین پر بھی اولاد کے حقوق مقرر فرمائے ہیں، جن کے ادا کئے بغیر ایسا معاشرہ ہرگز وجود میں نہیں آسکتا جس سے فلاح و بہبود کی توقع کی جاسکے۔ لڑکوں کے حقوق کے ساتھ لڑکیوں کے حقوق بھی مقرر فرمائے اور ان کو معاشرہ میں عزت کا مقام بخشا۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا علم حاصل کرنا ضروری قرار دیا۔ بیٹی کی پیدائش کو نیک فال قرار دیا۔

غرض یہ کہ اسلام نے جور و ستم کی چکی میں پسنے والی اس صنفِ نازک کو پوری قوت کے ساتھ اپنی حمایت میں لیا، اس کی ناموس کی قدر و قیمت کو زندہ کیا، ان کے حق میں بدکاری کے جتنے سرچشمے تھے ان سب کو بند کیا، ازدواجی زندگی کے آئین و قوانین کی تعلیم دے کر جنسی زندگی میں اعتدال و اخلاق کا پابند بنایا اور عورت کو بجائے لعنت کے رحمت و سکینت کا مظہر ٹھہرایا۔

ہمسائے کے حقوق

ہمسایہ کا ایک حق محض انسان ہونے کی حیثیت سے ہے اگرچہ وہ اس کا ہم مذہب و ہم خیال نہ بھی ہو اور اگرچہ وہ اس سے اور کوئی قرابت نہ رکھتا ہو، اس کے بعد جس قدر قرابتیں زیادہ ہوتی جائیں گی اسی قدر اس کا حق دوسرے سے فائق ہوتا جائے گا اور جس قدر ہمسائیگی یا قرابت وغیرہ میں دوری ہوتی جائے گی اس کا حق اسی قدر مؤخر ہوتا جائے گا۔

ہمسایوں کے حقوق کئی طرح کے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کے ساتھ احسان کرے، اس کے بیوی بچوں کی آبرو کی حفاظت کرے، کبھی کبھی اس کے گھر تحفہ وغیرہ بھیجتا رہے۔ خاص طور پر جب کسی کا پڑوسی اتنا غریب ہو کہ فاقہ تک نوبت پہنچ جاتی ہو تو اس کو کچھ نہ کچھ کھانا ضرور دیا کرے

اس کو تکلیف نہ دے، معمولی معمولی باتوں میں اس سے رنج و تکرار نہ کرے۔ غیر مسلم ہمسایہ کے بھی حقوق ہیں۔ مثلاً بلا قصور کسی کو جان و مال کی تکلیف نہ دے، کسی شرعی وجہ کے بغیر اس کے ساتھ سخت زبان استعمال نہ کرے، اگر کسی کو مصیبت یا فاقہ یا بیماری میں مبتلا دیکھے تو اس کی مدد کرے، کھانا، پانی دے دے، علاج معالجہ کرادے اور جس صورت میں شریعت نے سزا کی اجازت دی ہو اس میں بھی ظلم و زیادتی نہ کرے۔ جس طرح شہر و بستی میں ہمسایہ ہوتا ہے، اسی طرح سفر میں بھی ہوتا ہے۔ یعنی سفر میں روانہ ہوتے ہی جو اس کا رفیق سفر ہوا ہو یا راستے میں اتفاقاً اس کا ساتھ ہو گیا ہو تو اس کے حقوق بھی آبادی کے ہمسایہ کی طرح ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دے، ریل گاڑی یا موٹر وغیرہ پر سوار ہوتے وقت اس کو آرام پہنچائے وغیرہ۔

بعض ہمسائے محتاج ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ توجہ کے مستحق ہوتے ہیں، جیسے یتیم، بیوہ، عاجز، ضعیف، مسکین، بیمار، اپاہج وغیرہ ان کے اور بھی زائد حقوق ہیں۔ وہ یہ کہ مال سے ان کی خدمت کرے، اپنے ہاتھ پاؤں سے ان کا کام کر دیا کرے۔ ان کی دلجوئی اور تسلی کرتا رہے اور جہاں تک ہو سکے ان کی حاجت اور سوال کو رد نہ کرے۔ اگر ان اہل حقوق کے کسی حق کی ادائیگی میں کچھ کمی ہو گئی ہو تو اس کو پورا کرے یا ان سے معاف کرائے اور آئندہ اس بات کا خیال رکھا کرے کہ کوئی کوتاہی نہ ہونے پائے اور ہمیشہ ان کے حق میں دعائے خیر کرتا رہے۔

اگر اس کے پڑوسی کی طرف سے کوئی زیادتی ہوئی ہو یا حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہو گئی ہو تو اس کو معاف کر دیا کرے، اس میں بہت ثواب ہے۔ خاص کر جب کوئی شخص منت سماجت کر کے معافی چاہے تو معاف کر دینے میں بہت ہی ثواب ہے۔

اولاد کی تعلیم و تربیت

نیک اولاد دین و دنیا کا بہترین سرمایہ اور آخرت کا بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ نوجوان نسل مذہب و ملت اور ملک و قوم کی تقدیر ہوتی ہے۔ مستقبل میں معاشی و معاشرتی، سیاسی و اخلاقی ہر قسم کا بوجھ ان کے کاندھوں پر پڑتا ہے۔ اگر ان کی تعلیم و تربیت صحیح بنیادوں پر ہو گی تو ملک و قوم کی ترقی کا کارواں صحیح سمت کی جانب گامزن رہے گا اور ان کی تعلیم و تربیت سے غفلت برتی گئی یا غلط بنیادوں پر کی گئی تو یہ ملک و قوم کی بدقسمتی ہو گی اور کوئی طاقت ان کو تباہی سے نہیں بچا سکے گی۔ اس لئے شریعتِ مقدسہ نے اولاد کی اخلاقی و مذہبی، دینی و دنیوی ہر قسم کی تعلیم و تربیت

کا صحیح اور اعلیٰ انتظام کرنا ماں باپ کی ذمہ داری قرار دیا ہے اور ہر صاحبِ خانہ پر اس کی اولاد کی تربیت کا فرض عائد کیا ہے ۔ تاکہ جب سب لوگ اپنے اس فرض کو ادا کریں تو اس کے انفرادی و اجتماعی فوائد ظاہر ہوں کیونکہ افراد ہی کے ذریعہ اجتماعی زندگی کا ظہور ہوتا ہے ۔

بہترین عطیہء الٰہی

افراد کی صحیح تربیت ہی سے اصلاح و ترقی کی سمت راستہ کھلتا ہے ۔ بچپن میں جس قسم کی تربیت ہو جاتی ہے بڑا ہو کر بھی آدمی اس پر قائم رہتا ہے ۔ جو شخص جس روش پر جوان ہوتا ہے اسی روش پر بڑھاپے تک قائم رہتا ہے ۔ اگر اولاد کو بچپن ہی میں غلط راستہ پر ڈال دیا تو جوان ہو کر بھی وہ اسی غلط روش پر قائم رہے گی اور بڑھاپے تک اسی پر قائم رہے گی ، اب اس کو راہِ راست پر لانا نہایت کوشش کے باوجود دشوار ہو گا اور سوائے تباہی و بربادی کے ان سے کسی خیر کی امید نہیں ہو سکے گی ۔ جب کسی عمارت کی بنیاد ٹیڑھی رکھی گئی ہو تو بلندی پر پہنچنے تک وہ سیدھی ہونے کی بجائے اور بھی زیادہ ٹیڑھی ہوتی جائے گی ۔ اب اس کا سیدھا ہونا ناممکن ہو گا ۔ اگر سیدھا کریں گے تو گر جائے گی اور اگر ٹیڑھا رہنے دیں گے تو اس سے ہر وقت نقصان کا اندیشہ رہے گا ۔ درخت کی نرم شاخ کو جس طرح چاہیں موڑ سکتے ہیں ، لیکن جب وہ شاخ بڑی ہو کر سخت اور خشک ہو جاتی ہے تو اس کو موڑنا دشوار ہو جاتا ہے بلکہ اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ۔ اگر اس کو گرم کر کے موڑیں گے تب بھی وہ اتنی سہولت سے اور اتنی صحیح نہیں مڑے گی جتنی کہ نرم اور تازی شاخ مڑتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کی اچھی تربیت کو بہترین عطیہء الٰہی فرمایا ہے ۔

صدقہء جاریہ

اولاد کی تربیت کرنا صدقہ اور عبادت ہے بلکہ یہ ایسی عبادت ہے جس کا ثواب مرنے کے بعد بھی اس شخص کو ملتا رہے گا ، یعنی یہ صدقہ جاریہ ہے ۔

اولاد سے محبت ہونا ایک فطری امر ہے اور یہ اسی محبت کا تقاضا ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کی بہتری کے لئے ہر قسم کی کوشش کرتے ہیں ۔ ان کو اچھا کھلاتے پلاتے اور پہناتے ہیں ، ان کی صحت کا خیال رکھتے ہیں ، کسی قسم کے خرچ سے دریغ نہیں کرتے ، دن رات بے آرام رہتے ہیں

اور اولاد کے لئے مال و دولت جمع کرتے ہیں۔ لیکن اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اولاد کی اخلاقی تعلیم و تربیت سے بالکل غفلت برتی جاتی ہے، ان کو بے راہ روی سے نہیں روکا جاتا۔ مذہبی تعلیم سے بھی لاپرواہی کی جاتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بچے بڑے ہو کر غلط ماحول میں چلے جاتے ہیں، ان کی اخلاقی حالت نہایت پست ہو جاتی ہے۔ ایسی اولاد معاشرے کے لئے عذاب بن جاتی ہے اور خود ماں باپ کی زندگی اجیرن بنا دیتی ہے۔ اس وقت معاملہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے اور اصلاح کی کوئی صورت نہیں بنتی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اولاد کے لئے ماں باپ کی طرف سے اس سے بہتر عطیہ اور گراں قدر تحفہ اور کوئی نہیں کہ ان کی صحیح اور اچھی تربیت کی جائے اور ان کو اچھا ادب سکھایا جائے۔ اس کا براہِ راست اثر بھی ماں باپ ہی پر پڑتا ہے کیونکہ اچھی تربیت سے آراستہ نیک اولاد بھی ماں باپ کی راحت و خوشی کا ذریعہ بنتی ہے، معاشرے میں عزت کا مقام حاصل ہوتا ہے اور ان کی شخصیت معتبر ہو جاتی ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی ایسے والدین کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔

صدقہ و خیرات

اپنی ضروریات سے زائد مال کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ضرورت مند اور مفلس لوگوں پر خرچ کرنے کو صدقہ کہتے ہیں اور اردو زبان کے محاورے میں اس کو خیرات بھی کہتے ہیں اور صدقہ وخیرات اکٹھا بھی بولتے ہیں۔ جو لوگ صاحبِ نصاب ہوں ان پر اپنے مال کا چالیسواں حصہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں محتاجوں اور مسکینوں کو دینا فرض ہے، اس کو مال کی زکوۃ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو زائد مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے وہ صدقہ و خیرات کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے مال بڑھتا ہے، اگرچہ ظاہری نظر سے وہ رقم مال میں سے کم ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ ضرورت مندوں کو رقم دے کر اس پر سود لیتے ہیں وہ رقم اللہ تعالیٰ کے نزدیک خسارے میں جاتی ہے، اگرچہ بظاہر وہ سود کے ذریعہ سے بڑھتی رہتی ہے۔ سود سے حاصل کیا ہوا مال کبھی تو دنیا ہی میں برباد ہو جاتا ہے ورنہ آخرت میں تو وہ یقیناً برباد ہے اور اس کی وجہ سے اس شخص پر عذاب ہوتا۔ اس کے برعکس صدقہ دینے میں گو مال گھٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن انجام کار اللہ تعالیٰ اس کو بڑھاتا ہے۔ کبھی تو دنیا میں بھی بڑھا دیتا ہے اور آخرت میں تو وہ یقینی طور پر بڑھتا ہے اور اس کا ثواب سات سو گنا تک ہو جاتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ جتنا

اللہ تعالیٰ چاہے بڑھ جاتا ہے۔

حدیث شریف میں صدقہ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ جو شخص حلال ذریعہ سے روزی کما کر خود کھاتا ہے اور اپنے اہل و عیال کو کھلاتا ہے وہ بھی صدقہ یعنی نیکی ہے اور وہ شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر اجر و ثواب پائے گا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو کھانا تم کھاتے ہو وہ تمہارے لئے صدقہ ہے اور جو تم اپنی اولاد کو کھلاتے ہو وہ تمہارے لئے صدقہ ہے اور جو تم اپنی بیوی کو کھلاتے ہو وہ تمہارے لئے صدقہ ہے اور جو تم اپنے خادم کو کھلاتے ہو وہ تمہارے لئے صدقہ ہے۔

حفاظتِ قرآن

قرآن مجید پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم پر عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس نے اپنے سے پہلے کے تمام صحیفوں اور کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ جو کچھ اس میں ہے وہ سب حق ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔ یہ آخری کتاب ہے اور قیامت تک ہر قسم کے رد و بدل سے محفوظ ہے۔ اس سے پہلی کتابیں اور صحیفے ایک مخصوص زمانے کے لئے ہوتے تھے، اس لئے ان کی حفاظت اسی وقت تک کے لئے فرمائی گئی۔ قرآن مجید قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے ضابطہ حیات ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی دائمی حفاظت اپنے ذمہ لے لی اور فرمایا: انانحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ○ (الحجر آیت ۹) اس ذکر کو ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے قیام قیامت تک آنے والی تمام اولاد آدم کے لئے یہ دستور العمل ہے۔ یہ تمام آسمانی کتابوں سے افضل ہے یعنی اس کا ثواب اور اس کا مفید ہونا سب سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ظاہری و معنوی رد و بدل سے محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ ہر دور میں اس کے ہزاروں لاکھوں حافظ اور اس کے معانی و تفاسیر جاننے والے لوگ موجود رہے ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گے۔ دوسری آسمانی کتابیں اور صحیفے جن زبانوں میں نازل ہوئے وہ زبانیں دنیا سے ناپید ہو گئیں لیکن قرآن مجید کی زبان جو کہ عربی ہے، ہمیشہ رائج رہے گی۔

کتابِ حکمت

اللہ تعالیٰ حکیم مطلق ہے اس لئے اس کا کلام یعنی قرآن بھی کتاب حکمت ہے ۔ اس کے الفاظ و معانی و حروف ہی نہیں بلکہ اس کا ہر نقطہ اور شوشہ وغیرہ بھی حکمت سے پر ہے۔ قیامت تک اس کے احکام کو باقی رہنا اور مخلوق خدا کی رہنمائی کرنا ہے ۔ اس لئے اس کی حکمتیں اور اس کے عجائبات کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب جس طرح آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے دنیا کی رہنمائی کے لئے تمام صفات اور صلاحیتوں کی جامع تھی ، اسی طرح آج بھی ہے اور اسی طرح قیامت تک رہے گی ۔ قوموں کے بعد قومیں دنیا میں آتی رہیں گی ان میں سے جو قوم یا فرد بھی اس کی طرف رجوع کرے گا وہ اپنے اپنے ظرف کے مطابق حصہ پالے گا اور سب کے حصہ پالینے کے بعد بھی اس کے ذخیرہ حکمت میں کوئی کمی نہیں آئے گی ۔

قرآن کی جامعیت

مختصر ضخامت کے باوجود اس کے علوم اور حکمتوں کی وسعت و کثرت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے اور یہ ایسے بلند پایہ علوم و معارف کا بے مثال خزانہ ہے کہ انسانی عقلیں اور کسب و اکتساب کے آلات ان کے احاطہ اور ادراک سے عاجز ہیں ۔ یہ ہدایت کی جامع کتاب اور نظام زندگی کا مکمل لائحہ عمل ہے ۔ اس کی جامعیت اس اعتبار سے مسلم ہے کہ اس میں ہدایت کا ہر جامع عنوان پایا جاتا ہے ۔ ہدایت کے جو امہات و اصول ہو سکتے ہیں وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں ۔ اخلاق و تقویٰ کی مکمل ترین تعلیم اس مقدس صحیفے میں ملتی ہے ۔ اساسی ، اخلاقی ، سیاسی ، معاشی ، معاشرتی غرض یہ کہ یہ ہر قسم کی بنیادی و اصولی تعلیمات کا جامع ہے ۔ تجارت ، معاشرت ، عائلی زندگی ، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ کے اصول و قوانین کی تعلیم بھی دیتا ہے ۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت

اہل عرب کو اپنی زبان دانی ، شاعری اور فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا ۔ وہ اپنے علاوہ تمام دنیا کے لوگوں کو عجمی (گونگا) کہتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید جیسی معجز نظام کتاب عطا فرمائی جس نے تمام عربوں کو چیلنج کیا کہ تم اس کی

مثل ایک چھوٹی سی سورت بلکہ ایک آیت ہی تصنیف کر کے پیش کر دو، ایک آدمی نہیں بلکہ اگر سب مل کر کوشش کرو گے تب بھی اس کی مثل بنانے سے عاجز رہو گے۔ ان کے لئے یہ بہت بڑا چیلنج تھا، لیکن وہ سب مل کر بھی اس چیلنج کا جواب دینے سے عاجز رہے اور قیامت تک عاجز رہیں گے اور ان کو دائمی طور پر اس سے سکوت اختیار کرنا پڑا۔

قرآنی اسلوب

قرآن مجید عربی ادب کا بہترین شاہکار اور کامل ترین معیار ہے۔ اس مقدس کتاب کو نازل ہوئے تقریباً چودہ صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن اس کے بیان کی تر و تازگی، الفاظ و معانی کی صدا بہاری آج تک قائم ہے اور قیامت تک اسی طرح قائم رہے گی۔ دنیائے ادب میں آج تک جتنی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئی ہیں، ان کے الفاظ، محاورے اور اصطلاحیں بہت حد تک متروک ہوتے رہے، اور ان میں فرسودگی و عدم پذیرائی پیدا ہوتی گئی اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ لیکن قرآن مجید ہی ایسی مقدس و مقبول کتاب ہے جس کا ایک لفظ بلکہ ایک شوشہ بھی اس طویل مدت میں متروک و نامقبول نہیں ہوا، اس گلدستہ رسالت کا ایک پتہ بھی خزاں رسیدہ نہیں ہوا اور قیامت تک یہ اسی طرح سرسبز و شاداب رہے گا۔ اس کی ایک آیت یا ایک لفظ کو بھی خواہ کتنی ہی بار دہرایا جائے، طبیعت کو سیری اور وجدان کو بے اعتنائی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے اسلوب بیان میں ایسی حلاوت و دلنشینی ہے کہ اسے پڑھتے وقت انسان پر سوز و گداز اور رقت و وارفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو لوگ اس کے معانی و مطالب کو سمجھے بغیر پڑھتے ہیں وہ بھی اس کی نثر کے حسن، عبارت کی موزونیت، الفاظ کی بندش اور آواز کی نغمگی میں ڈوب کر بے اختیار اور از خود رفتہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے الفاظ و عبارات بے تکلف زبان پر جاری اور ذہن میں جاگزیں ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ چھوٹی عمر کے بچے قرآن مجید کے حافظ ہو جاتے ہیں۔ یہ اس کتاب کا معجزہ بھی ہے اور اس کے اسلوب بیان کی خوبی بھی۔ قرآن مجید صنعت لف و نشر مرتب کا بہترین مرقع ہے۔ قرآن پاک نے اپنی تعلیمات و پیغامات کو سمجھانے کے لئے جس طرح دوسرے بہت سے دلائل بیان فرمائے ہیں اسی طرح تشبیہات و تمثیلات اور قصص کے ذریعہ بھی لوگوں کے ذہنوں کو حق کی طرف مائل کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

قرآنی علوم کی ہمہ گیری

قرآن کریم پوری انسانیت کے لئے دعوت اور قیامت تک کے لئے نور و ہدایت ہے ۔ اس مقدس کتاب میں زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق بنیادی حقائق بیان کئے گئے ہیں اور تہذیب کی ہر فرع کے بارے میں نہایت معتدل قوانین وضوابط پیش کئے گئے ہیں ۔ قرآن مجید جس طرح نجاتِ ابدی کی اساسی تعلیمات ایمان و توحید، رسالت و یوم آخرت، قدر و خیر و شر اور عبادات یعنی نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور جہاد وغیرہ کی مفصل تعلیمات کو مختلف پیرائے سے ذہن نشین کرتا اور ان کے متعلق اعتقادِ راسخ، دلوں میں بٹھا دیتا ہے، اسی طرح اخلاقی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی تعلیمات کو بھی نہایت دلکش اور دلنشیں پیرائے میں بیان فرما کر زندگی کے ان تمام شعبوں کے متعلق سیر حاصل تفصیلات، بنیادی اصول اور ان پر مرتب ہونے والی فروعات کو واضح فرماتا ہے ۔

تلاوتِ قرآن کا ثواب

قرآن مجید کی تلاوت کا بہت بڑا درجہ ہے ۔ اس کے ہر حرف کے پڑھنے پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح فرمایا ہے اور مثال دے کر سمجھایا ہے کہ اگر کسی نے الم پڑھا تو یہ ایک حرف نہیں ہے بلکہ تین حروف ہیں اور اس کو تیس نیکیوں کا ثواب ملے گا ۔ الم کی مثال دے کر آپ نے یہ اشارہ فرمادیا کہ بے سمجھے پڑھنے پر اتنا ثواب ملے گا کیونکہ تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حروف مقطعات الم وغیرہ کے معنی کا صحیح علم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہے ۔ جب بے سمجھے پڑھنے پر اس قدر ثواب ملے گا تو سمجھ کر پڑھنے والے کا ثواب اس سے کئی گناہ زیادہ ہو گا ۔

قرآنی علوم کی وسعت

قرآنی علوم کی وسعت و کثرت کی کوئی حد و انتہا نہیں اور ہماری زندگی کا کوئی گوشہ اس کی رہنمائی سے محروم و تشنہ نہیں ۔ عقائد ہوں یا معاملات و عبادات، قرآن مجید ہماری پوری پوری رہنمائی فرماتا ہے ۔ اگر روئے زمین کے کل درخت قلم ہو جائیں اور سمندر اس کی روشنائی ہو جائیں

اس حال میں کہ اس کے بعد اس میں سیاہی کے سات سمندر اور اضافہ کر دیں تب بھی قرآن مجید کے علوم و معارف اور حکمتیں ختم نہ ہوں گی۔ قرآن کریم کا کلام الہیٰ ہونا ہی ہر کلام سے افضل و اکمل اور جامع و مانع ہونے کی دلیل ہے۔

قرآنی تعلیمات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ہیں اور قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اولین و آخرین کے تمام علوم کو جمع کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ اس کتاب میں تم سے پہلے لوگوں کے بھی احوال ہیں اور بعد والوں کے بھی اور جو واقعات و مسائل تمہارے درمیان پیش آئیں ان کا فیصلہ بھی اسی کتاب میں ہے۔ جس طرح آپؐ کی نبوت تمام انبیاء سابقین کے کمالاتِ نبوت کی جامع ہے، اسی طرح آپؐ پر نازل کی ہوئی کتاب قرآن حکیم بھی تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے علوم کا جامع ہے۔

فضیلت کا قرآنی معیار

یہ ایک فطری امر ہے کہ ہر شخص فضیلت اور بڑائی کا طالب رہتا ہے۔ لیکن فضیلت کا معیار لوگوں کے نزدیک مختلف ہے۔ کوئی مال و دولت کی کثرت کو وجہ فضیلت قرار دیتا ہے تو کوئی حسن و جمال کو معیار فضیلت بتاتا ہے، کسی کے نزدیک علم میں زیادتی دلیل فضیلت ہے تو کسی کے نزدیک جاہ و مرتبت باعثِ فضیلت ہے۔ لیکن انسانوں کا مقرر کیا ہوا معیار فضیلت حقیقت میں معیار فضیلت نہیں ہے بلکہ انسانیت کا زیور اور معیار فضیلت کوئی اور ہی چیز ہے اور قرآن کریم کی رو سے وہ تقویٰ ہے۔ جو شخص جس قدر متقی و پرہیزگار ہو گا وہ اسی قدر فضیلت کا حامل ہو گا

فضیلت کا حصول

اس فضیلت کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے نفس کی اصلاح کی جائے کیونکہ جب تک نفس کی برائیاں دور نہ ہو جائیں پوری طرح تقویٰ حاصل نہیں ہوتا اور نفس کی اصلاح جسم کی اصلاح سے ہوتی ہے کیونکہ اعمال ظاہرہ کا صدور جسم سے ہوتا ہے اور ان اعمال کا اثر اعمال باطنہ

پر پڑتا ہے جو کہ نفس سے تعلق رکھتے ہیں اور جسم کی اصلاح دل کی اصلاح پر موقوف ہے اور دل کی اصلاح اور صفائی اللہ کے ذکر سے ہوتی ہے۔ جب دل یادِ خدا میں فنا ہو جاتا ہے تو تمام شریعت کا فرمانبردار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کو فنائے نفس حاصل ہو جاتی ہے اور نفس مطمئنہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو خوشی سے قبول کر لیتا ہے اور یہ بات بزرگوں کی محبت اور تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔

امانت و عہد کی پابندی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امانت داری اور عہد کی پاسداری کے لئے بہت تاکید فرمایا کرتے تھے، کیونکہ دونوں امور معاشرہ کی اصلاح اور باہمی اتحاد و اتفاق کے لئے بنیادی اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امانت داری اور عہد کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے انفرادی و اجتماعی برائیاں جنم لیتی ہیں اور معاشرہ کو گھن کی طرح کمزور و تباہ کر دیتی ہیں۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایمان و دین کی تکمیل کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ امانت میں خیانت کرنے کو منافقت کی علامت فرمایا ہے اور خیانت سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی ہے اور یہاں تک فرمایا کہ دھاگا اور سوئی تک ادا کر دو اور خیانت سے بچو اس لیے کہ یہ خیانت قیامت کے دن عار اور ندامت کا باعث ہو گی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت داری کا ایسا کامل مظاہرہ فرمایا کہ مشرکین مکہ آپؐ پر ایمان نہ لانے اور آپؐ کی نبوت کا انکار کرنے کے باوجود آپؐ کو صادق و امین کے لقب سے یاد کرتے تھے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عہد کی پابندی کا بھی نہایت اہتمام فرماتے اور دوسروں کو بھی اس کی نہایت تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ نہ اپنے بھائی سے جھگڑا کرو نہ اس سے بے جا مزاح کرو اور نہ ایسا وعدہ کرو جس کی خلاف ورزی کرو۔ عہد کا لفظ ان تمام معاملات و معاہدات کو شامل ہے جن کی زبان سے کہہ کر اپنے اوپر ذمہ داری لی جائے۔ خواہ اس پر قسم کھائے یا نہ کھائے اور خواہ وہ عہد کسی کام کرنے کے متعلق ہو یا نہ کرنے سے تعلق رکھتا ہو۔ کسی سے معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کرنا حرام اور بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن اس کے توڑنے پر شرع نے دنیا میں کوئی کفارہ مقرر نہیں فرمایا بلکہ اس کے لئے آخرت کا عذاب ہے۔

عہد دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جو بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے اور وہ احکام الٰہی کی پابندی کرنا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ دوسرا عہد وہ ہے جو ایک انسان دوسرے

انسان سے کرتا ہے یا ایک جماعت دوسری جماعت سے کرتی ہے۔ اس میں وہ تمام سیاسی، تجارتی اور معاملاتی معاہدات شامل ہیں جو افراد یا جماعتوں کے درمیان دنیا میں ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے تمام معاہدات کو پورا کرنا انسان پر واجب ہے اور دوسری قسم میں جو معاہدات شرع کے خلاف نہ ہوں ان کا پورا کرنا واجب ہے اور جو شرع کے خلاف ہوں ان کے متعلق دوسرے فریق کو اطلاع کر کے ختم کر دینا واجب ہے۔

خیانت

اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کرنا اور بری عادتوں سے بچنا انسانیت کا زیور اور زمین پر انسان کے خلیفتہ اللہ ہونے کا بنیادی اصول ہے۔ جن اچھی صفات کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے ان میں سے ایک صفت امانت ہے اور اس کے بالمقابل جو بری صفت ہے اس کو خیانت کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں دھوکہ دینا، غداری و مکرو فریب کرنا، کمی و کوتاہی کرنا، وعدہ خلافی و عہد شکنی کرنا۔

خیانت دو طرح سے ہوتی ہے ایک اللہ اور اس کے رسول کے حقوق میں کرنا دوسرے بندوں کے حقوق میں کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں خیانت یہ ہے کہ اس کے فرض کئے ہوئے کاموں کو ترک کیا جائے یا ان کی ادائیگی میں کوتاہی و کمی کی جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیانت یہ ہے کہ ان کی سنتوں کو بالکل ترک کر دے یا ان کے بتائے ہوئے طریقے سے تجاوز کر کے اپنی طرف سے نیا طریقہ ایجاد کر لیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے لیکن وضو کے فرائض اور سنتیں پوری طرح ادا نہیں کرتا یا نماز میں رکوع و سجود، قومہ و جلسہ پوری طرح ادا نہیں کرتا تو وہ وضو یا نماز میں خیانت کرتا ہے۔ اسی طرح جو احکام اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہم تک پہنچائے ہیں، ہم ان میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیانت نہ کریں اور بعینہٖ دوسروں کو پہنچا دیں۔

بندوں کے حقوق میں خیانت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کے ساتھ کسی قسم کا دھوکہ و فریب نہ کیا جائے، کسی کام میں بے ایمانی نہ کی جائے، ان کے حقوق میں کسی

قسم کی کوتاہی نہ کی جائے ۔ ان کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو توڑا نہ جائے ، جو وعدہ کیا جائے اس کو پورا کیا جائے ۔ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرے ، کسی سے بد سلوکی نہ کرے ، ان کے ساتھ معاملات میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے ۔ ان کو اچھے کاموں کی نصیحت کرنا ، غلط اور برے کاموں سے روکنا ترک نہ کرے

بد دیانت اور خائن شخص سے کسی قسم کے عدل و انصاف کی توقع نہیں کی جاسکتی ، اس سے عزت نفس اور عفت و عصمت کا احساس جاتا رہتا ہے ۔ سماجی اعتبار سے وہ شخص ذلیل و خوار ہوتا ہے ۔ اس کے دل میں منافقت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس کا ایمان و عمل ، گفتار و کردار ، عبادت و اطاعت سب کچھ منافقت اور ریاکاری کی نذر ہو جاتا ہے ۔

توشہ آخرت

جس طرح دنیاوی زندگی میں کوئی شخص ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتا ہے تو راستے اور منزل پر پڑاؤ کرنے اور وہاں سے واپس اپنی جگہ پر آنے تک کے لئے توشہ یعنی زادِ راہ تیار کرتا ہے اور جتنا طویل سفر و قیام کرنا ہوتا ہے زاد راہ بھی اسی کے بقدر تیار کرنا پڑتا ہے ۔ یہ دنیا بھی ایک گزر گاہ ہے اور انسان کی اصل منزل مقصود ، دارِ آخرت ہے جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور وہاں کی زندگی کبھی ختم نہ ہونے والی ہے ۔ اس لئے ہر انسان کو اس دنیا کی زندگی کو ایک مسافر کی طرح بسر کرنا چاہیئے اور آخرت کی دائمی زندگی کے لئے توشہ تیار کرنا چاہیئے ۔

چونکہ آخرت کی زندگی کبھی منقطع نہ ہونے والی اور دائمی ہے ، اس لئے انسان کا اصلی وطن اور حقیقی مقام آخرت ہے ۔ دنیا میں اس کا مقام ایک مسافر کی طرح ہے اس لئے دائمی اور اصلی وطن کے قیام و قرار کے لئے یہیں سے کچھ سامان بھیجنا ضروری ہے اور انسان کے اس سفر یعنی دنیا میں بھیجے جانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ یہاں رہ کر آخرت کے لئے کچھ کمائے اور جمع کرکے اپنے وطن آخرت کی طرف بھیج دے ۔ جس طرح اس دنیا میں کوئی شخص اپنے وطن سے پردیس میں جاکر کمائی کرتا ہے اور جمع کرکے وطن میں بھیجتا رہتا ہے اور پھر خود بھی اپنے وطن واپس آکر اپنی بھیجی ہوئی پونجی سے فائدہ حاصل کرتا ہے ، اسی طرح ہر انسان اس دنیا میں کمائی ہوئی پونجی سے آخرت میں فائدہ اٹھائے گا ۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ اس نے کھری پونجی جمع کرکے آگے بھیجی ہو ۔ پس اگر کھوٹی پونجی بھیجے گا تو فائدہ حاصل کرنے کے بجائے اس پر فرد جرم عائد ہوگی اور وہ سزا پائے گا ۔

ایک عظیم نعمت

نیند اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم الشان نعمت ہے کہ انسان کی ساری راحتوں کا مدار یہی ہے۔ دن بھر کی محنتوں اور کاروباری مشغولیتوں سے جو تکان اور کمزوری لاحق ہو جاتی ہے، وہ اس سے دور ہو جاتی ہے اور جسمانی آرام کے ساتھ ساتھ افکار و خیالات منقطع ہو کر دماغ کو بھی آرام ملتا ہے اس مقصد کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے رات بنائی ہے اور کاروبار و محنت و مشقت کے لئے دن بنایا ہے۔

نیند کو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کے لئے ایسا عام فرمایا ہے کہ ہر امیر و غریب، عالم و جاہل، بادشاہ اور مزدور سب کو یہ دولت بیک وقت یکساں عطا ہوتی ہے بلکہ غریبوں اور محنت کشوں کو یہ نعمت جیسی حاصل ہوتی ہے، ویسی مالداروں اور بڑے بڑے عہدہ والوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی حالانکہ ان کے پاس راحت کے سامان، مکان، ہوا، سردی اور گرمی کے اعتدال کی جگہ وغیرہ سب کچھ ہوتے ہیں جو غریبوں کو بہت ہی کم ملتے ہیں مگر نیند کی نعمت ان گدوں، تکیوں یا کوٹھی بنگلوں کے تابع نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے جو براہِ راست اس کی طرف سے ملتی ہے۔ بعض اوقات مفلس بے سامان کو کھلی زمین پر ایسی اچھی نیند آتی ہے جو بعض ساز و سامان والوں کو بھی میسر نہیں ہوتی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا انعام ہے کہ نیند کے ایسے سازگار حالات ایک خاص وقت میں پیدا کر دیئے کہ تمام انسانوں اور جانداروں پر بیک وقت یعنی رات کی پر سکون تاریکی میں نیند مسلط ہو جاتی ہے اور پھر ایک معین وقت کے بعد جب کہ فطری طور پر انسان کو سکون و راحت سے سیری حاصل ہو جاتی ہے تو دن کا ظہور فرماتا ہے تاکہ دن کی روشنی میں اپنی معاشی جدوجہد اور محنت و مشقت میں مشغول ہو کر اپنی معاشی ضروریات اور معاشرتی منافع حاصل کر سکے، اس لئے کہ انسان کی راحت و سکون کے لئے جس طرح نیند ضروری ہے اسی طرح اس کے لئے غذائی ضروریات کا حصول بھی ضروری ہے۔ اگر ہر وقت رات ہی رہتی اور آدمی سوتا ہی رہتا تو اس کو یہ ضروریاتِ زندگی کیسے حاصل ہوتیں۔ کیونکہ ان کا حاصل ہونا محنت و مشقت اور جدوجہد سے تعلق رکھتا ہے۔ بس جس طرح سونا اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے اسی طرح صبح کو اٹھنا بھی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے اور ان دونوں اہم نعمتوں کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ نے دن اور

رات کا عمل قائم فرمایا ہے۔

سونے آداب

سونے کا ایک ادب یہ ہے کہ دائیں کروٹ پر لیٹے اور سیدھا ہاتھ سیدھے رخسار کے نیچے رکھے۔ پھر یہ دعا پڑھے: اللھم باسمک اموت واحیی (بخاری شریف)۔

لیکن اگر ایسے وقت سوئے کہ نماز کا وقت قریب ہو تو اپنا بازو کھڑا کر کے اپنا سر اپنی ہتھیلی پر رکھ کر سوئے تاکہ غفلت کی نیند نہ آئے اور نماز نہ جاتی رہے۔ سونے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ باوضو سوئے اور اپنے فرش کو کسی کپڑے سے تین دفعہ صاف کرے۔ فقہا نے سوتے وقت وضو سے ہونے کو سنت کہا ہے لیکن اکثر کے نزدیک یہ مستحب ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ مستحب اس وقت ادا ہو گا جبکہ نیند آنے تک وضو قائم رہے۔ پس اگر کوئی شخص وضو کر کے لیٹا، پھر نیند آنے سے پہلے اس کا وضو ٹوٹ گیا اس کے بعد سویا تو وہ مستحب ادا نہ ہو گا۔

مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چت (یعنی پیٹھ پر) لیٹنے سے منع فرمایا ہے کہ وہ اپنے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھے۔ ایک پاؤں کا دوسرے پاؤں پر رکھنا دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ دونوں پاؤں دراز ہوں اور ایک پاؤں کو دوسرے پر رکھے۔ اس طرح لیٹنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اس میں ستر کا کھلنا لازم نہیں آتا۔ اس طرح لیٹنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک زانو کو کھڑا رکھے اور دوسرا پاؤں اس کھڑے ہوئے زانو پر رکھے۔ یہ طریقہ منع ہے کیونکہ اس میں ستر کھل جاتا ہے۔ لیکن اگر پاجامہ پہنے ہوئے ہو یا تہبند یا کرتہ کا دامن لمبا ہو جس سے ستر نہ کھلے تو اس طرح لیٹنا بھی منع نہیں۔ بس جواز و ممانعت کا مدار ستر کے کھلنے اور نہ کھلنے پر ہے۔

قربِ الٰہی

بندہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں جس قدر زیادہ ترقی کرتا ہے اس کو قربِ الٰہی میں اسی قدر ترقی ہوتی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت میں جس قدر ترقی ہوتی ہے بندہ اسی قدر اللہ تعالیٰ کا فرمان بردار ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بندے کے کان، آنکھ، ہاتھ پاؤں وغیرہ سے اپنی مرضی کے مطابق اعمال کراتا

ہے ۔ ہر قسم کے نقصان اور برائی سے اس کو بچاتا ہے اور ہر قسم کے فائدے اور نیکی سے اس کو ہمکنار فرماتا ہے ۔

حقیقی خسارہ

انسان کو اپنی زندگی میں بہت سے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے ۔ اکثر و بیشتر اس کی زندگی کامیابی اور نفع حاصل کرنے سے ہمکنار رہتی ہے اور بسا اوقات خسارے اور نقصانات سے بھی واسطہ پڑتا رہتا ہے ۔ مثلاً اگر کوئی شخص تجارت کرتا ہے تو اکثر وہ نفع کماتا اور اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرتا ہے اور کبھی کبھی وہ نقصان سے بھی دوچار ہوتا ہے ۔ اگر اس کو ہمیشہ نقصان ہی ہوتا رہے تو وہ اس کاروبار کو کچھ عرصہ کے بعد چھوڑ دے گا اور کسی اور کام میں قسمت آزمائی کرے گا ۔ اسی طرح نفع حاصل کرنا بھی انسان کے اختیار کی بات نہیں ہے ۔ اگر دنیا کا نفع و نقصان انسان کے اختیار میں ہو تو وہ کبھی نقصان نہ اٹھائے اور ہمیشہ نفع ہی سے ہمکنار رہا کرے مگر ایسا نہیں ہے ۔ سب کاموں میں اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت کارفرما ہے ۔ اسی طرح دوسرے امور مثلاً صحت و مرض عروج و زوال، فتح و شکست، امیری و غریبی، عقل مندی و کم عقلی وغیرہ میں بھی مشیت و حکمتِ الٰہی کا کامل عمل دخل ہے ۔

انسان کی ایک زندگی دنیا کی زندگی ہے ۔ اس زندگی کے نفع و نقصان کو ہم لوگ بہت ہی اہمیت دیتے ہیں اور ہر وقت اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ ہمیں اس دنیا میں کبھی کوئی ناکامی، پریشانی، بیماری، نقصان وغیرہ لاحق نہ ہو ۔ اسی طرح انسان کی ایک زندگی آخرت کی زندگی بھی ہے جس کی طرف سے ہماری اکثریت غافل ہے ۔ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ یہ دنیا محنت و رنج و غم کا گھر ہے اور ہر شخص کو ایک نہ ایک دن یہاں سے کوچ کرنا ہے اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ اس دنیا کی زندگی اور اس کا ساز و سامان نہایت بے ثبات اور جلد ختم ہو جانے والا ہے، کسی کو بھی یہاں ہمیشہ نہیں رہنا ۔

اگر کوئی شخص دنیا میں خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے اور ہر قسم کے منافع، صحت و مال و متاع سے بہرہ مند ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے تو یہ خوشی کوئی حقیقت نہیں رکھتی ۔ یہ عارضی خوشی ہے جو بہت جلد ختم ہو جائے گی اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گا تو آخرت کا عذاب اس کے لئے دائمی ہو گا جس سے بچ کر نکل جانے کی کوئی جگہ اور کوئی صورت نہیں

ہو گی اور اگر کوئی شخص دنیا میں مفلس و بے مایہ ہے لیکن مومن ہے اور اعمال صالحہ پر کار بند ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری اس کا شعار ہے تو اس کے لئے دنیا کی تکلیفات جو کہ عارضی ہیں کسی رنج و ملال کا باعث نہ ہوں گی کیونکہ اس کو ہر وقت اطمینان ہے کہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو کر عالم آخرت میں جائے گا تو آخرت اور اس کی نعمتیں اسے خوش آمدید کہیں گی جن سے وہ ہمیشہ لطف اندوز ہوتا رہے گا۔

جن لوگوں کے اعمال نیکی اور بھلائی سے خالی ہیں اور جنہوں نے شریعتِ مقدسہ کے بتائے ہوئے اعمال کی خلاف ورزی کی اور یہ سمجھتے رہے کہ وہ اچھے اور پسندیدہ اعمال پر کار بند ہیں اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں اس کی کتابوں، فرشتوں، یوم آخرت، جزاو سزا، جنت و دوزخ اور تقدیر الٰہی کا انکار کیا اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور رسولوں کا مذاق اڑایا، ان کے لئے دوزخ کا دائمی عذاب ہے۔ وہ اس سے کبھی چھٹکارا نہیں پائیں گے، وہ ہمیشہ کے لئے ہر قسم کی لذتوں سے محروم رہیں گے۔ یہی حقیقی خسارہ ہے۔ دنیا کی زندگی میں جو نقصان و خسارہ مال و متاع اور صحت و عقل وغیرہ میں واقع ہو جاتا ہے وہ بسا اوقات عارضی ہوتا ہے اور جب بندہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور احتیاطی تدابیر پر عمل کرتا ہے تو وہ بہت جلد اس خسارہ کو پورا کر لیتا ہے اور پہلے کی طرح یا اس سے بھی بہتر حالت میں ہو جاتا ہے۔ لیکن آخرت کا خسارہ عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ دائمی بھی ہوتا ہے، اس لئے اس خسارہ سے نجات کسی طرح ممکن نہیں۔ دنیا کی نعمتیں اور لذتیں خواہ کتنی ہی اچھی ہوں آخر فانی ہیں۔ آخرت کی نعمتوں اور لذتوں کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، لہٰذا آخرت کی نعمتوں اور لذتوں سے محرومی ہی حقیقی خسارہ ہے۔

حیاء کی حقیقت

حیاء انسان کے ظاہر کا زیور اور باطن کی زیب و زینت ہے۔ حیاء کے باعث انسان کے اندر اچھے اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور برے اخلاق کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی حیاء بعض حقوق کی ادائیگی میں مخل ہوتی ہے۔ مثلاً امر معروف و نہی منکر وغیرہ میں۔ پس ایسی حیا جو حق کام میں مخل ہو وہ شرعاً حیا نہیں ہے بلکہ بزدلی اور بخل ہے۔ اس کو مجازاً حیا کہا جائے گا ورنہ شرعاً حیا کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے باعث برائی کو ترک کیا جائے اور نفس میں برائی سے انقباض ہو۔

اعتدال و میانہ روی

دین کے کاموں میں اعتدال و میانہ روی اختیار کرنی چاہیئے اور افراط و تفریط سے بچنا چاہیئے ۔ جس طرح مسافر مسلسل سفر نہیں کرتا بلکہ صبح و شام کے ٹھنڈے اور خوشگوار وقت اور رات کے کچھ پر سکون حصے میں سفر طے کر کے باقی اوقات میں خود بھی آرام کرتا ہے اور اپنی سواری کو بھی آرام دیتا ہے ، یہی حال دین کے راستہ پر چلنے والے مسافر کا ہے کہ اس کو اپنی طاقت سے زیادہ اپنے اوپر مشقت نہیں ڈالنی چاہیئے ۔ نفلی عبادات صبح و شام اور رات کے کچھ حصے میں سنت کے مطابق ادا کرنی چاہئیں اور خلافِ سنت طریقہ پر ان کا اہتمام کرنے سے بچنا چاہیئے ۔ خلافِ سنت اعمال سے دین میں غلو کا دروازہ کھل جاتا ہے اور جو شخص دین کے کاموں میں غلو اور افراط میں مبتلا ہو کر دین سے دھینگا مشتی کرتا ہے وہ اپنے اس طرز عمل سے دین کا تو کچھ حق ادا نہیں کر سکتا البتہ خود تھک جاتا ہے اور اپنے اس طرزِ عمل سے پسپائی اختیار کرتا ہے ۔

سادگی

سادگی بڑی نعمت ہے جو انسان کو حسد ، تکبر ، حرص ، خود پسندی وغیرہ بہت سی برائیوں سے بچاتی ہے ۔ ایثار ، ہمدردی ، عالی ظرفی وغیرہ خوبیوں سے نوازتی ہے ، عزت نفس کا ادراک پیدا کرتی ہے ، باوقار و محترم بناتی ہے ، دروغ ، غیبت اور فریب جیسی لعنتوں سے محفوظ رکھتی ہے ، کسب حلال و محنت کا شعور پیدا کرتی ، دوسروں کی دست نگری سے متنفر کرتی اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے ۔

سادگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت کے مطابق اپنے رہنے سہنے ، کھانے پینے ، لباس و پوشاک اور برت برتاؤ میں اعتدال کو مد نظر رکھے اور ان تمام امور میں بے جا تکلف سے بچتا رہے ۔ سادگی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آدمی بخل اور تنگی کے ساتھ زندگی گزارے بلکہ بخل اور فضول خرچی دونوں سے پرہیز کرتے ہوئے زندگی کے ہر شعبہ میں میانہ روی اختیار کرے ۔ جب انسان فضول خرچی اور کنجوسی کو ترک کر کے اعتدال کے ساتھ زندگی گزارتا ہے تو اس کا طرز زندگی نہایت سادہ اور دل پسند ہوتا ہے ۔ وہ اپنی آمدنی کے مطابق خرچ کرتا اور اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلاتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہترین نمونہ عمل عطا فرما کر بھیجا تھا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بحر و بر کا مالک بنایا تھا اور بڑی بڑی سلطنتوں کو آپ کے لئے زیر کر دیا تھا، اس کے باوجود آپؐ نہایت سادہ زندگی بسر فرماتے تھے۔ آپ کی مجلس مبارک میں شاہی دربار کے سے ساز و سامان اور تکلفات نہیں تھے۔ آپؐ کے دروازے پر کوئی دربان نہیں ہوتا تھا، لیکن مکمل سادگی اور بوریہ نشینی کے باوجود نبوت کا رعب و جلال ایسا طاری رہتا تھا کہ حاضرین مجلس دم بخود نظر آتے تھے۔ آپؐ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ آپؐ کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے، اٹھنے، بیٹھنے، اہل و عیال کے ساتھ برتاؤ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے میں نہایت سادگی اختیار فرماتے تھے۔ دوسروں کو بھی سادگی کی تعلیم دیتے اور اسی کو پسند فرماتے تھے۔

سادگی کے فوائد

سادگی اختیار کرنے والا ہر قسم کی فکر سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کے ذہن پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہوتا، وہ قرض لینے کی مصیبت سے بچا رہتا ہے، حرص و ہوس کی لعنت سے محفوظ رہتا ہے، دریوزہ گری سے بچتا اور لوگوں کی نظروں میں عزت و اکرام پاتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ تکلف و تصنع کی زندگی گزارتے ہیں وہ اپنے معیارِ زندگی کو بلاوجہ اپنی طاقت سے زیادہ بلند کر لیتے ہیں، پھر ان کو اپنا معیار قائم رکھنے میں بڑی دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے لوگ اکثر غلط طریقے اختیار کرتے یا مقروض رہتے ہیں اور آخر لوگوں کی نظروں میں ذلیل و بے وقار ہو جاتے ہیں۔ آج ہزارہا پریشانیوں کا بنیادی سبب سادگی سے گریز ہے۔ معیار زندگی بلند کرنے کی مسابقت اور دوڑ نے زندگی کا چین اور دلوں کا سکون چھین لیا ہے۔ غیر ملکی سامان تعیش کی درآمدات کے باعث کروڑہا روپے کا زر مبادلہ بیکار ضائع ہو رہا ہے جو قومی تعمیر و ترقی میں خرچ ہونا چاہیئے تھا۔ ملک میں خوش حالی و فارغ البالی حاصل ہونے کی بجائے تکلف و تعیش کی زندگی کے باعث تمام قوم بلکہ تمام دنیا بے چینی، پریشانی اور عدم سکون کا شکار ہے۔

ظالم و جاہل انسان

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ظالم و جاہل کے الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔ یہ نازک مسئلہ ہے کیونکہ تمام پیغمبر بھی اس خطاب میں شامل ہیں۔ ظالم کا مطلب ہے حد سے زیادہ بڑھنے والا۔ انسان نے

جب اس گوہر بے بہا کو حاصل ہوتے دیکھا تو خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اقتدار کی ہوس انسان کی فکر کا خاصہ ہے اور حد سے بڑھنا اس کی طینت میں داخل ہے۔ قدرت کو بھی معلوم تھا کہ یہ کائنات کو مسخر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ پہاڑوں کو کھود ڈالے گا، خلاؤں کی تسخیر اور سمندروں پر حکمرانی کرے گا، ماہ و مشتری کو اپنے زیر نگیں لے آئے گا، ہواؤں پر حکم چلائے گا اور شمس و قمر کو اپنا تابع بنائے گا۔ اس لئے انسان کو اس کا موقع دیا گیا اور اس نے بھی اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور ذمہ داری کے اس قدر مشکل کام کو سوچے سمجھے بغیر قبول کرلیا، گویا کہ اس نے اپنی بساط سے بڑھ کر یہ ذمہ داری قبول کی اور چونکہ جاہل یعنی عاقبت نااندیش تھا، اپنے اعمال کے نتائج سے بے خبر ہو کر اپنے انجام کی فکر نہ کی اور یہ بھول گیا کہ جس قدر زیادہ اختیارات کا حامل ہوگا ان کی ذمہ داری بھی اسی قدر زیادہ ہوگی اور جواب دہی بھی اسی قدر زیادہ سخت ہوگی۔ اسے یہ سوچنے کا ہوش نہ رہا کہ اگر اس نے امانت میں خیانت کی تو عتاب الہیٰ کا مستحق بن جائے گا۔ اس نے عاقبت کی فکر نہ کی اس لئے اسے جاہل کہا گیا، کیونکہ آدم علیہ السلام اور ان کی قیامت تک ہونے والی تمام اولاد کے سامنے یہ امانت پیش کی گئی تھی اور انبیاء کرام و اولیائے عظام کے علاوہ اکثر مخلوق اس امانت کی ذمہ داری کے انجام سے بے خبر تھی اس لئے ان کے اعتبار سے انسان کو ظلوماً جھولاً کہا گیا۔

عقل و خواہشات کی پیروی کا انجام

عقل محض ہی وہ رہنما ہے جس نے انسان کو توہمات کے بھنور میں پھنسا کر اپنے سے ادنیٰ درجہ کی مخلوق یعنی آگ، پانی، چاند، سورج، حجر و شجر وغیرہ کی پوجا کرادی۔ یہی وہ گمراہ کن رہبر ہے جس نے رہبانیت کی راہ پر ڈال کر زندگی اور اس کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کی ادائیگی سے فرار سکھایا۔ اسی نے انسان کے جسم و جان کو مشقت آمیز مجاہدوں اور ریاضتوں میں پھنسا کر حقیقت کی راہ سے ہٹایا اور گمراہی کے بھنور میں دھکیل دیا، حقوق العباد سے غافل کر کے غاروں اور جنگلوں میں تنہائی کی زندگی گزارنے کو عبادت قرار دیا۔ غرض کہ تاریخ کے کسی دور اور دنیا کے کسی حصے میں بھی جو گمراہیاں پیش آئی ہیں ان سب کی اصل عقل انسانی کی گمراہی اور خواہشاتِ نفس کی پیروی ہے۔

فلاح انسانی

بنی نوع انسان کی بھلائی، اعمال کی اچھائی، اخلاق کی بہتری، دلوں کی صفائی اور انسانی اقدار وقویٰ میں اعتدال و میانہ روی کی کامیاب کوشش اگر کسی انسانی طبقہ نے انجام دی ہے تو وہ صرف انبیاء کرام و رسولان عظام کا طبقہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مبعوث فرمایا ہے ۔ ان حضرات کی تعلیم و تربیت اور عمل و اصلاح کے سرچشمے سے بادشاہ و رعایا، امیر و غریب، جاہل و عالم، شہری و دیہاتی، مرد و زن، پیر و جوان سب ہی کو برابر فیض پہنچتا ہے ۔

قربِ خداوندی

قربِ خداوندی ہر مومن کا مقصدِ حیات اور اولیاء اللہ کا طغریء امتیاز ہے ۔ یہ عبادتِ الہیٰ کا نتیجہ اور اعمال صالحہ کا ثمرہ ہے ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا قرب حاصل ہو جاتا ہے ۔ جیسا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ اس کے قریب بیٹھتا، اس کے ساتھ ہمکلام ہوتا اور اس کے ساتھ چلتا پھرتا کھاتا پیتا ہے ۔ نہ اس قرب سے مراد اتحاد و حلول ہے اور نہ ہی عینیت و واحدیت ہے بلکہ قربِ خداوندی کا مطلب بندے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتہائی درجہ کا رابطہ و تعلق اور محبت کا پیدا ہونا ہے ۔ جس بندہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جس قدر زیادہ تعلق محبت ہوگا اس کو اسی قدر قربِ خداوندی حاصل ہوگا ۔

جوہر علوی و سفلی

انسان دو مختلف جوہروں سے مرکب ہے ۔ ایک جوہر علوی ہے اور دوسرا سفلی ۔ جس طرح سفلی جوہر یعنی مادی جسم جو عناصر اربعہ سے مرکب ہے، صحت و مرض قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ اسی طرح علوی یعنی روح کو بھی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں ۔ جس طرح جسمانی امراض کے معالج اور ادویہ ہیں، اس طرح امراض روحانی کے بھی معالج اور نسخے ہیں ۔ جس طرح ظاہری امراض کے معالج اطباء ہیں، اسی طرح باطنی امراض کے معالج انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے جانشین علماء کرام و اولیاء عظام ہیں ۔

ظاہری و باطنی امراض کا علاج

قرآن کریم باطنی امراض کے لئے بھی نسخے اور ہدایات پیش کرتا ہے اور ظاہری امراض کا بھی تدارک کرتا ہے۔ یہ روحانی ترقی کے لئے مکمل ہدایت نامہ اور اخلاق اوضاع و اطوار کے لئے جامع منشور ہے۔ یہ ایک ایسا صحیفہ حکمت ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ کے لئے سعادت و رحمت ہے۔ اس کی اخلاقی تعلیمات دینی و دنیوی زندگی کی صحت و سلامتی کی ضامن ہیں اور اس کی روحانی تعلیمات اخروی زندگی کی کامیابی و سرخروئی کی کفیل ہیں۔ یہ روحانی سربلندی کی اساس اور حسن اخلاق کی تکمیل کا مکمل لائحہ عمل ہے، یہ روحانی معراج کے لئے ایک کامل ترین نسخہ کیمیا اور اخلاقی سربلندی کے لئے ایک نہایت معتمد وسیلہ ہے۔ قرآن حکیم نے انسان کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تزکیہ باطن کے لئے جو رہنما اصول بیان فرمائے ہیں وہ قیامت تک ہر خطہ زمین کے لوگوں کے لئے مکمل و نتیجہ بخش ہیں۔

رضائے الہیٰ

رضائے الہیٰ جو محبت الہیٰ کا اعلیٰ ثمر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع پر موقوف ہے اور ایمان کامل کا موقوف علیہ بھی یہی کامل اتباع ہے جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی ہر خواہش اس شریعت کے تابع نہ ہو جائے جس کو میں لے کر آیا ہوں۔ رضائے الہیٰ حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے انسان کو اللہ تعالیٰ کے احکام کا علم ہونا ضروری ہے اور اوامر و نواہی کا جاننا ناگزیر ہے۔

رضائے الہیٰ کی کسوٹی

اللہ تعالیٰ کی رضا اور محبت کے معاملہ میں ہر شخص اپنا امتحان خود کر سکتا ہے۔ اگر بندہ اپنے مولا سے راضی ہے یعنی اس کے تمام احکام کو خوشی و رضامندی کے ساتھ مانتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنے اس بندے سے راضی ہے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل رضا و رغبت کے ساتھ نہیں کرتا تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی امید نہیں رکھنی چاہیئے، بلکہ پہلے وہ اپنی

اصلاح کرے اور پھر رضائے الہیٰ کا امیدوار بنے ۔ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہء کرام کے ایک گروہ سے دریافت فرمایا کہ تم کیا ہو ؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم ایماندار ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے ایمان کی کیا علامت ہے ؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہم بلا پر صبر کرتے ہیں اور فراخی کے وقت شکر کرتے ہیں اور قضا کے موقعوں پر راضی رہتے ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا کہ رب کعبہ کی قسم تم ایماندار ہو ۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص تھوڑے سے رزق کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوا تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے تھوڑے عمل کے ساتھ راضی ہو گیا۔

اخلاص عمل

تزکیہء ظاہر و باطن کا کمال یہ ہے کہ ہر عمل میں اخلاص ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین خالص اور اخلاص والا عمل ہی معتبر اور قربِ الہیٰ کا ذریعہ ہے ۔ اخلاص کا کمال یہ ہے کہ بندہ اپنے کسی عمل میں بھی اخلاص نہ سمجھے اور اس کو باری تعالیٰ کی بارگاہِ مقدس کے لائق نہ جانے ۔ یہ بات اس وقت حاصل ہو گی جب حدیث احسان کے پہلے جزو پر عمل حاصل ہو جائے یعنی یہ کیفیت حاصل ہو جائے کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے ۔

اللہ کی رسی

اتحاد و اتفاق ایک ایسی چیز ہے جس کے اچھا ہونے پر تمام دنیا کے انسان خواہ وہ کسی ملک قوم اور زمانے کے ہوں اور خواہ کسی مذہب و مشرب سے تعلق رکھتے ہوں ، سب کا اتفاق ہے ۔ دنیا کی ہر جماعت اور ہر پارٹی لوگوں کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتی ہے ۔ اس کے باوجود تجربہ یہ بتاتا ہے کہ انسانیت فرقوں ، گروہوں ، جماعتوں اور پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے ۔ صحیح معنوں میں دو آدمیوں کا اتحاد بھی افسانہ بن کر رہ گیا ہے ۔ غور کیا جائے تو اس کا سبب یہ معلوم ہو گا کہ ہر گروہ اور ہر پارٹی بلکہ ہر شخص اپنے خود ساختہ پروگرام پر دوسروں کو متحد و متفق کرنا چاہتی ہے جس کا لازمی نتیجہ اختلاف و افتراق و انتشار کی صورت میں نکلتا ہے ۔ لیکن قرآن کریم نے اتحاد و اتفاق اور تنظیم و اجتماع کا ایک ایسا منصفانہ و عادلانہ اصول و نظام سکھایا ہے جس پر عمل کرنے سے اختلاف و افتراق ختم ہوتا ہے اور اتحاد و اتفاق پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نسخہء اکسیر یہ ہے کہ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور اللہ کی رسی قرآن مجید ہے ۔

حسن سلوک

شریعت نے جس طرح دور و نزدیک کے رشتہ داروں اور ہمسایوں وغیرہ کے حقوق واجب فرمائے ہیں اسی طرح مسلمانوں کے حقوق بھی واجب کئے ہیں ۔ حتیٰ کہ اس شخص کا حق صحبت بھی لازم کر دیا جو تھوڑی دیر کے لئے کسی مجلس یا سفر میں آپ کے برابر بیٹھا ہو جس میں مسلم و غیر مسلم اور رشتہ دار و غیر رشتہ دار سب برابر ہیں، ان سب کے ساتھ بھی حسن سلوک کی ہدایت فرمائی ہے ، جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ کے کسی قول و فعل سے اس کو ایذا نہ پہنچے ۔ کوئی گفتگو ایسی نہ کریں جس سے اس کی دل آزاری ہو ، کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے اس کو تکلیف ہو ، اس طرح نہ بیٹھیں کہ جس سے اس کی جگہ تنگ ہو جائے ۔ اسی طرح اجنبی شخص اور راہ گیر کا بھی حق مقرر فرمایا ہے ۔ پس اگر کوئی شخص اپنے سفر کے دوران آپ کے پاس آجائے یا آپ کا مہمان ہو جائے چونکہ اس اجنبی شخص کے تعلق والا کوئی شخص اس جگہ نہیں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے اسلامی بلکہ انسانی تعلق کی رعایت فرماتے ہوئے اس کا حق بھی دوسروں پر لازم کر دیا ہے کہ بقدر وسعت و استطاعت اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں ۔

مخلصانہ نصیحت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو آپس میں اتحاد و اتفاق ، اخوت و محبت اور بھائی چارہ قائم رکھنے کی تعلیم فرمائی ہے ۔ ایک حدیث میں ہے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے وہ اس کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے (اس لئے اس کو اپنے دینی بھائی کی اصلاح و خیر خواہی میں رہنا چاہئے) ۔ نہ اس سے جھوٹ بولے اور نہ اس پر ظلم کرے اور بیشک تم میں سے ہر ایک اپنے مومن بھائی کا آئینہ ہے ، اگر وہ اس کا کوئی عیب دیکھے تو اس سے دور کر دے ۔

اس حدیث میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے لئے آئینے کی مانند قرار دیا گیا ہے ۔ یہ ایک نہایت پر معنی تشبیہ ہے ۔ اس میں غور کرنے سے چند باتیں سامنے آتی ہیں ۔ اول یہ کہ آئینہ چہرے کا حسن و جمال اور اس کے داغ دھبے اسی قدر بتاتا ہے جس قدر حقیقت میں اس میں پائے جاتے ہیں ، نہ ان میں کمی کرتا ہے نہ زیادتی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مسلمان کا کوئی عیب بتانا ضروری ہو تو اسی قدر بتایا جائے جتنا در اصل اس میں موجود ہے ۔ اس کو بڑھا چڑھا کر

بیان نہ کرے ورنہ بہتان کی حد میں داخل ہو جائے گا اور کسی پر بہتان لگانا گناہ کبیرہ ہے۔
دوسرے یہ کہ آئینہ داغ دھبے اسی وقت تک بتاتا ہے جب تک چہرہ اس کے سامنے رہتا ہے۔ اگر چہرہ اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو آئینہ اس کے متعلق کچھ ظاہر نہیں کرتا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کسی مسلمان بھائی کا عیب بیان کرے تو اس کے سامنے بیان کرے، اس کی غیر موجودگی میں بیان نہ کرے کیونکہ یہ غیبت ہو جاتی ہے اور اپنے مسلمان بھائی کی غیبت کرنا ایسا ہے کہ جیسا کہ مردہ بھائی کا گوشت کھانا، جس کو کوئی شخص پسند نہیں کرتا، اس لئے غیبت کو بھی پسند نہیں کرنا چاہیئے۔

تیسری بات جو آئینے کے ساتھ تشبیہ دینے سے ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ آج تک یہ کہیں نہیں سنا کہ کسی نے آئینے میں اپنے داغ دھبے دیکھ کر غصہ اور ناراضگی کا اظہار کیا ہو اور آئینہ کو توڑ کر پھینک دیا ہو، بلکہ اس کے برعکس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر مطمئن ہو جاتے اور چہرے کے داغ دھبوں کو دور کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ آئینے کو بڑی احتیاط سے محفوظ جگہ پر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ آئندہ بھی اپنے چہرہ کے خد و خال اس میں دیکھ سکیں اور ایک بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جب آئینہ بالکل سامنے ہوتا ہے تب چہرے کہ داغ دھبے صحیح طور پر ظاہر کرتا ہے، اگر سامنے ہونے کی بجائے سر سے اونچا یا چہرے سے نیچا ہو تو اصل مقصد کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص ہمارا کوئی عیب بتائے یا ہم پر تنقید کرے تو اس سے ناراض نہیں ہونا چاہیئے اور نہ اس سے قطع تعلق کرنا چاہیئے، بلکہ اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے اور عیب بتانے والے کو بھی اپنے نفس کی اصلاح مدِ نظر رکھنی چاہیئے۔

عدل و انصاف پر قائم رہنا

حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بعد دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کو یکے بعد دیگرے مبعوث فرمانے اور ان پر بہت سی کتابیں اور صحیفے نازل فرمانے کا اہم مقصد یہی تھا کہ دنیا میں عدل و انصاف جاری ہو اور اس کے ذریعے امن و امان قائم ہو۔ ہر فرد و بشر اپنے دائرہ اختیار و امکان میں انصاف کو اپنا شعار بنائے اور جو سرکش لوگ وعظ و نصیحت اور تعلیم و تبلیغ کے ذریعے عدل و انصاف پر نہ آئیں ان کو قانونی سزا اور تعزیر کے ذریعہ انصاف پر قائم رہنے کے لئے مجبور کیا جائے۔

قرآن کریم میں واضح طور پر یہ ہدایت کی گئی ہے کہ انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف حکومت ہی کا فریضہ نہیں بلکہ ہر انسان اس کا مکلف ہے کہ وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں خود بھی انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو بھی انصاف پر قائم رکھنے کی کوشش کرے ۔ البتہ انصاف کا ایک درجہ حکومت اور حکام کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ یہ کہ جب شریر د سرکش لوگ انصاف کے خلاف عمل کرنے لگیں، نہ خود انصاف پر قائم رہیں اور نہ دوسروں کو عدل و انصاف کرنے دیں، تو حکومتِ وقت ان کو قانونی کاروائی کے ذریعہ تعزیر اور سزا دے تاکہ عدل و انصاف قائم ہو سکے اور امن و امان برقرار رہے ۔ آج کی دنیا میں عوام ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ انصاف کرنا صرف حکومت اور عدلیہ کا فریضہ ہے، عوام اس کے ذمہ دار نہیں ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ اپنی انفرادی زندگی میں عدل کو مدِ نظر نہ رکھنے کے باعث انصاف سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور دنیا میں بدامنی بڑھتی جا رہی ہے ۔

عدل و انصاف میں رکاوٹ ڈالنے والی عموماً دو چیزیں ہوا کرتی ہیں ۔ ایک کسی کی محبت و قرابت یا دوستی و تعلق جس کا تقاضا گواہی دینے والے کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے موافق گواہی دی جائے تاکہ یہ شخص نقصان سے بچ جائے یا اس کو نفع پہنچے ۔ دوسری چیز کسی کی عداوت و دشمنی ہے جو گواہ کو اس کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ کر سکتی ہے ۔ قرآن کریم نے ان دونوں رکاوٹوں کو یہ کہہ کر دور فرما دیا ہے کہ اگرچہ تمہاری شہادت اپنے ماں باپ یا قریبی رشتہ داروں ہی کے خلاف پڑے تب بھی حق کہنے اور سچی گواہی دینے میں اس تعلق کا لحاظ نہ کرو اور کسی قوم کا بغض و عداوت بھی تمہارے لئے اس کا باعث نہیں ہونا چاہیئے کہ راہِ عدل کو چھوڑ کر ان کے خلاف گواہی یا فیصلہ دینے لگو ۔

عدل و انصاف کی حقیقت

عدل و انصاف کی حقیقت یہ ہے کہ ہر صاحبِ حق کا حق پورا ادا کیا جائے اس کے عموم میں اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی داخل ہیں اور ہر قسم کے انسانی حقوق بھی ۔ اس لئے انصاف قائم کرنے کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور یہ بھی داخل ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکا جائے اور مظلوم کی حمایت کی جائے اور یہ بھی داخل ہے کہ ظالم کو ظلم کے روکنے اور مظلوم کا حق دلوانے کے لئے اگر گواہی دینے کی ضرورت پیش آئے تو اس سے گریز نہ کیا جائے اور یہ بھی

داخل ہے کہ گواہی دینے میں حق اور حقیقت کا اظہار کیا جائے خواہ وہ کسی کے موافق پڑے یا مخالف اور یہ بھی داخل ہے کہ جب دو فریقوں کا کوئی مقدمہ کسی حاکم کے سامنے پیش ہو تو وہ فریقین کے ساتھ یکساں معاملہ کرے، کسی ایک طرف کسی طرح کا میلان نہ ہونے دے، گواہوں کے بیانات غور سے سنے، معاملہ کی تحقیق میں اپنی پوری کوشش صرف کرے اور فیصلہ میں پورے پورے عدل و انصاف کا معاملہ رکھے۔ اگر تمام افراد انسانی عدل و انصاف کے اس پورے نظام کو اپنالیں اور اس پر پوری طرح عمل پیرا ہو جائیں تو یہی خونخوار و بد عمل دنیا ایک ایسے صالح معاشرے میں تبدیل ہو جائے جو آخرت کی جنت سے پہلے ہی جنت نقد بن جائے۔ یہ کوئی فرضی خیال یا خیالی اسکیم نہیں بلکہ اس کا ظہور و مشاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ کے زمانہ مبارکہ میں بطریق اکمل و احسن ہو چکا ہے اور دوسرے متبع سنت بادشاہوں نے بھی جب اس پر عمل کیا تو غریب و امیر، مزدور و سرمایہ دار کا تفرقہ یکسر مٹ گیا، قانون کا احترام ہر فرد اپنے گھر کے بند کمروں اور رات کی تاریکیوں میں بھی کرنے لگا۔ یہ تاریخی حقائق ہیں جن کا اعتراف غیروں نے بھی کیا اور ہر صاف دل غیر مسلم بھی اس کے ماننے پر مجبور ہو گیا۔

خشیتِ الٰہی

خشیت و خوفِ الٰہی تمام اعمال حسنہ کی کنجی ہے۔ خشیت اس خوف کو نہیں کہتے جو کسی درندے یا دشمن یا کسی موذی چیز سے طبعی طور پر ہوتا ہے، بلکہ خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی انتہائی عظمت و جلال کی وجہ سے پیدا ہو جس کا مقتضاء یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص ہر کام اور ہر حال میں اس باعظمت ذات کی رضاجوئی کی فکر و کوشش کرتا ہے اور اس کی ناراضگی کے شبہ سے بھی بچتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو کامل بندہ اور مقبول بارگاہ بناتی ہے اور اسی کی برکت سے انسان گناہوں سے بچتا اور اعمال حسنہ پر کاربند ہو جاتا ہے۔

نافرمانی کا ارتکاب

جب بندہ پر اللہ تعالیٰ کا خوف غالب نہیں رہتا تو وہ نافرمانی اور گناہ کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ خوفِ خدا کے غلبہ کے وقت آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری

چھوڑ کر نافرمانی اور گناہ کا ارتکاب کرنے لگے ۔ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب استاد یا ماں باپ وغیرہ سامنے ہوں تو آدمی کوئی ناشائستہ حرکت نہیں کرتا ۔ یہ استاد یا ماں باپ کا خوف ہی ہے جو اس کو ہر ناشائستہ حرکت سے روکتا ہے اور یہ خوف دو وجہ سے ہوتا ہے، ایک یہ کہ اگر میں یہ کام کروں گا تو مجھے سزا ملے گی دوسرے یہ کہ میرے بزرگ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے ۔

گناہوں سے بچنے کی تدبیر

اگر آدمی اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کر لے تو اس سے کوئی گناہ سرزرد نہیں ہو گا، اور اگر کوئی گناہ سرزد ہو بھی جائے گا تو فوراً اس کو ندامت ہو گی اور توبہ کی توفیق حاصل ہو جائے گی ۔ اس خوف کے نہ ہونے ہی سے سب خرابیاں واقع ہوتی ہیں ۔ جتنا جتنا خوف پیدا ہوتا جائے گا اسی درجہ کی خرابیاں دور ہوتی جائیں گی ۔ مثلاً بعض کو تو اتنا ہی خوف ہوتا ہے کہ وہ ان کو صرف کفر سے باز رکھتا ہے اور بعض کو اتنا خوف ہوتا ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے باز رہتے ہیں اور بعض کو یہ خوف صغائر سے بھی روک دیتا ہے اور بعض پر ایسا خوف ہوتا ہے کہ وہ خلاف اولیٰ سے بچ جاتے ہیں ۔ مگر غلبۂ خوف سے یہ مراد نہیں کہ وہ حد سے تجاوز کر جائے ۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ امید کے مقابلے میں خوف کا غلبہ ہو ورنہ جو خوف حد سے تجاوز کر جاتا ہے وہ طاعات کا مانع ہو جاتا ہے اور ایسی حالت میں لوگ طاعت کو چھوڑ کر گمراہی میں پڑ جاتے ہیں ۔

فکر و عمل میں صداقت

فکر و عمل میں صداقت انسان کا فطری جوہر اور پسندیدہ قدر ہے جسے ہر زمانے میں قدر و منزلت سے دیکھا گیا ہے اور ہر مذہب اور معاشرے نے اس کی تعریف کی اور اس کی ترغیب دلائی ہے ۔ یہ انسان کو سماجی زندگی میں محترم بناتی اور انفرادی زندگی میں عزت دلاتی ہے ۔ سچائی و صداقت آسان کام نہیں، یہ بڑے حوصلے کی بات ہے ۔ لیکن جس شخص کے دل میں خوفِ خدا ہوتا ہے اس کے لئے صداقت بے حد آسان ہوتی ہے ۔ صداقت خواہ فکر میں ہو یا عمل میں، قول میں ہو یا فعل میں، یہ جرأتمندی و بے باکی کو ابھارتی اور جان و روح کو بالیدگی بخشتی ہے، خانگی زندگی کو خوشگوار بناتی اور معاشرے کے امن و امان کو ترقی بخشتی ہے، عدل و انصاف کی فضا کو قائم کرتی ہے اور نیکی اور نیک چلنی کی راہ ہموار کرتی ہے ۔ آج کل ہمارے معاشرے میں فکر و عمل کا تضاد

بکثرت ہے اور فکر و عمل کی صداقت سے ہمارے معاشرے کی اکثریت محروم ہے ۔یہی وجہ ہے کہ تمام معاشرہ اختلاف و انتشار کی لپیٹ میں ہے ۔ منافقانہ تضادِ فکر و عمل نے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے ۔دنیامیں دوسروں کو نصیحت کرنے والے تو بہت ملتے ہیں لیکن اپنے نفس کو نصیحت کرنے والے اور اپنے فکر و عمل میں صداقت رکھنے والے لوگ بہت کم ہیں اور جتنے بھی ہیں اگر دیکھا جائے تو ایسے ہی نیک لوگوں کی برکت سے اس معاشرے کی رونق قائم ہے ۔

آپؐ کا زہد و تقویٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس کمال درجہ کا زہد حاصل تھا اس کی نظیر نہیں ملتی ۔ آپؐ کا چلنا پھرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، بولنا اور خاموش رہنا، نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور جہاد غرض یہ کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکم کے مطابق ہوتا تھا ۔ نفس کی خواہش کو کسی بھی وقت کچھ بھی دخل نہیں ہوتا تھا ۔

اطاعتِ رسول کا اطاعتِ خدا ہونا

اطاعتِ رسولؐ اس لئے اطاعتِ خداوندی ہے کہ جن احکام الٰہیٰ کے ہم مکلف ہیں وہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ملے ہیں اور وہ دو طرح پر ہمیں پہنچے ہیں ۔ ایک قرآن مجید کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایت کی جامع و مکمل کتاب ہے ۔ اس کے الفاظ و عبارات بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے نازل ہوئے ہیں ۔ دوسرا ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و حدیث ہے ۔ یہ قرآن مجید کی منشا کی توضیح و تشریح کرتی ہے ۔ ان دونوں کے مجموعے کو شریعت کہتے ہیں ۔ اگر قرآن مجید کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے تو سنت و حدیث کی اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے ۔ چونکہ حدیثِ رسول قرآن مجید کی تفسیر و تشریح ہے اور رسولؐ اپنی مرضی سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی آتی ہے اس کے مطابق فرماتے ہیں، اس لئے ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے اور جو شخص رسولؐ کی اطاعت نہیں کرتا یعنی حدیثِ رسولؐ کی پیروی نہیں کرتا اور اس کے احکامات ماننے سے انکار کرتا ہے وہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا منکر اور کافر ہے ۔

اطاعت کی عملی صورتیں

شرعی حیثیت سے اطاعت کی تین عملی صورتیں ہیں:

۱۔ وہ احکام جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح طور پر نازل فرمایا ہے، ان میں کسی تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں۔ مثلاً کفر و شرک کا انتہائی جرم ہونا، خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کرنا، آخرت اور قیامت پر ایمان لانا، پیغمبروں پر ایمان لانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی اور خاتم النبیین ماننا، نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ کو فرض جاننا۔ یہ سب براہ راست اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ ان کی تعمیل بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

۲۔ وہ مبہم و مہمل احکام جن کو قرآن مجید نے تفصیل و تشریح کے ساتھ بیان نہیں کیا، ایسے احکام کی تفصیل و تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق تفصیل و تشریح فرماتے ہیں، اس لئے حقیقت میں یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے، اگرچہ بظاہر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے۔

۳۔ وہ احکام جو نہ قرآن میں صراحۃً مذکور ہیں نہ حدیث شریف میں یا ان کے متعلق متضاد روایات ملتی ہیں، ایسے احکام کے متعلق علماء مجتہدین قرآن و سنت کے دلائل کی روشنی میں زیر غور مسئلہ کے نظائر میں غور و فکر کر کے اس کا حکم تلاش کرتے ہیں۔ ان احکام کی اطاعت اگرچہ بظاہر فقہائے مجتہدین اور علماء کرام کی طرف منسوب ہے لیکن دراصل یہ بھی قرآن و حدیث سے مستفاد ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ہی کی اطاعت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فیصلے کو ماننا ضروری ہے اور کسی ایک معاملہ میں بھی آپؐ کی اطاعت سے انکار و گریز کرنا کفر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تیرے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ ان میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ وہ آپس کے جھگڑوں میں آپ کو منصف تسلیم کریں اور آپ جو کچھ فیصلہ فرمائیں اس کے بعد وہ اپنے دلوں میں تنگی محسوس نہ کریں اور خوشی سے تسلیم کریں۔

اطاعتِ خداوندی کی ضرورت

حیاتِ انسانی فکر و عمل کا مجموعہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دے کر اشرف المخلوقات ہونے کا شرف عطا فرمایا اور دنیا میں اپنی خلافت سے سرفراز فرما کر تمام کائنات کو اس کے لئے مسخر فرما دیا اور اس کو اپنی عبادت و فرماں برداری کے لئے مخصوص فرما کر اپنے احکام پر چلنے کی ہدایات فرمائی ۔ کائنات کی چیزوں میں غور و فکر کرنے اور اس کے مطابق عمل کر کے ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی بھی تعلیم دی ۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ظہور ہر وقت ہمارے سامنے ہوتا رہتا ہے ۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کائنات میں غور و فکر کرنے کی جگہ جگہ تعلیم دی ہے ۔ جس شخص میں ذرا بھی غور و فکر کا مادہ ہو اس کو حق تعالیٰ کی ذات کے موجود ہونے اور وحدہ لاشریک ہونے اور اس کی تمام صفات کاملہ پر ایمان لانے کے سوا چارہ نہیں ہے ۔ اور جب اس بات کو مان لیا کہ اللہ تعالیٰ ہے اور وحدہ لاشریک ہے اور وہ تمام کائنات کا خالق و مالک و رازق و حاکم ہے تو اس کے سوا بھی چارہ نہیں کہ اس کی اطاعت کی جائے ، اس کے احکام پر عمل کیا جائے اور جن امور سے اس نے منع کیا ہے ان سے رک جائے ۔ پس انسان کو اپنی زندگی میں فکر و عمل سے چارہ نہیں لیکن عملی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک وہ جس پر چل کر ہم اللہ تعالیٰ کو خوش کر سکتے ہیں اور اس دنیاوی زندگی کے بعد کی زندگی کو جو کہ دائمی ہے ، خوشگوار اور آرام و راحت والی زندگی بنا سکتے ہیں ۔ دوسرا پہلو وہ ہے جس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو گا اور ہماری دنیوی و اخروی زندگی غم واندوہ اور عذاب و عقاب والی زندگی بن جائے گی ۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی نہ کوئی کام منتخب کر کے اس کام کے لئے سعی و عمل اور جدوجہد کرتا ہے ۔ لیکن بعض لوگ اپنی کوشش و محنت سے دائمی راحت کا سامان مہیا کر لیتے ہیں اور بعض دوسرے لوگ اپنی کوشش و محنت کو غلط مواقع میں استعمال کر کے دائمی عذاب خرید لیتے ہیں ۔

آپ ؐ کا حلم و بردباری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن اخلاق حسنہ کی تکمیل کے لئے اس دنیا میں تشریف لائے

تھے ان میں سے حلم و بردباری بھی ہے، جس کا مطلب درگزر و معافی کی عادت رکھنا اور نرم دل و صابر ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت حلم بھی ہے اور اس کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم حلیم بھی ہے۔ تمام انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات کی طرح صفتِ حلم سے بھی کامل طریق پر متخلق ہوئے ہیں۔

دشمنوں سے انتقام لینا انسانی فطرت کا خاصہ ہے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ اپنے دشمنوں سے انتقام نہیں لیتے تھے بلکہ ہر موقع پر آپؐ اپنے بدترین دشمنوں سے بھی حسن سلوک اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے کہ جو مجھ پر ظلم کرے میں انتقام لینے پر قادر ہونے کے باوجود اس کو معاف کر دوں۔ آپؐ کی تمام زندگی اس صفت کی کامل مظہر رہی ہے۔ جب آپؐ کی قوم نے آپؐ کو تکلیف پہنچائی تو آپؐ نے یہی فرمایا کہ اے اللہ! میری قوم کو سیدھا راستہ دکھا کیونکہ یہ لوگ ناسمجھ ہیں۔

جب مسلمانوں نے مکہ معظمہ کو فتح کیا تو یہ وہ وقت تھا کہ وہ ظالموں سے ایک ایک ظلم کا بدلہ لے سکتے تھے، اس کے باوجود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا مشفقانہ سلوک کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ مسجد الحرام میں آپؐ کے دربار میں وہ سب لوگ آپؐ کے سامنے موجود تھے جنہوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے خاندان کو تین سال تک ایک گھاٹی میں محصور کر کے آب و دانہ تک ان سب پر بند کر دیا تھا۔ اس دربار میں وہ لوگ بھی کھڑے تھے جو آپ پر ایمان لانے والوں کو تپتی ریت پر ڈال کر گھسیٹا کرتے تھے۔ وہ مغرور ہستیاں بھی موجود تھیں جنہوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ ہم داعیٔ اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے، وہ لوگ بھی حاضر تھے جو آپؐ کے خون کے پیاسے تھے، یہ سب مجرم سر جھکائے کھڑے تھے، ادھر ہزاروں تلواریں شہنشاہِ عرب و عجم کے حکم کی منتظر تھیں کہ حکم ہوتے ہی ان مجرموں کے سر قلم کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کی طرف پیغمبرانہ جلال کے ساتھ دیکھ کر فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ اب میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ یہ سن کر اہل مکہ پر سناٹا چھا گیا، ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم قتل عام کا حکم دیں گے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں آج تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ میں بھی یوسف علیہ السلام کی طرح تم سے کہتا ہوں کہ آج تم پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ خدائے برتر تمہارے قصور معاف کرے اور وہی ارحم الراحمین ہے۔

نرم دلی

اسلام نے انسان کو جن اچھے اخلاق کی تعلیم دی ہے ان میں سے ایک نرم دلی ہے - یہ ایک اچھی صفت اور نیک عادت ہے اور فطری طور پر انسان میں ودیعت کی گئی ہے - نرم دل آدمی تمام اوصاف جمیلہ و صفاتِ حسنہ کا جامع ہوتا ہے - نرم دلی ہی انسان کو رحم دلی، بردباری، سخاوت و شجاعت اور خدمتِ خلق وغیرہ امورِ صالحہ پر آمادہ کرتی ہے، غریبوں کی مدد، مظلوم کی فریاد رسی، حاجت مندوں کی حاجت روائی، بیمار کی تیمارداری پر مجبور کرتی ہے - نرم دل آدمی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ایک اعلیٰ کردار ادا کرتا ہے اور معاشرے میں بلند مقام حاصل کرتا ہے - لوگوں کو اس سے محبت ہوتی ہے، وہ اس کی بات مانتے اور اس کے گرد جمع ہوتے ہیں - اس کے بالمقابل سخت دل ہونا بری صفت ہے - جو لوگ سخت دل ہوتے ہیں وہ ظلم و ستم، قتل و غارت چوری اور رہزنی وغیرہ عیوب میں مبتلا ہو جاتے ہیں - لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں ان کی وجہ سے بہت بڑا خلل واقع ہو جاتا ہے -

جو لوگ ارشاد و تبلیغ و اصلاح معاشرہ و اصلاح قوم کا کام کریں، ان میں نرم دلی، خوش اخلاقی، عفو و درگزر اور لطف و مہربانی کی صفات کا ہونا ضروری ہے کیونکہ مخلوق کی اصلاح کا کام ان اوصافِ حمیدہ کے بغیر خاطر خواہ انجام نہیں پاتا - اگر قوم کے رہنما اور مرشد و مربی سخت مزاج، تند خو اور سخت گیر ہوں گے تو لوگ ان کے ذریعہ انفرادی و اجتماعی اصلاح و تزکیہء اخلاق حاصل کرنے کی بجائے ان سے دور رہیں گے - جو انسان نرم دل نہیں ہے اور دوسروں کے درد و غم میں شریک نہیں ہوتا وہ انسانیت سے بہت دور ہے - نرمی تمام نیکیوں کی بنیاد اور دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کی اصل ہے - غرض نرم دل آدمی تمام اخلاق حسنہ کا جامع اور دنیا و آخرت کی سعادت سے مالا مال ہوتا ہے -

ہمدردی و خیر خواہی

انسان جن اخلاق حمیدہ سے آراستہ ہو کر اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے، ہمدردی و خیر خواہی بھی انہی میں سے ہے - بلکہ یہ اس کا عین مقصدِ حیات ہے اور اسی نصب العین کی تکمیل سے انسانیت کی معراج پر فائز ہوتا ہے -

اگر ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ہمدردی و خیر خواہی نہ کرے حتیٰ کہ دوسری مخلوق کے ساتھ بھی اچھا سلوک روا نہ رکھے تو ظلم و ستم کا بازار گرم ہو جائے اور تمام نظام درہم برہم ہو کر یہ کائنات مصائب و آلام کا گھر بن جائے ۔ دنیا کی تمام رونق اور ساری گہما گہمی ، ہمدردی و خیر خواہی ، مروت و رواداری ، محبت و حسن سلوک جیسے اخلاق حمیدہ کی مرہون منت ہے ۔ دوسروں کی مصیبتوں میں ان کے کام آنا ، ان کے دکھ درد میں شریک ہونا ، غم خواری کرنا وغیرہ یہ سب امور ہمدردی اور خیر خواہی کے شعبے ہیں ۔ یہی وہ جذبہ خیر ہے جو بنی نوع انسان کو ایک عالمگیر اخوت اور بھائی چارے کے رشتے میں منسلک کئے ہوئے ہے اور خدا ترسی اور انسان دوستی اور ایثار و قربانی کا درس دیتا ہے ۔

محتاجوں کی امداد

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو ایک دوسرے سے مختلف پیدا کیا ہے ۔ ہر نوع کے افراد ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ نوع انسانی کے افراد بھی شکل و صورت ، رنگ و روپ ، عقل و فہم ، ہمت و کوشش غرض ہر لحاظ سے مختلف ہیں ۔ اسی طرح مالی حیثیت سے بھی کچھ لوگ غریب و محتاج ہوتے ہیں تو کچھ مالدار اور کچھ اوسط درجے کے ہوتے ہیں ۔ مالدار تو خوشحال ہوتے ہی ہیں ، اوسط درجے کے لوگ بھی اپنا گزارہ کر ہی لیتے ہیں لیکن غریبوں اور محتاجوں کا کسی امداد کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہوتا ہے ۔ ویسے تو ہر مذہب میں محتاجوں کی امداد کرنا ضروری سمجھا گیا ہے اور ہر ملک و قوم نے محتاجوں اور فقراء و مساکین کی امداد کے لئے جگہ جگہ مراکز قائم کئے ہوئے ہیں ، لیکن اس مقصد کے لئے جس قدر کامل نظام اسلام نے دیا ہے دوسرا کوئی مذہب اور کوئی ملک و قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا ۔ اگر اسلام کے تقسیم مال کے نظام کو تمام دنیا میں پوری طرح نافذ کر دیا جائے اور اس پر صحیح طریقے سے عمل کیا جائے تو بہت جلد تمام دنیا سے غربت کا خاتمہ ہو جائے ۔ جب ایک تنظیم کے تحت محتاجوں کو ان کے حقوق ملتے رہیں تو ان کو دربدر سوال کرنے کی ضرورت نہ رہے اور گداگری جو ہر ملک کے لئے ایک لعنت ہے اس کا خود بخود خاتمہ ہو جائے ۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ زکوٰۃ دینے والوں کو زکوٰۃ لینے والا شخص نہیں ملتا تھا ۔

روزی حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا مربوط نظام قائم فرمایا ہے کہ اس کے

نتیجہ میں ہر شخص کو اس کی روزی میسر آجاتی ہے ۔ معیشت کے تمام کام لوگوں میں تقسیم کر دیئے ہیں تاکہ ان کاموں کے ذریعہ اپنی اپنی روزی حاصل کر سکیں تاہم ہر زمانے میں اور ہر جگہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو روزی کمانے سے معزور ہوں ۔ مثلاً اندھے، لنگڑے، لولے وغیرہ یا کسی عارضی وجہ مثلاً بیماری وغیرہ سے کچھ عرصہ کے لئے روزی کمانے سے معذور ہو گئے ہوں ایسے لوگ محتاج یا مسکین یا فقیر کہلاتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کو روزی پہنچانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے تندرست اور مالدار لوگوں کو مال و دولت دے کر ان پر ڈال دی ہے اور ان کے مالوں میں محتاجوں اور مانگنے والوں کا حق مقرر فرما دیا ہے ۔ اسی لئے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے، غریبوں کی مدد کرتے اور اپنے مالوں میں سے ان کو دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے بہت خوش ہوتا ہے اور ایسے ہی لوگ دین و دنیا کی فلاح پاتے ہیں ۔

ظلم اور اس کا انجام

جس طرح اچھی صفات انسان کا زیور ہیں اسی طرح بری صفات اس کے لئے عیب، بدنامی اور ذلت کا باعث ہیں ۔ ان بری صفات میں سے ایک صفت ظلم ہے ۔ ظلم کے لغوی معنی زیادتی، سختی تاریکی اور حد سے تجاوز کرنا ہے ۔ شرعاً اس کے معنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو ان کی حد کے اندر نہ رہنے دینا یعنی کسی حکم الہیٰ کو اس کے مقام سے گھٹا یا بڑھا دینا یا اس کو اس کے وقت یا اس کی جگہ سے ہٹا دینا ہے ۔ پس حد سے تجاوز کرنا خواہ قلیل ہو یا کثیر، ظلم کہلاتا ہے ۔ اس کے بالمقابل جو اچھی صفت ہے اس کو عدل کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہر معاملہ میں حدودِ خداوندی کی پابندی کی جائے اور ان حدود سے ذرا بھی تجاوز نہ کیا جائے ۔ جس طرح عدل و انصاف اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ صفت ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور اجر و ثواب ملتا ہے اسی طرح ظلم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ناپسندیدہ عادت ہے اور اس کا مرتکب دردناک عذاب میں مبتلا ہو گا ۔

ظلم کا اطلاق اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر نافرمانی اور ہر گناہ کے کام پر ہوتا ہے، خواہ وہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ ہو ۔ اس لئے ظلم کا لفظ اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے ۔ اس کا اثر اللہ تعالیٰ کے حقوق اور بندوں کے حقوق دونوں میں پایا جاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا اور اپنی امانت یعنی احکام شریعت جن کو زمین و آسمان اور پہاڑوں نے

اٹھانے سے معذوری ظاہر کردی تھی، انسان کے سپرد کی ۔ اللہ تعالیٰ نے تقدیر ازلی میں کسی اور مخلوق کے لئے نہیں بلکہ صرف حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد پر ہی اس امانت کو اٹھانے کی صلاحیت ودیعت فرمائی تھی اور اپنی خلافتِ ارضی کے لئے اس کو منتخب فرمایا تھا، اس لئے انسان نے بلاتامل اس پیشکش کو قبول کرلیا، لیکن عملی زندگی میں بہت سے انسانوں نے اپنے اوپر ظلم کیا اور احکام خداوندی کی نافرمانی کرکے اپنی عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیا اور قعرِ مذلت میں جا پڑے اور دوزخ کے مستحق ہوگئے ۔

جس طرح حقوق اللہ میں اعتدال اور عدل و انصاف کو مدِنظر رکھنا لازمی ہے اور یہ ایک صفتِ حسنہ ہے اور ان میں حد سے تجاوز کرنا ظلم ہے اسی طرح حقوق العباد میں بھی عدل و انصاف ضروری ہے اور حد سے تجاوز کرنا ظلم اور آخرت میں دردناک عذاب کا باعث ہے ۔ آخرت میں منصفِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ ظالم سے مظلوم کا حق دلوائے گا، خواہ ان میں کوئی مومن ہو یا کافر۔

مظلوم کی بددعاء

مظلوم کی بددعاء اس کے دل کی گہرائی سے نکلتی ہے، اس لئے بلا روک ٹوک بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کا شرف حاصل کرلیتی ہیں ۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مظلوم کی بددعاء سے اپنے آپ کو بچاؤ، اس لئے کہ وہ اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی حقدار کو اس کے حق سے محروم نہیں کرتا ۔ یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کی فریاد کو سنتا اور ظالم کو اس مظلوم کی بددعاء کی وجہ سے اس دنیا میں بھی سزا دیتا ہے ۔ مظلوم کی بددعاء ظالم کے حق میں اس قدر مؤثر و مقبول ہوتی ہے کہ بسااوقات اللہ تعالیٰ بہت جلدی ظالم سے مظلوم کا انتقام لے لیتا ہے ۔ بندوں کے حقوق میں ظلم و زیادتی کرنے کی بہت تفصیل ہے ۔ مثلاً کسی کی چیز زبردستی لے لینا، کسی کو تکلیف پہنچانا، ناپ تول میں کمی کرنا، چیزوں میں ملاوٹ کرنا، والدین، اولاد، عزیز و اقارب اور ہمسایوں کے حقوق ادا نہ کرنا وغیرہ، اس لئے ہم سب کو اللہ تعالیٰ کے حساب لینے سے پہلے ہی اپنا محاسبہ کرنا اور حساب بے باق کرلینا چاہیئے تاکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار بن سکیں ۔

غصب و چیرہ دستی

غصب یعنی کسی کا حق چھین لینا گناہ کبیرہ اور ایک طرح کا ظلم ہے اور حقوق العباد میں زیادتی ہے ۔ قیامت کے دن غاصب سے اس شخص کا حق دلایا جائے گا جس کا حق اس نے غصب کیا

ہے اور اس گناہ کی سزامیں اس کو سخت عذاب دیا جائے گا۔ کسی کا حق غصب کرنے کی عادت دنیا کی حرص کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کی حرص ایسی بیماری ہے کہ ہر ناجائز طریقے سے مال و متاع حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے اور لالچی آدمی کو کتنا ہی مال و متاع مل جائے اس کی طبعیت سیر نہیں ہوتی اور اس کے لئے وہ لوگوں کے حقوق غصب کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ انسان کے پاس مال سے بھرے ہوئے دو میدان ہوں تو وہ تیسرے کی خواہش کرے گا اور ابن آدم کے پیٹ کو مٹی یعنی قبر ہی بھر سکتی ہے۔

اسی طرح کسی کا حق غصب کرنے پر آمادہ کرنے والی چیز خود غرضی ہے۔ خود غرض آدمی انصاف سے بعید ہوتا اور ظلم کو روا جانتا ہے۔ خود غرضانہ ذہنیت اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام ایثار و قربانی کی تعلیم دیتا ہے۔ ظالم و غاصب کے لئے سب سے بڑا خسارہ آخرت کا خسارہ ہے۔

عفو و درگذر

دشمنوں سے انتقام لینا انسان کا فطری خاصہ ہے اور شریعتِ مقدسہ نے بھی اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے معافی کو پسند فرما کر معاف کرنے والے کا اجر اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ بدلہ لینے میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اتنی اجازت دی ہے کہ برائی کا بدلہ اس برائی کے عین برابر لیا جائے اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔ پس اگر اس قصور سے زیادہ انتقام لیا تو باز پرس ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ عادل ہے اور عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی برائی و قصور سے زیادہ انتقام لے تو اس سے زیادتی کا انتقام دلایا جائے۔ برائی کا بدلہ بالکل اس کے مثل ہونا بہت مشکل ہے اور ہمارے پاس ایسا کوئی پیمانہ بھی نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ انتقام میں زیادتی نہیں ہوئی، جبکہ انتقام کے وقت آدمی پر اکثر غصہ غالب ہوتا ہے اور نفسانی جذبات کے غلبہ کے باعث سوچنے سمجھنے اور ضبط و تحمل کی صلاحیت بھی مغلوب ہو جاتی ہے، اس لئے اکثر بدلہ لینے میں ظلم و زیادتی سرزد ہو جاتی ہے۔ انتقام کے مقابلے میں عفو و درگزر ہی سے کام لینا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے اوپر ظلم ہو جانے کے بعد برابر کا بدلہ لے لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں بلکہ الزام تو صرف ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں

اور دنیا میں ناحق زیادتی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے اور جو شخص صبر کرے اور معاف کردے تو بلاشبہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔

غرض پرستی

غرض پرستی نہایت بری عادت ہے۔ یہ ایک ایسا اخلاقی مرض ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان بہت سی اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کے اندر منافقت جیسی بری عادت پیدا ہو جاتی ہے اور ایثار و قربانی، سخاوت و عدالت وغیرہ اچھے اخلاق سے بے بہرہ رہ جاتا ہے۔ غرض پرست آدمی اپنی خواہشات کا غلام ہوتا ہے، وہ احکام خداوندی کی پابندی کرنے کی بجائے حق سے سرکشی کرتا اور دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے، وہ آخرت کی فکر کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے، آخر اس کا ٹھکانا جہنم ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل جس شخص کو دنیا میں ہر کام اور ہر عمل کے وقت یہ خوف رہتا ہے کہ اسے ایک روز حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اس لئے وہ اپنے نفس کو قابو میں رکھتا اور اس کو ناجائز خواہشات سے روکتا ہے، اس کا ٹھکانا جنت ہے۔

نفس کی مخالفت کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ ان باطل عقائد سے بچے جو ظاہری نصوص اور اجماع سلف کے خلاف ہیں تاکہ صحیح معنی میں مسلمان کہلانے کا مستحق ہو جائے دوسرا درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے معصیت اور گناہ کا کام نہ کرے۔ اس درجہ کا حصول اس وقت ہو گا جب آدمی مشتبہ چیزوں سے بھی پرہیز کرے اور جس مباح و جائز کام میں مشغول ہونے سے کسی ناجائز کام میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو اس جائز کام کو بھی ترک کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جس نے مشتبہات سے پرہیز کیا اس نے اپنی آبرو اور دین کو بچا لیا اور جو شخص مشتبہات میں مبتلا ہوا وہ آخر محرمات میں مبتلا ہو جائے گا۔ مشتبہات سے مراد وہ کام ہیں جن میں جائز و ناجائز دونوں احتمال پائے جاتے ہیں۔ نفس کی مخالفت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ ذکر کی کثرت اور مجاہدہ و ریاضت کے ذریعہ اپنے نفس کو ایسا پاک و صاف بنا لے کہ اس میں نفسانی خواہشات باقی ہی نہ رہیں۔ یہ مقام اولیاء اللہ کا ہے اور اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں فنافی اللہ اور بقا باللہ کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ انہی حضرات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرے خاص بندوں پر شیطان کا قابو نہیں چل سکے گا اور انہی

حضرات کے بارے میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے نفس کی خواہشات پوری طرح میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔

صبر

صبر کے لفظی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور قرآن و سنت کی اصطلاح میں نفس کو طبیعت کے خلاف چیزوں پر ثابت قدم رکھنا صبر کہلاتا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں: اول طاعت پر صبر کرنا یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کی پابندی طبیعت پر خواہ کتنی ہی شاق کیوں نہ ہو، اپنے نفس کو اس پر ثابت قدم رکھنا۔ دوم نافرمانیوں سے صبر کرنا یعنی جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، وہ نفس کے لئے خواہ کتنی ہی لذیذ و مرغوب ہوں، نفس کو ان سے روکنا۔ سوم، مصائب پر صبر کرنا یعنی دنیاوی مصیبت و تکلیف پر صبر کرنا اور حد سے زیادہ پریشان نہ ہونا، ہر قسم کی تکلیف و راحت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر اپنے نفس کو بے قابو نہ ہونے دینا۔ عام لوگ پہلی اور دوسری قسم کو صبر نہیں سمجھتے البتہ تیسری قسم کو سب ہی صبر شمار کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی متعدد آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ہر قسم کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا سب سے زیادہ موثر علاج صبر و تقویٰ کو اختیار کرنے میں ہے اور صبر کا طریقہ یہ ہے کہ ان سب موقعوں کے ثواب کو یاد کرے اور یہ سمجھے کہ یہ سب میرے فائدے کے لئے ہیں اور یہ بھی سوچے کہ بے صبری کرنے سے تقدیر تو ٹلتی نہیں ناحق ثواب بھی کیوں ضائع کیا جائے۔ دینی و دنیوی امور میں اپنے سے کم درجے کے لوگوں کو دیکھے اور صبر و شکر کرے اور یہ بھی سمجھے کہ اکثر مصیبتیں، ہمارے اپنے اعمال کی کوتاہیوں سے آتی ہیں۔

خدمتِ خلق

اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد اگر کوئی عمل اسلام میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے تو وہ خدمتِ خلق ہے یعنی معاشرے میں جو لوگ کمزور اور بے سہارا ہیں ان کی مدد اور دستگیری کرنا اللہ تعالیٰ

کے نزدیک نہایت پسندیدہ عمل ہے اور حقیقت میں یہ بھی عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے جسمانی یا مالی توانائی عطا فرمائی ہے وہ معاشی یا جسمانی لحاظ سے کمزور افراد کو حقیر نہ سمجھیں۔ یہ خوش حالی اور توانائی دراصل ایک آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے خوش حال بندے اس کی دی ہوئی نعمتوں سے مالا مال ہونے کے بعد کہیں بے آسرا اور کمزور لوگوں کو فراموش تو نہیں کر دیتے۔ خوش حال لوگوں کے مال و متاع میں اللہ تعالیٰ نے ان غریبوں اور ناتوانوں کا حصہ رکھا ہے اور ان کے لئے اس کو سعادت و ثواب کا ذریعہ بنایا ہے اور جو لوگ ان اموال میں سے ان کا حصہ نہیں نکالتے ان کو دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی گرفت سے مفر نہیں ہے اور آخرت میں بھی ان سے اس کی باز پرس ہوگی اور سزا ملے گی۔

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر نہایت مہربان ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے شفقت کرتا ہے اور خدمتِ خلق کے کاموں میں مشغول رہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب و مقبول بندہ ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کو دین و دنیا کی سعادتوں سے مالا مال فرماتا ہے۔

اخلاق حسنہ

مکارم اخلاق سے مراد وہ اعلیٰ درجے کے اخلاقی اصول و اوصاف ہیں جن پر ایک پاکیزہ زندگی اور ایک صالح معاشرے کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے صالح متبعین مختلف اوقات میں اور مختلف اقوام و ممالک میں گزرے ہیں وہ اخلاقی اقدار کے مختلف پہلو اپنی تعلیمات سے نمایاں کرتے رہے ہیں اور اپنی عملی زندگیوں میں بھی اخلاق حسنہ کے بہترین نمونے پیش کرتے رہے ہیں، لیکن کوئی ایسی جامع شخصیت اس وقت تک اس دنیا میں تشریف نہیں لائی تھی جس نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں سے متعلق اخلاق حسنہ کے صحیح اصولوں کو مکمل و جامع طور پر بیان فرمایا ہو اور خود اپنی زندگی میں بھی اس پر عمل کر کے دکھایا ہو اور زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی پہلوؤں کو اپنے اسوہء حسنہ سے پوری طرح نمایاں کر دیا ہو۔ اس مقصد اعلیٰ کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب سید المرسلین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں مبعوث فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و متابعت خواہ زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق رکھتی ہو، عین عبادت ہے۔ اگر ہمارا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، بولنا، خاموش

رہنا، لین دین وغیرہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعتِ مطہرہ و سنتِ منورہ کے مطابق ہے تو نہایت بابرکت و باعثِ ثواب اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ و مقبول ہے۔آپ کی کسی سنت کو ہلکا سمجھنا ایمان میں خلل کا باعث ہے۔

فرض شناسی

فرض شناسی ایک فطری امر ہے۔ تمام مخلوق اپنے فرض کو پہچانتی اور پابندی کے ساتھ اس کو ادا کرتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، ہوا، بارش، سردی، گرمی، جمادات، نباتات، حیوانات، غرض یہ کہ تمام مخلوق ہمیشہ اپنی اپنی ڈیوٹی نہایت پابندی کے ساتھ انجام دیتی رہتی ہے اور انجام دیتی رہے گی لیکن بہت سے انسان ایسے ہیں جو اپنا فرض نہیں پہچانتے اور اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر انجام نہیں دیتے۔

فرض شناسی ذمہ داری کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور احساس ذمہ داری مدنی الطبع انسان کا خاصہ اور شعور حیات کا لازمہ ہے جب انفرادی اور سماجی ضرورتیں ابھارتی ہیں اور انسان فرد اور جماعت کی حیثیت سے فطری طور پر اپنے آپ کو فرائض اور ذمہ داریوں کا پابند بناتا ہے۔ اسی طرح فرض شناسی ایک شعارِ حیات ہے جس کا تعلق ذہنی رجحانات و اعتقادات سے ہے۔ہم سچ بولنا اس لئے فرض جانتے ہیں کہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ ہماری ذاتی و سماجی زندگی کے لئے افادی ہے، عدل و انصاف اور دیگر اقدار خیر کو بھی ہم اسی لئے اپناتے اور برائیوں سے بچنے کو لازم مانتے ہیں۔ پس عام مفہوم میں فرض شناسی افادیت کے تصور سے جنم لیتی اور یقین یا عقیدے سے استحکام پاتی ہے۔ مگر افادیت بجائے خود ایک اضافی امر ہے اور عقل انسانی پر مبنی یقین بھی زبان و مکان کے مطابق اضافی ہے۔ اس لئے فرض کئی دوسرے رجحانات سے متصادم ہو جاتا ہے۔ مثلاً محبت اور فرض کی کشمکش مختلف افراد میں فرض کا مفہوم بدل دیتی ہے اور اکثر عدل و انصاف کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ کبھی فرض کی بجاآوری حقائق اور ذاتی رجحانات کو قربان کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور کبھی فرض محبت سے مغلوب ہو جاتا ہے۔

فرض کا تعین

جب چند عقیدے ٹکراتے ہیں تو فرض شناسی کی تعبیریں بدل جاتی ہیں اور انسانی فہم کی نارسائی فرض شناسی کا کوئی حتمی تعین نہیں کر پاتی۔ ایک شخص یا ایک قوم جس بات کو اپنے لئے

فرض سمجھتی ہے دوسرا شخص یا دوسری قوم اسے خود غرضی اور انسان دشمنی سمجھتی ہے، اس لئے فرض کے تعین کا کوئی حتمی اور آفاقی معیار ضرور ہونا چاہیئے جو فرد اور جماعت کی حیثیت سے ساری انسانیت اور سارے عالم کے لئے قابل قبول ہو ۔اس مقصد کی تکمیل اور نتیجہ خیز تعین کے لئے اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی صحیح رہنمائی کرتی اور فرض شناسی کا حقیقی اور ناقابل تردید معیار پیش کرتی ہے اور دین اسلام ہی ان الجھنوں کا حل بتاتا اور اپنے کمال کے باعث فرض و واجبات کا نہایت جامع تعین کرتا ہے ۔اس کے بتائے ہوئے اوامر و نواہی فرائض کا اعلیٰ ترین معیار ہیں، جو فرد و جماعت کی بہبود اور پوری انسانیت کی بھلائی کی ضمانت دیتے ہیں ۔ اچھائیوں کو فروغ دینا اور برائیوں سے روکنا ہمارا انسانی فرض ہے اور اس کی تکمیل ہماری فرض شناسی کی دلیل ہے ۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم صرف ذاتی اچھائیوں پر ہی قناعت نہ کریں بلکہ انہیں دوسروں تک پھیلائیں ۔

جو لوگ اپنے فرائض کو پہچانتے اور ان کو حسب توفیق کما حقہ ادا کرتے ہیں وہ دنیا و آخرت کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے اور ہمیشہ خوش حال رہتے ہیں ۔اپنے کاروبار میں برکت اور روز افزوں ترقی پاتے ہیں اور ان کا ضمیر مطمئن رہتا ہے ۔ مثلاً ملازم پیشہ افراد میں سے وہ شخص فرض شناس اور قابل تعریف ہے جو اپنا کام ایمان داری سے صحیح طور پر کرتا ہے، اپنے افسروں کو مطمئن رکھتا اور ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے، آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتا، کسی کی حق تلفی نہیں کرتا اور رشوت نہیں لیتا ۔اسی طرح وہ حکیم و ڈاکٹر فرض شناس ہے جو حلیم و بردبار ہو، خوش اخلاق ہو، مریضوں کا ہمدرد، نبض شناس اور علاج توجہ سے کرتا ہو ۔طلباء میں وہ فرض شناس ہے جو وقت پر اسکول جاتا ہو، خوب محنت سے پڑھتا ہو، استاد کا ادب کرتا ہو اور وقت کا پابند ہو ۔فوج میں وہ فرض شناس ہے جو چست و چالاک ہو، افسر کا اطاعت گزار ہو ۔ غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ، ہر پیشہ اور ہر کام میں انسان کو فرض شناس ہونا چاہیئے ۔

باہمی تعاون

انسانی زندگی خواہ دینی ہو یا دنیوی اور معاشرتی ہو یا معاشی یا سیاسی وغیرہ ہو، اس کے دو پہلو ہیں، ایک انفرادی، دوسرا اجتماعی ۔انفرادی پہلو ہر شخص کی ذات تک محدود ہوتا ہے اور اس کے اثرات و نتائج بھی محدود ہوتے ہیں بلکہ جب تک اجتماعی طرز زندگی اس کے ساتھ نہ ملے

انفرادی زندگی معطل ہو جاتی ہے کیونکہ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ اجتماعی زندگی کا تعلق تمام افرادِ انسانی کے اتحاد و اتفاق اور مشترکہ معاشی و معاشرتی و سیاسی نظام سے ہے۔ اس دنیا کا پورا نظام باہمی تعاون اور ایک دوسرے کی مدد کے ذریعہ قائم ہے۔ اگر ایک دوسرے کی مدد نہ کی جائے تو ایک انسان خواہ کتنا ہی عقل مند یا طاقتور یا مالدار یا ہنرمند کیوں نہ ہو اپنی زندگی کی جملہ ضروریات کو تنہا حاصل نہیں کرسکتا۔ اکیلا انسان اناج کو بونے سے کھانے کے قابل بنانے تک تمام مرحلے طے نہیں کرسکتا۔ اسی طرح لباس وغیرہ کے لئے روئی کاشت کرنے سے لپنے بدن کے مطابق کپڑا تیار کرنے تک تمام کام خود انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ زندگی گزارنے کے لئے اس کو مکان و سامان و تعلیم و ہنر و دیگر امور کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ زندگی کے ان تمام امور کو کوئی انسان لپنے لئے اکیلا انجام نہیں دے سکتا۔ لامحالہ باہمی تعاون اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے کے جذبے سے ہی یہ سب کام انجام پاسکتے ہیں۔ حتیٰ کہ مرنے سے قبر میں دفن ہونے تک کے تمام مراحل بھی تعاون کے محتاج ہیں بلکہ اس کے بعد کی زندگی میں بھی دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کے لئے وہ لپنے پسماندگان کے تعاون کا محتاج ہے۔

ہمہ گیر تعاون کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ سے اس دنیا کا ایسا محکم اجتماعی نظام قائم فرمایا ہے کہ امیر و غریب، حاکم و محکوم، مزدور و صنعت کار سب ایک دوسرے کے تعاون کے محتاج ہیں۔ جس طرح غریب آدمی لپنے پروردگار کے لئے مالدار کا محتاج ہے اسی طرح مالدار آدمی محنت و مشقت سے انجام پانے والے کاموں میں غریب مزدور کا محتاج ہے۔ جس طرح گاہک دوکاندار کا محتاج ہے اسی طرح دکاندار بھی گاہک کا طلبگار اور ضرورت مند ہے۔ جس طرح مکان تعمیر کرانے والا معمار، بڑھئی، لوہار وغیرہ کا دستِ نگر ہے اسی طرح یہ دستکار لوگ بھی ایسے شخص کے محتاج ہیں جو ان سے مکان یا فرنیچر وغیرہ تیار کرائے اور ان کو اس کی مزدوری ادا کرے۔ اگر یہ ہمہ گیر احتیاج نہ ہوتی اور صرف اخلاقی اعتبار سے تعاون رہ جاتا تو کوئی کسی کے کام نہ آتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قائم کیا ہوا ایسا مکمل و مستحکم نظام ہے کہ اس سے الگ رہ کر کوئی شخص خوشحالی کی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔

فطری تقسیم کار

فطری طور پر کاموں کی تقسیم لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو کر ہر قسم کے کام کے لئے ایک ایک طبقہ ظہور میں آتا ہے اور ہر شخص کے دل میں اس کے فطری ذوق کے مطابق کسی کام کا داعیہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر فطری طور پر یہ تقسیم کار نہ ہوتی اور ہر شخص کے دل میں فطری طور پر کسی کام کا داعیہ پیدا نہ ہوتا بلکہ فطری صلاحیت کے بغیر لوگ ایک دوسرے کے ذمہ کوئی کام لگاتے یا اہل حکومت اپنی مرضی سے لوگوں میں کام تقسیم کرتے تو کوئی شخص دلی لگاؤ کے ساتھ اس کام کو پورا نہ کرتا جو اس کے ذمہ لگایا جاتا اور تمام نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ اگر یہ فطری نظام نہ ہوتا تو کروڑ پتی شخص اپنی پوری دولت لٹا کر بھی گندم کا ایک دانہ حاصل نہ کر سکتا، مکان کی ایک اینٹ نہ لگوا سکتا، کپڑے کی ایک دھجی حاصل نہ کر سکتا، لکڑی یا لوہے کی ذرا سی چیز بھی نہ لے سکتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو جس کام کے لئے پیدا کیا ہے اس کام کی رغبت اس کے دل میں ڈال دی ہے۔ وہ کسی قانونی مجبوری یا اور قسم کے دباؤ کے بغیر اس خدمت کو اپنی زندگی سمجھتا اور اس کے ذریعہ اپنی روزی کماتا ہے۔ تمام دنیا کا نظام اسی فطری باہمی تعلق و تعاون پر قائم ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں سب کو ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت ہے۔

نیکی میں تعاون

قرآنی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ تعاون دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تعاون وہ ہے جو نیکی اور اچھے کاموں میں کیا جاتا ہے۔ یہ تعاون اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ و مقبول ہے اور ایسے تعاون کا حکم دیا گیا ہے اور ایک تعاون وہ ہے جو گناہوں اور ظلم و ستم کے کاموں میں کیا جاتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض و نامقبول ہے اور ایسے تعاون سے منع فرمایا گیا ہے۔

دنیا میں نیکی و انصاف و ہمدردی اور خوش خلقی کو رواج دینے کے لئے قرآن و سنت کی تعلیمات نے ہر فرد کو داعی بنا کر کھڑا کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ، تابعین اور سلف صالحین کے زمانے میں اس حکیمانہ تعلیم و تربیت پر عمل کر کے مسلمانوں نے عدل و انصاف اور امن و امان کی جو نظیر قائم کی تھی اب تک غیر بھی اس کی مثال دیتے ہیں۔ لیکن جب سے لوگوں نے نیکی پر تعاون کو ترک کر دیا ہے اور اس کے بجائے گناہ و ظلم پر تعاون کو اپنا شعار بنا لیا

دنیا کا امن و امان زیر زبر ہو گیا ہے اور لوگ عدل و انصاف سے بالکل محروم و مایوس ہو گئے ہیں۔
ان حالات میں معاشرے کی اصلاح، امن و امان اور عدل و انصاف قائم کرنے کی یہی سبیل ہے کہ اللہ کے اس ارشاد کی تعمیل کی جائے کہ نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی اعانت کرو، گناہ و ظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ اس حکم کی تعمیل ہر شخص پر واجب ہے اور جو کام شرع کے مطابق نیکی اور ثواب کا موجب ہے وہ اس حکم میں داخل ہے کہ نیک کام میں ایک دوسرے کی اعانت کی جائے اور مدد کرنے کا حکم بھی عام ہے۔ مدد خواہ ہاتھ سے ہو یا زبان سے یا مال سے ہو جس طرح بھی ممکن ہو نیک کام میں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہئے اور برے کاموں سے روکنا بھی نیکی ہے اور اس میں (برے کام سے روکنے میں) ایک دوسرے کی مدد کرنا نیکی ہے۔

نیکی کا امر کرنا

ایک حدیث میں جسے حضرت ابو سعید خدری نے روایت کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک کاموں کا امر کرنے اور برے کاموں سے منع کرنے کی ترغیب دی ہے اور خلافِ شرع امور سے روکنے کو ایمان کی علامت قرار دیا اور اس سلسلہ میں ایمان کے تین درجے بیان فرمائے ہیں۔ ایمان کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ جب کسی خلافِ شرع کام کو ہوتا ہوا دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے روک دے اور اس کو متغیر کردے۔ یعنی جو شخص صاحب استطاعت ہے وہ اس برائی کو اپنی طاقت کے ذریعہ مٹا دے۔ مثلاً نشہ لانے والی ممنوعہ چیزوں کو پھینک دے، شرک و بدعات کی رسوم و آثار کو مٹادے، چھینی ہوئی چیز اس کے مالک کو دلادے وغیرہ۔

استطاعت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک وہ جو صاحبِ اقتدار افراد یعنی حکومت کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لئے اہل اقتدار ہی مکلف ہیں کہ وہ اپنے ہاتھ اور احکام سے ان منکرات کو مٹائیں۔ اس مقصد کے لئے ہر شخص کو قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے۔ اگر ہر شخص قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے گا اور اپنے من مانے طریقے پر توڑنا شروع کردے گا تو معاشرہ میں فساد و انتشار برپا ہو جائے گا اور ملک کا نظم و نسق درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ دوسری استطاعت وہ ہے کہ جو کم و بیش ہر شخص کو حاصل ہے۔ مثلاً ماں باپ کو اپنی اولاد پر، خاوند کو اپنی بیوی پر، مالک کو اپنے نوکر پر اور آقا کو اپنے غلام پر حاصل ہے۔ ان لوگوں کو جس حد تک شرع نے سختی کرنے کا حق دیا ہے اس حد تک سختی کرکے اپنے ماتحت کو برائی سے روکنا اور بری چیزوں کو مٹانا ضروری ہے۔

ایمان کا دوسرا درجہ جو امر معروف سے تعلق رکھتا اور پہلے درجے سے ادنیٰ ہے یہ ہے کہ اگر ہاتھ سے برائی کو نہ مٹا سکے تو زبان سے روکے یعنی لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے اور وعید کی آیتیں اور حدیثیں سنائے اور دین کی تبلیغ کرے۔ امر معروف کی یہ دوسری قسم حسب توفیق ہر مسلمان پر واجب ہے بشرطیکہ وہ خود شریعت کے صحیح احکام معلوم کرے اور پھر ان صحیح احکام کو دوسروں تک پہنچائے۔

امر معروف کے لحاظ سے ایمان کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے کہنے پر بھی قادر نہ ہو اور زبان سے کہنے میں لوگوں کی بدسلوکی کا خطرہ ہو اور وہ اس بات کو قبول نہ کریں تو دل سے ان کے برے افعال کو برا جانے، دل میں ان کے برے افعال سے کڑھے، ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرے اور یہ ارادہ رکھے کہ جب بھی اس برائی کو زبان یا ہاتھ سے روکنے پر قادر ہو گا تو ضرور اس قدرت پر عمل کرے گا۔ یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔ اگر دل سے برا جانا لیکن ان لوگوں کے ساتھ تعلقات کو ترک نہیں کیا، ان سے میل جول رکھا تو وہ شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک بری نہیں ہو گا۔

-----OOO-----

ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم
از سید فضل الرحمٰن

صفحات: ۹۱۲

* حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سیرت مبارکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور نہایت جامع ہے۔
* محترمی حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب مدظلہ سابق صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی حیدر آباد نے اپنے پیش لفظ میں تحریر فرمایا ہے۔ "اس میں بعض ایسی تفصیلات ہیں جو عام کتابوں میں نہیں ہیں۔ یہ کتاب اپنی نوعیت و اہمیت کے لحاظ سے بہت بیش قیمت ہے۔"
* محترم حضرت مولانا مفتی محمد ضیاء الحق صاحب مدظلہ، سابق مہتمم و مفتی و استاد حدیث مدرسہ امینیہ دہلی نے کتاب کے تعارف میں فرمایا" محترم حافظ صاحب نے کتاب میں مستند حالات و واقعات جمع کئے ہیں اور کتاب عوام و خواص کے پڑھنے کی ہے۔"

چند اہم عنوانات

* مکی زندگی، ہجرت مدینہ، مدنی زندگی، حجۃ الوداع اور آپ کی وفات پر تفصیل سے لکھا گیا ہے
* اسوۂ حسنہ، مکاتیب و فرامین اور مقاصد نبوت وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔
* امور سلطنت، اسلام کا تصور حکمرانی، ریاست کے بنیادی ارکان، اسلامی ریاست کا تصور، مسلم معاشرہ کی تشکیل، دنیا کا پہلا تحریری دستور، امن و استحکام کے قرآنی اصول اور عہد نبوی کا نظام حکومت جیسے اہم موضوعات اس کتاب کی امتیازی خصوصیات ہیں۔
* اسلامی نظام معشیت، تقسیم دولت کا اسلامی نظریہ، سودی کاروبار کے نقصانات، ارتکاز دولت کا انسداد وغیرہ امور تفصیل سے واضح اور محققانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ اسلوب بیان کی سلاست و دلکشی کے ساتھ ساتھ مواد کی فراہمی میں نہایت تحقیق و احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔
* بہترین کاغذ، چہ رنگوں کا دیدہ زیب و دلکش سرورق، عمدہ کمپیوٹرائزڈ کتابت، اعلیٰ آفسٹ طباعت اور مضبوط جلد بندی اس کی اضافی خوبیاں ہیں۔

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

احسن البیان فی تفسیرِ القرآن

از سید فضل الرحمٰن

حصہ اول سورۃ فاتحہ و بقرہ — صفحات ۴۴۸

حصہ دوم سورۃ آل عمران و نساء — صفحات ۴۰۸

قرآن کریم کی یہ مختصر، جامع، نہایت آسان اور عام فہم تفسیر ہے۔ محترم حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب مدظلہ، سابق صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد پیش لفظ میں فرماتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ ایسی تفسیر نہ صرف عوام کے لیے بلکہ خواص کے لیے بھی مفید ہے اور قابل صد ستائش ہے۔ تفسیر قرآن سے متعلق یہ احسن البیان یقیناً اسم بامسمیٰ ہے۔

چند خصوصیات

* کتاب کے شروع میں سات ابواب پر مشتمل قرآنی علوم کا مفصل تعارف ہے۔ قرآن اور وحی، فضائل قرآن، آدابِ تلاوت، نزول قرآن، حفاظتِ قرآن، اسبابِ نزول اور تفسیر قرآن کے ماخذ وغیرہ امور پر نہایت واضح اور محققانہ انداز میں سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔
* ہر سورت کی ابتداء میں اس کی وجہ تسمیہ، مختصر تعارف اور اس کے مضامین کا آیت وار خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔
* تقریباً ہر آیت پر اس کے مضمون کی مناسبت سے مختصر عنوان قائم کیا گیا ہے۔
* عربی زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے الفاظ کی لغوی اور اصطلاحی تشریح کی گئی ہے۔
* ترجمہ و تفسیر نہایت سلیس، عام فہم اور بامحاورہ ہے۔
* آیات کا شان نزول مستند و معتبر روایتوں کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے۔
* جہاں ضروری ہوا آیات کا ربط سادہ اور مختصر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔
* تفسیر و تشریح کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اکابر علماء کرام کی تفاسیر سے معمولی لفظی تصرف کے ساتھ اخذ کیا گیا ہے اور جو مضمون یا عبارت جس تفسیر سے لی گئی ہے اس کا مکمل حوالہ دیا گیا ہے۔
* بہترین کاغذ، دیدہ زیب چھ رنگوں کا دلکش لیمینٹیڈ سرورق، عمدہ کمپیوٹرائزڈ کتابت، اعلیٰ آفسٹ طباعت، مضبوط و پائیدار جلد بندی اضافی خوبیاں ہیں۔

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

خطباتِ ہادیٔ اعظمؐ

(زیرِ طبع)

از سید فضل الرحمٰن

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات پر مشتمل اب تک شائع ہونے والا سب سے بڑا اور مستند مجموعہ، چھ رنگوں کے نہایت خوبصورت لیمنٹیڈ سرورق، بہترین کمپوزنگ، نہایت نفیس آفسٹ طباعت اور مضبوط جلد بندی کی اضافی خوبیوں کے ساتھ سیرت کے موضوعات میں ایک نادر اضافہ

چند خصوصیات

۱.... ابتدا میں خطابتِ نبوی کے موضوع پر ایک مضمون اور گلہائے فصاحت کے عنوان کے تحت ۱۳۰ منتخب جوامع الکلم شامل ہیں۔

۲.... جس حد تک ممکن ہوا خطبہ کی مکمل روایت بیان کی گئی ہے تاکہ خطبہ کا محل و پس منظر واضح ہو جائے۔

۳.... تمام خطبات مستند کتب سے لئے گئے ہیں۔ جن میں سے اکثر صحاح ستہ سے ماخوذ ہیں۔

۴.... ہر خطبہ پر مضمون کی مناسبت سے مختصر عنوان قائم کر دیا گیا ہے۔

۵.... تمام حوالہ جات اصل کتابوں کی طرف مراجعت کر کے تحریر کئے گئے ہیں۔

۶.... ایک خطبہ سے متعلق تمام روایات ایک ہی مقام پر جمع کر دی گئی ہیں۔ مثلاً حجۃ الوداع سے متعلق تمام روایات ایک ہی جگہ مل سکتی ہیں۔

۷.... خطبات کی صرف وہ روایات لی گئی ہیں جن میں واضح طور پر خطبہ کی صراحت ہے۔

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز

دوکان نمبر ۲۲، بلاک نمبر ۲، زینت اسکوائر، ابن سینا روڈ

ایف۔ سی ایریا، کراچی نمبر ۲۹